

تفسیر
المقام المحمود

(آخری پارہ)

امام عبیداللہ سندھیؒ

اَلمَقَامُ المَحمُودُ

(آخری پارہ)

مولانا عبید اللہ سندھی

www.KitaboSunnat.com

مکی دار الکتب
32۔ میکلگن روڈ، چوک اے جی آفس لاہور
☎:042-7239138

کتاب	:	تفسیر المقام المحمود آخری پارہ
مصنف	:	مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم
مرتب	:	مولانا عبداللہ لغاری مرحوم
اشاعت	:	دسمبر 2004
مطبع	:	حاجی حنیف اینڈ سنز لاہور
برائے	:	مکی دار الکتب 32۔ میکلیگن روڈ لاہور
قیمت	:	150/- روپے

E-mail: m_d7868@hotmail.com

Ph: 7239138

اہتمام: محمد عباس شاد

غرض ناشر

امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے زندگی بھر یہ کوشش جاری رکھی کہ اس زوال کے دور میں قوم کو یہ بات سمجھائی جائے کہ زوال سے نکلنے کا اصل راستہ قرآنی افکار کا فروغ ہے۔اس کے لیے انہوں نے چند ایک ادارے بھی قائم کئے۔اور قرآنِ حکیم کی تعلیم و تدریس کے ذریعے افراد کی ذہن سازی بھی کرتے رہے۔ دوران درس بہت سے شاگردوں نے امام سندھیؒ کے قرآنی افکار کو قلمبند بھی کیا جو ایک عرصہ سے پاک و ہند کے اشاعتی اداروں سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

امام سندھیؒ نے امام شاہ ولی اللہؒ کے فکر پر قرآنی مطالعہ کا جو اسلوب اختیار کیا اس نے برعظیم پاک وہند کے علمی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل کی یہی وجہ ہے کہ ''مکی دارالکتب لاہور'' نے امام سندھیؒ کے قرآنی افکار پر مبنی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں ''المقام المحمود'' آخری پارہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔اس کتاب کی عکسی اشاعت پر ہم صفہ اکیڈمی کے مالک سردار محمد عابد صاحب کے انتہائی مشکور ہیں کہ انہوں نے عکسی طباعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔یادر ہے ادارہ المقام المحمود جلد اوّل شائع کر چکا ہے اور باقی جلدیں تیاری کے مراحل میں ہیں اللہ تعالیٰ اس میں کامیابی عطا فرمائے۔

محمد عباس شاد
32۔میکلیگن روڈ لاہور
فون:7239138

پیش لفظ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

شکر ہے اس پروردگار رب الاعلیٰ رب العظیم کا کہ جس کی عنایت و رحم و کرم کے طفیل اس عظیم الشان اور نادر تفسیر کا ایک جزء (پارۂ عمّ) شائع ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دوسرے اجزاء بھی شائع ہو جائیں گے اور مسلمانوں اور شائقین قرآن کے لئے مشعلِ علوم و کوائف ثابت ہوں گے۔

یہ تفسیر مولانا عبید اللہ سندھی مکہ معظمہ کے پُرانوار ماحول میں اپنے تلامیذ اور محبین قرآن کے سامنے پیش کرتے تھے اور ان کے تلمیذ اور سفر کابل کے رفیق مولانا عبد اللہ لغاری صاحب روزانہ قلمبند کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دو سال کی مسلسل محنت اور جفاکشی نے یہ ساری تفسیر قلمبند ہو گئی۔ اس کی نقلیں دہلی، لاہور، کراچی وغیرہ میں بھی موجود ہیں لیکن اس کا اصل نسخہ جو خود مولانا لغاری صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، سندھ یونیورسٹی میں موجود ہے۔

تفسیر کی اہمیت

مولانا عبید اللہ سندھی علمائے ہند میں ایک اعلیٰ پائے کے مستند عالم اور اہل اللہ تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی دین کی خدمت، دینی علوم و فنون کے مطالعے اور مسلمانوں کی سیاسی اور علمی برتری کے حصول کے لئے وقف کردی تھی۔ بچپن ہی سے بڑے ذہین تھے۔ للہیت کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ خوش قسمتی سے ان کو اعلیٰ پایہ کے استاد مل گئے اور روحانیت کے سلسلے میں قطب زمان حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈوی اور عارف باللہ حضرت غلام محمد صاحب خانپوری جیسے بزرگوں کی صحبت اور ارشاد میسر ہوا جس کی برکت سے مولانا صاحب کا علمی، روحانی اور عملی پایہ بہت ہی بلند و اعلیٰ

ہو گیا۔

مولانا صاحب ایک طرف علوم عقلیہ کے ماہر تھے دوسری طرف علوم نقلیہ، علم حدیث، علم تفسیر و علوم الاصول میں بے نظیر دسترس رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ جدید علوم کا بھی مطالعہ کیا تھا اور قوموں کی سیاست اور ترقی و تمدن کے حالات اور اصول کی گہرائیوں تک غور و فکر کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا اکثر و بیشتر حصہ حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفے اور تعلیمات کے مطالعہ اور اس کی اہمیت کے معلوم کرنے اور تدقیق و تحقیق میں گذارا۔ دنیا کی بھی سیر و سیاحت کی اور چشم دید حالات و حقائق سے روشناس ہوئے۔

تفسیر قرآن مولانا صاحب کا عمر بھر کا مرغوب ترین مشغلہ رہا ہے۔ ان کی ابتدائی تفسیر جو انہوں نے قیام دہلی کے دوران میں پہلی عالمی جنگ سے پہلے مرتب کی تھی ان کی نقلیں سندھ یونیورسٹی حیدر آباد اور دوسری جگہوں میں موجود ہیں لیکن یہ تفسیر جو اب شائع ہو رہی ہے اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ مولانا صاحب کا تجربہ و مشاہدہ اور علمی معیار بہت بڑھ چکا تھا۔ اس وقت تک ان کا نقطۂ نظر بہت ہی وسیع ہو چکا تھا اور ان کا قلب دیار حبیب (ﷺ) اور فیوض الحرمین کے انوار کا منبع بن چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تفسیر بڑے بڑے علمی مباحث اور نکات و رموز سے پُر ہے۔ اس میں جدید فلسفہ اور سائنس کے اصول، سیاسیات اور تمدن و ارتقاء ملل کی تعلیمات وغیرہ سبھی کی اثراندازی موجود ہے۔ تاہم کہیں بھی عقل کو روحانیت اور طبعیات کو اشراقیت پر اس قدر فوقیت نہیں دی گئی کہ اصولی عقائد میں سلف صالحین سے کسی بھی اہم بات میں لاینحل اختلاف ہو۔

اس تفسیر میں یہ خصوصیت ہے کہ طبعیات اور جدید سائنس اور علوم کو بھی قرآنی مسائل کے سمجھنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ قرآنی نقطۂ نظر سے ان کی اصلیت کا اندازہ لگانے کے راستے بھی دکھائے گئے ہیں۔ موجودہ زمانے میں جو مختلف

حالات اور رجحانات پیدا ہو رہے ہیں ان سب میں قرآن پاک ہی سے ہدایت حاصل کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے اسی وجہ سے یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ قرآن پاک انسانی ہدایت کے لیے ایک بین الاقوامی راہ ہے اور نجات دلانے کا ایک واحد مصدر عام ہے۔ اس میں انسانیت کے لیے ہر زمانے اور تمام حالات میں نور ہدایت، راہ نجات اور فلاح و عروج کے لیے فیوض و برکات میسر ہوتے رہیں گے۔ یہ تفسیر بعض دیگر تفسیروں سے مختلف ہے جن میں فقط شان نزول اور اسرائیلی قصے اور کہانیوں پر اکتفا کرنے کی وجہ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید قرآن فقط مخصوص مواقع اور گذشتہ زمانے کے لیے ہی نازل ہوا تھا۔ لیکن اس تفسیر سے قرآن شریف کی تعلیمات کی عمومیت اور بین الاقوامیت ظاہر ہوتی ہے اور وہ تعلیم جو ساری انسانیت کے لیے اور ہر وقت، ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے ہے، حاصل ہو سکتی ہے۔

اس تفسیر میں بعض جگہ بہت بڑے بڑے مضامین، اعلیٰ افکار اور دقیق مسائل بھی زیر بحث ہیں۔ اس وجہ سے بعض مواقع قدرے مشکل معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن سمجھدار اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ان کا سمجھنا اور حل کرنا مشکل نہیں۔ بعض مواقع پر کافی تفصیل سے کام لیا گیا ہے لیکن بعض جگہ اختصار بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ چونکہ بعض مسائل پر پہلے ہی تفصیل سے بحث آچکی ہے اس لیے اس آخری پارے میں ان کے متعلق اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ پھر بھی ماشاء اللہ اتنی تفصیل اور اس قدر علوم، رموز اور کوائف پائے جاتے ہیں جو دوسری تفاسیر میں نہیں ملتے۔

ہر مفکر اور مفسر کا کوئی نہ کوئی علمی اور ذہنی موقف ہوتا ہے۔ اس تفسیر میں مولانا عبید اللہ صاحب کا علمی اور فلسفی موقف شاہ ولی اللہ دہلوی کی حکمت اور فلسفہ و تعلیم ہے۔ اسی وجہ سے شاہ ولی اللہ کی حکمت کی بکثرت اصطلاحات اور الفاظ مستعمل ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس حکمت اور فلسفے سے روشناس ہوں گے ان کو اس تفسیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ ایسے الفاظ و اصطلاحات یہ ہیں: روح اعظم یا روح اکبر۔ شان الٰہی۔

ابداع۔ خلق۔ تدبیر۔ عرش۔ ماء۔ ملأالاعلیٰ۔ حظیرہ القدس۔ تجلی۔ حیوانیت۔ بہیمیت۔ ملکیت۔ عالم الشہادہ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ اور حکمت سے اگر ہمارا تعلق ہوگا تو ہم کو قرآن پاک کے مختلف رموز و حقائق سے زیادہ وقوف حاصل ہوگا اور پھر ہمیں اس تفسیر کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوسکے گا کہ قرآن انسانی کی فطری ضروریات اور حاجات کو پورا کرنے کے لیے ضروری اسباب و سامان مہیا کرتا ہے اور طریقے بھی بتاتا ہے اور واقعی اسلام دین فطرت ہے اور قرآن تعلیمات دین فطرت کی حامل ہیں۔

حضرت مولانا مضمون کے لحاظ سے اس جزء عم کو تین حصوں میں تقسیم کر کے بتاتے ہیں کہ سورۂ نباء سے لے کر سورۂ اعلیٰ تک انسان کے معاد اور مستقبل کی زندگی اور قیامت کے متعلق بیان ہے۔ اور سورۂ اعلیٰ سے لے کر سورۂ قدر تک انسانیت کی فطرت کے متعلق ارشادات ہیں اور سورۂ قدر سے لے کر آخر تک قرآن شریف کی تعلیمات کا لب لباب بیان کیا گیا ہے۔ اس سے سمجھدار لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف انسانی فطرت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بہترین نسخہ ہے اور جو اس نسخہ کو استعمال کرے گا وہ فطری ترقی اور عروج اور ہمیشہ کی زندگی کی بہتری اور کمال میں سبقت لے جائے گا۔ اس کے علاوہ اس پارہ کے مطالعہ سے زندگی کے رموز و اسرار اور اعلیٰ علوم بھی حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً قوموں کے عروج و زوال کے اصول، انقلاب کے نظریے، ارتقاء اور ترقی کے مسائل، دنیا اور کائنات میں اعلیٰ اور ادنیٰ طبعی اور اصولی قوانین، اللہ کی اور غیراللہ کی پرستش کی نفسیات، روز محشر، کتابتِ اعمال، سلسلۂ حیات، شرائع و ملل کے تعلقات وغیرہ وغیرہ مسائل کے بارے میں فہم و بصیرت حاصل ہوسکتی ہے اور اس کا حصول اللہ کے فضل و کرم کی ایک بڑی نشانی ہے۔

اس تفسیر کے ساتھ قارئین کی سہولت کے لیے قرآن شریف کی آیات اور

ترجمہ بھی دیا گیا ہے یہ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کا ہے جو مولانا عبید اللہ سندھی کے استاد تھے۔ تفسیر کے جامع مولانا عبداللہ لغاری صاحب کے مشورہ ہی سے یہ ترجمہ منتخب کیا گیا ہے تاکہ دونوں بزرگوں کی قرآنی خدمات سے استفادہ ہو سکے۔ کبھی کبھی ترجمہ اور تفسیر میں قدرے مطابقت نہیں پائی جاتی لیکن یہ اختلاف در حقیقت علم کے ازدیاد کا باعث ہوگا۔ کیونکہ پڑھنے والے کو دونوں بزرگوں کے نقطۂ نظر سے واقفیت ہوگی اور قرآن کے سمجھنے میں مزید وسعت حاصل ہوگی۔

اللہ پاک ہم سب کو قرآن کے علوم و حقائق سے آگاہ فرمائے اور قرآن پر عمل کرنے کی توفیق اور استقامت عطا فرمائے۔ (آمین) ۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

المفتقر الی اللہ
ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ، ایم اے (بمبئی) ڈی فل (آکسفورڈ)
فاضل علوم دینیہ مدرسہ مظہر الحق نصرپور سندھ
صدر شعبہ علوم دین و تہذیب اسلام سندھ یونیورسٹی حیدر آباد (سندھ)

حرفِ فکر

مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ (متوفی 1944ء) اس قافلہ کے ممتاز ترین فرد ہیں جس نے بر عظیم کی آزادی کے لئے بنیادی اور لازوال کردار ادا کیا، وہ اپنے مربی اور استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کے سچے اور مخلص پیرو کار اور شاگرد تھے۔ انہی کے حکم پر وہ ہندوستان چھوڑ کر کابل گئے اور نہ صرف وہاں کے برسر اقتدار طبقے میں اپنے استاد کے اثر ورسوخ اور اپنی خداداد حکمت عملی کی وجہ سے گہرے اثرات چھوڑے بلکہ افغانستان کے استقلال کو ہمیشہ کے لیے حقیقت بنا گئے۔ کابل میں اعلی مسلم طبقہ کے نقائص سے آگاہی کے بعد سابق سوویت یونین گئے اور وہاں دیمک زدہ مذہب کو معاشرے کی لغت سے خارج ہوتے دیکھا، لیکن اس سے انہیں اپنے سچے مذہب کی حکمت و فلسفہ پر عمیق انداز میں مطالعہ کا موقع ملا پھر ترکی میں مسلمانوں کی جذباتی امیدوں کے مرکز خلافت عثمانیہ کی لپٹی ہوئی بساط پر قائم کمالی حکومت کو جانچنے کا موقع ملا اور بالآخر مکہ مکرمہ کے پرتاثیر ماحول میں اپنے مشاہدات و مطالعات کو قرآن کی حکمت کے زاویہ سے پرکھنے اور محققانہ نظر سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی اور اس سلسلے میں انہوں نے قرآن حکیم کی فلاسفی سے گہری واقفیت کے لئے امام شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی تصنیفات کو حرزِ جاں بنالیا۔

زیر نظر افادات قرآنی در حقیقت اسی عرصہ کی یادگار ہیں جو مولانا عبید اللہ سندھی نے مکہ مکرمہ میں گزارا، یہ افادات مولانا عبد اللہ لغاری مرحوم نے قلمبند کئے تھے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

یہ افادات دراصل قرآن حکیم کے حقائق میں غور وخوض کی علامت ہیں، قرآن حکیم کے حقائق لامحدود اور اسکی ہر آیت اپنے ظاہری مفہوم کے ساتھ ساتھ باطنی حقیقت سے مالامال ہے، اور ہر دور کے مفسرین نے اپنے عصری تقاضوں اور داخلی رجحانات کے سبب قرآن کو کسی ایک زاویہ سے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور پھر اس

کی گہرائی میں جا کر علم کی ایک نئی دنیا آباد کر دی، کسی مفسر نے اپنی علمی کاوش کو حرف آخر اور میزان حق ہی قرار دیا اور نہ ہی کسی دوسرے مفسر کی تحقیقی محنت کو بے وقعت جانا، چنانچہ علمی ورثہ میں لغوی، نحوی، فقہی، بلاغی، ادبی، مذہبی، فلسفی، اور تصوفی رجحانات کی حامل متنوع تفاسیر شامل ہیں۔ ان مفسرین میں ایسے افراد بھی ہیں جو کچھ مسائل میں اپنی منفرد رائے بھی رکھتے ہیں، اس تناظر میں ان سے اختلاف بھی کیا گیا ہے اور اتفاق رکھنے والوں کی تعداد بھی موجود رہی ہے، لیکن یہ اتفاق و اختلاف ایک خاص دائرے کے اندر رہا ہے، اسکو کبھی بھی کردار کشی کا ذریعہ نہیں بنایا گیا اور نہ ہی اسے اسلام و کفر کے مابین معرکہ آرائی کے حوالہ سے دیکھا گیا ہے اور یہی ایک صحت مند معاشرے کی پہچان ہوتی ہے کہ علمی بنیادوں پر آراء کا اختلاف، سوچنے والے ذہنوں کے لئے مہمیز کا کام دیتا ہے اور انہیں حوصلہ دیتا ہے کہ وہ عصری رجحانات میں چھان پھٹک کر سکے اسکے صالح عنصر کو اپنی ماضی کی اعلیٰ قدروں سے ہم آہنگ کریں۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے قرآنی افادات کسی صورت گزشتہ تفاسیر کے انکار کا نتیجہ نہیں بلکہ اسکے برعکس ان سے بھرپور استفادہ کے ساتھ ساتھ آیات میں غوطہ زنی کے ذریعہ معارف کی تلاش پر مبنی ہیں، وہ تو اپنے معاصر مفسرین سے استفادہ میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے چنانچہ بعض حضرات کا نام لیکر انہوں نے تذکرہ بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے قرآن حکیم کی آیات پر اجتماعی حوالہ سے غور و خوض کر کے معاشرے کے عروج و زوال کو اپنا خصوصی میدان تحقیق کے طور پر منتخب کیا ہے۔

اس سلسلے میں ان کے سامنے قرآن کا یہ ارشاد رہا ہے **"فاعتبروا یا اولی الابصار"** کہ اہل بصیرت اعتبار سے کام لیں، اور اعتبار اس عمل کا نام ہے کہ درپیش مسائل کو قرآن کے ارشادات و آیات کی روشنی میں زیر بحث لا کر ان کا متوازن حل تجویز کیا جائے۔ قرآن حکیم کی یہ آیات غزوہ بنو نضیر کے پس منظر میں نازل ہوئی اور جو اپنے متبادر مفہوم میں بنو نضیر کے زوال سے نتائج اخذ کرنے کی دعوت پر مبنی ہے۔ لیکن فقہاء کرام نے اس کے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے اس سے اصول قیاس

کے حجت ہونے پر استدلال کیا جو یقیناً اس کا ایک دُور کا مفہوم ہے۔ اور اس استدلال پر کسی نے فقہاء کی دین دوستی کو چیلنج نہیں کیا تو اگر کوئی صاحب فکر اس فقہی استنباط سے کہیں قریب تر مفہوم یعنی قوموں کے اجتماعی عروج و زوال کے حوالے سوچنے کی ریت ڈالے اور امت مسلمہ کو شعوری اعتبار پر قرآن سے جوڑنے کی سعی کرے تو اسکی نیت پر کیوں کر شک کیا جائے اور اسے گمراہی کیوں کر تصور کیا جائے؟

مولانا عبیداللہ سندھی نے مستقل بنیادوں پر کوئی تفسیر ہی تحریر کی اور نہ ہی گزشتہ تفسیروں کو حرف غلط قرار دیکر ان کی نفی کی ہے، انہوں نے تو اپنے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے حکم پر قائم نظارۃ المعارف القرآنیہ کے کام (مطالعہ قرآن) کو آگے بڑھایا۔ واضح رہے کہ اس ادارہ میں دی گئی تعلیم پر شیخ الہند نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ ان کے ارشاد پر ہی مولانا سندھی نے امام شاہ ولی اللہ کے افکار سے اپنا ناطہ جوڑا یہی سبب ہے کہ مولانا سندھی نے اپنے قرآنی افادات میں امام شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کو اساسی حیثیت دی ہے۔

مولانا سندھی کے قرآنی افادات، درحقیقت تکملہ ہیں اس کام کا جو حضرت شیخ الہند نے خانقاہ عالیہ رائے پور کے بانی صدر نشین حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری کے پرزور اصرار پر قرآن حکیم کے ترجمہ کی صورت میں کیا تھا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولانا سندھی، قرآن حکیم کے متبادر مفہوم کے کسی طور منکر نہیں، یہی سبب ہے کہ وہ اپنے استاد کے ترجمہ پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے قرآنی افادات سے صحیح طور پر استفادہ کا طریقہ یہی ہے کہ قرآن حکیم کے ترجمہ شیخ الہند اور امام شاہ ولی اللہ اور امام شاہ عبدالقادر کے تفسیری نکات سے آگاہی حاصل کرکے ان کا مطالعہ کیا جائے اور ان کو افکار ولی اللہی کی وضاحت تصور کیا جائے۔

سلف میں قرآنی اشارات پر مبنی تفسیر کبھی اجنبی نہیں رہی، اور مولانا سندھی کے قرآنی افادات کسی طور پر ان حدود سے تجاوز نہیں کرتے، وہ ظاہری معنی کو تسلیم کرکے نظم قرآنی کے مطابق اپنے مفہوم کی نشاندہی کرتے ہیں جو قرآن کے بنیادی اصولوں اور مقاصد نزول کی ترجمانی کرتا ہے، نیز نزول قرآن کے وقت عربوں کی

اجتماعی حالت اور دور حاضر کی اجتماعیت کے تقاضے ان کی نظروں میں ہوتے ہیں، جس سے ان ذہنوں کو یقیناً الجھن ہو سکتی ہے جو صرف اور صرف دور عباسی اور/اس کے بعد کے رجحانات سے مانوس ہیں۔ جن کے ہاں قرآن، اعلیٰ عربی لٹریچر کی کتاب تو ہے، لیکن مسائل کے حل کے لئے دیگر دینی کتب سے رجوع ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

مولانا سندھی اس امر کی شعوری کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کو نہ صرف عقیدے کی حد تک بلکہ عملی و تطبیقی طور پر بھی تمام دیگر دینی کتب (بشمول کتب حدیث و فقہ) پر بالادستی دی جائے۔ وہ قرآن حکیم کے مقابلہ میں کسی اور کی اہمیت ماننے کے لئے تیار نہیں تاہم اس کے بعد وہ دوسرے درجہ میں نہ صرف دینی لٹریچر کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ وہ ان پر مبنی فکر کے تاریخی تسلسل کے بغیر آگے بڑھنے کو خطرناک تصور کرتے ہیں۔ وہ قرآن حکیم کو فقہی مسائل کی کتاب یا واقعات کی دستاویز کی بجائے کتاب حکمت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ ان کا خودساختہ انداز فکر نہیں بلکہ وہ قرآن کی اپنے بارے میں بصورت قسم "حکیم" ہونے کی گواہی کو حرف سمجھ کر تمام آیات قرآنی کو اس گواہی کی تائید میں لاکھڑا کرتے ہیں۔

پھر وہ قرآن کو محض نظری حکمت کی کتاب نہیں سمجھتے بلکہ وہ اسکو کتاب عمل کے طور پر بھی نمایاں کرتے ہیں جو در حقیقت نزول قرآن کا حقیقی مقصد ہے۔ اسی لئے وہ غفلت، کاہلی اور تعیش پرستانہ زندگی کی شدت سے نفی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مسئلہ شفاعت کی اس تعبیر کو بھی قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ مسیحی عقیدہ کفارہ کا دوسرا ایڈیشن بن جاتا ہے۔ لیکن یہ ان کا متوازن فکر ہے کہ وہ شفاعت کا انکار نہیں کرتے بلکہ بتاتے ہیں، کہ یہ شفاعت بھی بعض اعلیٰ انسانی احساسات و خیالات کا ہی نتیجہ ہوگی، جو اس کے اعمالنامے میں درج ہونے سے اس بنا پر رہ گئے ہوں گے کہ ان تک مقررہ نظام کے ذمہ دار فرشتوں کی رسائی نہیں ہو سکی ہوگی۔

قرآن کے کتاب حکمت ہونے کے ناطے وہ غلبہ اسلام کے لئے پہلے درجہ میں سیاسی فتح کو اساس ماننے کی بجائے ذہنیت کی تبدیلی کو بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیتے

ہیں کہ یہی امر، معاشرتی تبدیلی کا سنگ بنیاد ہے۔ اس طرح وہ اپنے ان ہم عصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں جنہوں نے اسلام کو اول تا آخر ایک سیاسی مذہب کے روپ میں پیش کیا۔ اور اسی فکر نے معاشرے میں سیاسی مخالفوں کو کافر قرار دینے کی روایت کو پروان چڑھا کر تشدد و تخریب کاری کی داغ بیل ڈالی ہے۔

آج دنیا میں سیاسی مذہب ہی اسلام کے نام پر بدنامی کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ جبکہ مولانا سندھی اسکو فکری و معاشرتی مذہب کے طور پر نمایاں کرتے ہیں۔ اسی بنا پر قرآن حکیم کی مکی و مدنی آیات بھی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مولانا سندھی نے سورتوں اور آیات کے باہمی ربط کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں محض نظری طور پر نہیں بلکہ حقائق و مشاہدات کے حوالہ سے بھی آیات کے باہمی ربط کو نمایاں کرتے ہیں اور اس پر اپنے فکر کو استوار کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ قرآنی آیات کی روشنی میں واضح کرتے ہیں کہ انسان پر سب سے بڑا انعام اسکی روحانی ترقی ہے جس کے لئے وہ انتہائی عبادت سجدہ کی صورت میں بجالاتا ہے۔ لیکن یہ روحانی ترقی، معاشرتی اصلاح احوال (انقلاب) کے بغیر ادھوری اور نامکمل بلکہ بسا اوقات ایک فریب ہے، گویا سماج کے لئے صالح کردار کے بغیر روحانی ترقی ناممکن ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ قرآنی حوالہ سے اس امر کو بھی نمایاں کرتے ہیں کہ قومی نظام کی اصلاح کے لئے اللہ تعالی سے تعلق ضروری ہے۔ ورنہ یہ نظام، انسانیت کے لئے وبال کا باعث بن جاتا ہے، چنانچہ تاریخ میں اسکی کئی ایک مثالیں موجود ہیں کہ غریبوں کے نام پر جدوجہد کرنے والے، کامیابی کے بعد حکمرانی کے نشہ میں مست ہو کر غریبوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کا باعث بن جاتے ہیں، اور سرکشی پر اتر آتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ بالآخر قومی نظام، سامراجی نظام میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

مولانا سندھی، اس تفسیری روش سے بھی اختلاف کرتے ہیں کہ قرآن حکیم کی تمام آیات کو بدوی (سطحی) ذہنیت کے مطابق پیش کیا جائے اس کے برعکس ان کا کہنا ہے کہ قرآنی آیات مختلف ذہنیتوں کے مطابق نازل کی گئی ہیں اور انمیں اعلیٰ درجہ کے صاحب حکمت طبقہ کی ذہنیت کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ گویا اس حوالہ سے

ان کے نزدیک قرآن حکیم، کتاب تمدن بھی ہے۔ اسی بنا پر قرآن معاشرے میں اظہار رائے کی آزادی اور معاشی خوشحالی کو ضروری قرار دیتا ہے کہ ان کے بغیر تمدن کھوکھلا اور تباہ ہو جاتا ہے۔

الغرض مولانا عبید اللہ سندھی کے قرآنی افادات اگر معروف اور محدود معنوں میں تفسیر کے زمرے میں شامل نہ بھی ہوں تب بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ "اعتبار" "تاویل" اور "نظیر ما ورد بہ القرآن" کے دائرے سے کسی صورت تجاوز نہیں کرتے۔ اور مولانا سندھی کا ان افادات کے ذریعہ اہل حکمت کو پیغام ہے کہ وہ قرآنی حکمت سے بہرہ ور ہو کر اپنے اجتماعی مسائل کے حل کے لئے اس سے رجوع کریں۔ اور جب بھی کوئی ایسی اجتماعیت منظم ہو گئی جو قرآنی حکمت کی اساس پر سماج میں تبدیلی کو اپنا نصب العین قرار دے تو یقیناً یہ افادات اس کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گے۔

زیر نظر قرآنی افادات المقام المحمود کے نام سے جانے جاتے ہیں المقام المحمود کا اصل نسخہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ سابق ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے پاس ہے اور اس کی مائیکرو اور فوٹو سٹیٹ ادارہ مذکورہ کی لائبریری میں موجود ہے۔

مولانا عبد اللہ بن نہال خان لغاری نے سورۃ الفاتحہ اور سورہ یونس سے سورۃ الناس تک کے افادات مولانا عبید اللہ سندھی سے بالمشافہ سنے اور تحریر کئے، جبکہ سورۃ البقرہ سے سورۃ التوبہ تک کے افادات جناب فیروز خان صاحب نے مولانا سندھی سے سن کر قلمبند کئے، جنکو بعد ازیں مولانا لغاری نے مولانا سندھی کے ارشاد پر نقل کیا۔

المقام المحمود کے سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ پر مشتمل حصہ کو ڈاکٹر منیر احمد مغل صاحب نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ کی زیر نگرانی ایڈٹ کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، اور یہ حصہ مکتبہ رشیدیہ لاہور کے ذریعہ منظر عام پر آچکا ہے۔ جبکہ سورۃ النبا سے سورۃ الناس تک کا حصہ اردو ٹائپ پر شائع ہو کر نایاب ہو چکا ہے۔

اب صفہ اکیڈمی راولپنڈی کے صاحب نظر ڈائریکٹر مولانا محمد عابد کشمیری صاحب اس حصے کو کمپیوٹر پر کمپوز کروا کر ظاہری و معنوی اہتمام کے ساتھ شائع کر رہے

ہیں۔ جس پر وہ معارف قرآنی کے شائقین، سلسلہ ولی اللہی کے وابستگان اور دیگر اہل علم و دانش کی طرف سے مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔

ہماری رائے میں اہل مدارس کو اپنے خصوصی حلقہائے مطالعہ قرآن میں المقام المحمود کو شامل کرنا چاہیئے تاکہ وہ عصر حاضر میں اسلام کی متوازن تعبیر پر دسترس حاصل کر کے نسل نو کی درست خطوط پر رہنمائی کر سکیں۔ نیز ملکی جامعات کو اپنے اعلیٰ تعلیمی نصابوں میں اس تفسیر کو شامل کرنے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے اور نہ صرف یہ بلکہ اگر مجوزہ قرآنی فیکلٹی میں بر عظیم (پاک، ہند و بنگلہ دیش) کے حوالہ سے تفسیری کام اور بالخصوص امام شاہ ولی اللہ اور ان کے سلسلہ کی تفسیری کاوشوں پر مستقل شعبہ قائم کر دیا جائے تو اس سے اس فیکلٹی کی افادیت نہ صرف بڑھ جائے گی بلکہ افکار میں جمود و تعطل کی جگہ ارتقاء و حرکت کے ذریعہ نئے افق کی تلاش ممکن ہو سکے گی جس کی ملت اسلامیہ کو اشد ضرورت ہے۔

اسی طرح مساجد میں درس قرآن کا اہتمام کرنے والے علماء و خطباء اس تفسیر کے ذریعہ اپنے ارشادات کو زیادہ بامعنی اور پر مغز بنا سکتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کے ہاں بھی اس تفسیر کو پذیرائی حاصل ہو گی۔

مفتی سعید الرحمن
استاد جامعہ بہاء الدین زکریا۔ ملتان

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے حالاتِ زندگی

مولانا عبیداللہ سندھی بیسویں صدی میں برعظیم پاک و ہند کے سیاسی افق پر ایک روشن ستارہ ہیں۔ وطن کی آزادی کیلئے ان کی جدوجہد، جلاوطنی، اپنے اساسی فکر و فلسفہ کی روشنی میں انقلاباتِ عالم کا تجزیہ اور روحِ عصر اور دھرتی کے تقاضوں کے مطابق نئے نظام کی تشکیل کے بارے میں ان کے افکار مستقبل کی تحریکوں کے لئے مینارہ نور ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی 15 مارچ 1872ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ حصول تعلیم کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں گئے اور مولانا تاج محمد امروٹی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگرد رہے۔

حضرت شیخ الہند نے جمعیتہ الانصار قائم کی تو مولانا عبیداللہ سندھی کو اس میں کلیدی کردار سونپا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہند نے نظارۃ المعارف کی بنیاد رکھی تو مولانا سندھی کو اس میں شریک کیا۔ حضرت شیخ الہند نے پہلے دیوبند میں مولانا کا تعارف اپنی جماعت کے ارکان سے کرایا تھا، اور اب دہلی میں نوجوان طاقت سے متعارف کرانے کی غرض سے وہاں تشریف لے گئے اور مولانا کو ڈاکٹر انصاری سے ملایا اور ڈاکٹر انصاری نے ان کی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے کرائی۔ اب ان کی شناسائی اور رابطہ مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی قیادت سے ہو گیا۔

1915 میں شیخ الہند نے مولانا سندھی کو ایک تاریخی مشن پر کابل بھیجا۔ انہیں اس سلسلہ میں زیادہ تفصیلات نہیں بتائی گئی تھیں۔ لیکن وہاں جا کر انہوں نے دیکھا کہ حضرت شیخ الہند کی جماعت کی پچاس سالہ محنت کا حاصل ان کے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار تھا۔ کابل میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت سے

کام کرتے رہے۔ 1922ء میں اپنے وطنی دوستوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے کے لیے انہوں نے بیرون ملک کابل میں پہلی کانگریس کمیٹی بنائی اور برٹش ایمپائر سے باہر اس کانگریس کمیٹی کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

اس کے بعد مولانا کابل سے روس تشریف لے گئے روس کی حکومت نے انہیں سرکاری مہمان کی حیثیت دی اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولیات فراہم کیں۔ مولانا سمجھتے ہیں کہ اس مطالعہ کے نتیجہ میں وہ اپنے دینی فلسفہ کو لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوئے۔ روس میں مولانا کا قیام سات ماہ تک رہا۔ اس دوران روس کی سیاحت اور وہاں کے اشتراکی انقلاب کے مطالعہ کے بعد مولانا نے اپنے وطن کو بدیسی غلامی سے نجات دلانے اور اس کے عوام کو پستی کی زندگی سے نکال کر عظمت و سربلندی عطا کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل تشکیل دیا اور ترکی پہنچ کر اسے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کردیا تاکہ ان کے تمام اہل وطن کو اس کا فہم حاصل ہوسکے یہ لائحہ عمل قومی، جمہوری، سائنسی، سوشل اور عدم تشدد کے اصول پر مبنی تھا۔

ترکی میں مولانا سندھی 1923 میں پہنچے۔ ماسکو میں متعین سفیر ترکیہ اور ماسکو کی وزارت خارجہ نے مل کر مولانا کے لیے راستہ کا تعین کیا اس طرح کہ برطانوی کارندے اس کا پتہ نہ چلاسکیں۔ ترکی میں تین سال قیام کے بعد مولانا سندھی مکہ مکرمہ پہنچے اور بارہ سال تک یہاں قیام رہا۔ یہاں انہیں اپنے تجربات اور خیالات پر مزید غوروفکر کا موقع ملا۔ علاوہ ازیں اس دوران ہندوستان کے اخبارات ورسائل اور کتابوں کے ذریعہ انہیں اپنے وطن کے حالات سے برابر آگاہی رہتی اور حج کے موقع پر آنے والے مسلمانوں سے ملاقات کے ذریعہ ان کے خیالات جاننے کا موقع ملتا جن کی روشنی میں وہ اپنے سیاسی پروگرام کا جائزہ لیتے رہتے۔

مارچ 1939ء میں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کی کاوشوں کے نتیجہ میں واپس

ہندوستان پہنچے اور آتے ہی اپنے افکار کی اشاعت شروع کردی ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کیا اور بیماریوں اور پیرانہ سالی کے باوجود سخت جدوجہد کی۔ کئی ادارے قائم کیئے اور ایک سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھی۔ بالاخر اسی جدوجہد میں مصروف 22 اگست 1944 کو آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کی آواز عصر حاضر کی طاقتور ترین آواز ہے۔ یہ اپنی تاریخی وابستگی کے ساتھ جدید دور کے تقاضوں کا موثر جواب ہے۔ تاریخ کی قوتیں، تیز رفتاری کے ساتھ آنے والی عالمی تبدیلیاں اور ایشیا و افریقہ کی اقوام کو پیش آنے والے روز افزوں مسائل مولانا سندھی کے افکار کی سچائی کو ثابت کر رہے ہیں۔ ہمیں آج نہیں تو کل مولانا کی آواز پر لبیک کہنا ہی ہوگا۔

قاری سعید اختر
لیکچرر شعبہ انگریزی۔
فیڈرل گورنمنٹ کالج، ایچ ایٹ، اسلام آباد

تفسیر کے جامع مولانا عبداللہ لغاری مرحوم کے حالات

* عبداللہ بن نہال خان بن محمد خان بن رستم خان بن فتح محمد خان لغاری ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں بمقام "دادلغاری" تحصیل میرپور ماتھیلا (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ اپنے پھوپھی زاد بھائی مولوی محمد یعقوب سے صرف کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ صرف کی بقیہ کتابیں اور نحو کی کچھ کتابیں "گوٹھ پنھواری" میں مولوی عبدالقادر سے پڑھیں۔ اس کے بعد "نوشہرہ فیروز" میں قاضی محمد عالم، قاضی عبدالرؤف، قاضی عبدالحفیظ اور مولوی فیض الکریم کے یہاں تعلیم حاصل کی پھر سندھ کے مشہور حکیم شمس الدین احمد صاحب (سلمہ اللہ تعالیٰ) کے چچا مولوی عبدالکریم بن مولوی محمد عثمان سے (جو حافظ حدیث تھے اور علامہ شوکانی کے شاگرد تھے) تعلیم پائی۔ پھر موقع ملا تو مقام "ڈبھرہ" کے قریب مخدوم غلام محمد بن مخدوم حبیب اللہ سے مستفیض ہوئے۔ اسی مقام کے قریب ایک گاؤں "تگون" ہے۔ وہاں ایک صوفی اور مشہور خطاط مولوی عبدالقدوس تھے۔ ان سے بھی فیض حاصل کیا۔ پھر کراچی میں مولانا محمد صادق کے والد مولانا عبداللہ سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں اس کے بعد ٹھٹھہ کے مشہور عالم مولانا محمد علی مرحوم کے بعض شاگردوں سے بھی استفادہ کیا۔ اور گھر واپس آئے تو مولوی محمد امین ناراض ہوئے کہ تم نے سیروسیاحت میں اپنا وقت ضائع کیا ہے اب ملتان جاؤ۔ چنانچہ یہ ملتان کے مشہور محدث مولانا سلطان محمود کے پاس ایک سال تک علم حدیث حاصل کرتے رہے پھر بہاول پور میں "صاحب السیر" کی خانقاہ میں مولوی عبدالرشید سے تعلیم حاصل کی اور کچھ دن مولوی عاقل سے بھی مستفیض ہوئے۔ پھر مولوی الٰہی بخش لانگاہ منطقی عمرپوری سے حدیث، فقہ اور منطق کی آخری کتابیں پڑھیں اور سلسلۂ تعلیم ختم ہوا۔ وطن واپس آئے

---

(۱) یہ حالات جناب حافظ محمد صاحب (اسسٹنٹ لائبریرین سندھ یونیورسٹی) سے حاصل کیے گئے ہیں۔ جنھوں نے سندھی ادبی بورڈ کے رسالہ مہران کے "سوانح حیات نمبر" (مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۵۷ء، ص ۲۷۰، ۲۷۹ اصل مضمون بعنوان "مولوی عبداللہ لغاری" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ) سے بہت کچھ اخذ کیے تھے۔

تو ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء) میں شادی ہوئی۔ اس کے بعد "امروٹ" میں مولانا عبید اللہ سندھی سے ملاقات ہوئی اور ان کی انقلابی سیاست میں رفیق کار بن گئے مولانا کے نظریات کے نشر و اشاعت کے لیے امروٹ میں ایک مدرسہ اور ایک پریس بھی قائم کیا اور ایک رسالہ ہدایت الاخوان جاری کیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی گوٹھ "پیر جھنڈا" میں وہاں کے پیر صاحب کی حمایت سے ایک مدرسہ "دار الرشاد" قائم کیا۔ مولانا عبد اللہ اس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اس طرح وہاں ان دونوں بزرگوں کو ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) سات سال تک طلبہ میں "ذہنی بیداری" پیدا کرنے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن علیہ الرحمہ نے مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا محمد صادق کو طلب کیا اور سیاسی زندگی میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ مولانا عبد اللہ بھی ساتھ گئے تھے۔ وہ بھی متاثر ہو کر واپس آئے اور شیخ الہند کے مشورے کے مطابق ۱۹۱۴ء تک اس مدرسے کا انتظام سنبھالتے رہے۔ لیکن اسی سال مولانا عبید اللہ وہاں تشریف لائے اور "کابل" چلنے کے لیے فرمایا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں ان کے ساتھ کابل گئے اور مولانا عبید اللہ کے رفیق کار اور معتمد خاص بن کر رہے۔

* تقریباً دو سال بعد مولانا عبید اللہ نے ان کے ہاتھ اپنے اور راجہ مہندر پرتاب کے چند خصوصی خطوط بھیجے کہ وہ ہندوستان میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم محمد اجمل خان وغیرہ کو پہنچا دیں۔ نیز یہ کہ دین پور، امروٹ اور پیر جھنڈا والے بزرگوں سے ایک عبارت پر (جو کہ ان کو قلم بند کرادی گئی تھی) دستخط لے کر انگریزوں کے خلاف جہاد کی اجازت لیں۔ مولانا عبد اللہ نے یہ دونوں کام کیے اور اجازتیں لے کر سردار عبد الرزاق (میزان العلماء) کو کابل روانہ کر دیں۔

* "ریشمی خطوط" والے واقعے کے سلسلے میں مولانا عبد اللہ صاحب اور چند رفقاء گرفتار کیے گئے تھے لیکن مولانا کے بیان سے وہ رفقاء بعد میں رہا کر دیے گئے اور خود مولانا دو سال تک لاہور، پٹھان کوٹ، دین پور اور کراچی وغیرہ کے جیلوں میں نظر بند رہے اور پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر رہا کیے گئے۔ پھر جب انگریزوں کے خلاف امیر امان اللہ خان (والی کابل) برسرپیکار ہوئے تو مولانا عبید اللہ کو ان کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا

کیونکہ اس جنگ کے محرک مولانا عبید اللہ سندھی ہی تھے جن کے یہ رفیق تھے۔

* ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۶ء) میں مولانا عبید اللہ سندھی مکہ معظمہ پہنچے۔ بعد میں مولانا عبد اللہ لغاری بھی یہاں سے ان کی خدمت میں پہنچے۔ مولانا سندھی نے تفسیر قرآن، علوم اسلامیہ اور فلسفۂ شاہ ولی اللہ پر جو تقاریر کیں وہ سب مولانا عبد اللہ نے قلمبند کیں بلکہ جتنی کتابیں مولانا سندھی کی افکار اور شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کے مطابق شائع ہوئیں ہیں ان سب کا مواد درحقیقت مولانا عبد اللہ ہی کا جمع کردہ تھا۔ ۱۹۳۹ء میں مولانا سندھی واپس تشریف لا رہے تھے تو بعض انتظامات کی خاطر مولانا عبد اللہ ان کے آنے سے پہلے سندھ پہنچ گئے اور ان کے آخری دم تک ساتھ رہے۔ مولانا سندھی کی وفات کے کچھ عرصہ بعد قریباً چھ سال سندھ یونیورسٹی کے بعض استادوں اور شاگردوں کو قرآن پاک کی تفسیر و حکمت سمجھانے کے لیے یونیورسٹی میں وہ ڈاکٹر بلوچ صاحب اور ڈاکٹر بالیپوتہ صاحب کے یہاں مقیم رہے۔ بلکہ آخر کے تین سال ڈاکٹر بالیپوتہ صاحب کے مکان پر ہی مقیم رہے اور وہاں سے قرآن شریف اور حکمت ولی اللہی کی تعلیم جاری رکھی۔ آخر میں سندھی یونیورسٹی میں ایم اے کے طلبہ کو تفسیر پڑھانے کے لیے معلم مقرر ہوئے لیکن جلد ہی اچانک ۱۳ ستمبر ۱۹۵۸ء کو پیشاب بند ہوا تو ۱۵ ستمبر کو سول ہسپتال حیدر آباد میں داخل ہونا پڑا۔ ۱۷ ستمبر بروز چہار شنبہ ان کا آپریشن ہوا۔ حافظ محمد صاحب سے فرمایا کہ

دمے چند خوردیم و گفتیم و بس

اس کے بعد والی شب یعنی شب پنجشنبہ (۴ ربیع الاول ۱۳۷۸ء) کو ۱۱ بجے انتقال فرمایا اور اسی روز شام کو سانگھڑ میں دفن ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

فہرست

سُورَةُ النَّبَإِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اَرْبَعُوْنَ اٰيَةً فِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ نبا مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ☆

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝۱ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝۲ الَّذِيْ هُمْ

کیا بات پوچھتے ہیں لوگ آپس میں ف۱ پوچھتے ہیں اس بڑی خبر سے جس میں

فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝۳ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۴ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۵ اَلَمْ

وہ مختلف ہیں ف۲ ہرگز نہیں اب جان لیں گے پھر بھی ہرگز نہیں اب جان لیں گے ف۳ کیا ہم

نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝۶ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝۷ وَّخَلَقْنٰكُمْ

نے نہیں بنایا زمین کو بچھونا ف۴ اور پہاڑوں کو میخیں ف۵ اور تم کو بنایا ہم نے

اَزْوَاجًا ۝۸ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۹ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۰

جوڑے جوڑے ف۶ اور بنایا نیند کو تمہاری تکان دفع کرنے کے لیے ف۷ اور بنایا رات کو اوڑھنا ف۸

وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲

اور بنایا دن کمائی کرنے کو ف۹ اور چنیں ہم نے تم سے اوپر سات چنائی مضبوط ف۱۰

وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝۱۳ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً

اور بنایا ایک چراغ چمکتا ہوا ف۱۱ اور اتارا نچڑنے والی بدلیوں سے پانی کا

ثَجَّاجًا ۝۱۴ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝۱۵ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝۱۶ اِنَّ

ریلا ف۱۲ تاکہ ہم نکالیں اس سے اناج اور سبزہ اور باغ پتوں میں لپٹے ہوئے ف۱۳ بیشک

يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۝۱۷ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ

دن فیصلے کا ہے ایک وقت ٹھہرا ہوا ف۱۴ جس دن پھونکی جائے صور پھر تم چلے آؤ

اَفْوَاجًا ۝۱۸ وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝۱۹ وَّسُيِّرَتِ

جتھے جتھے ف۱۵ اور کھولا جائے آسمان تو ہو جائیں اس میں دروازے ف۱۶ اور چلائے جائیں گے

الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿٢٠﴾ إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿٢١﴾ لِّلطَّاغِينَ
پہاڑ تو ہو جاویں گے چمکتا ریتا وہ بیشک دوزخ ہے تاک میں شریروں کا

مَآبًا ﴿٢٢﴾ لَّابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا ﴿٢٣﴾ لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا
ٹھکانا وہ رہا کریں اس میں قرنوں وہ نہ چکھیں وہاں کچھ مزہ ٹھنڈک کا

وَلَا شَرَابًا ﴿٢٤﴾ إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ﴿٢٥﴾ جَزَاءً وِفَاقًا ﴿٢٦﴾
اور نہ پینا کچھ مگر گرم پانی اور بہتی پیپ وہ بدلا ہے پورا

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ﴿٢٧﴾ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا ﴿٢٨﴾
ان کو توقع نہ تھی حساب کی اور جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو مکر کر وہ

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ﴿٢٩﴾ فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ
اور ہر چیز ہم نے گن رکھی ہے لکھ کر وہ اب چکھو کہ ہم نہ بڑھاتے جاویں گے تم پر

إِلَّا عَذَابًا ﴿٣٠﴾ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ﴿٣١﴾ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ﴿٣٢﴾
مگر عذاب وہ بیشک ڈر والوں کو کامیابی ہے باغ ہیں اور انگور

وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ﴿٣٣﴾ وَكَأْسًا دِهَاقًا ﴿٣٤﴾ لَّا يَسْمَعُونَ فِيهَا
اور نوجوان عورتیں ایک عمر کی سب وہ اور پیالے چھلکتے ہوئے وہ نہ سنیں گے وہاں

لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا ﴿٣٥﴾ جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا ﴿٣٦﴾ رَّبِّ
بک بک اور نہ مکرانا وہ بدلا ہے تیرے رب کا دیا ہوا حساب سے وہ جو رب ہے

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمَٰنِ لَا يَمْلِكُونَ
آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے بڑی رحمت والا وہ قدرت نہیں کہ کوئی

مِنْهُ خِطَابًا ﴿٣٧﴾ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا
اس سے بات کرے وہ جس دن کھڑی ہو روح اور فرشتے قطار باندھ کر وہ

لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾
کوئی نہیں بولتا مگر جس کو حکم دیا رحمٰن نے اور بولا بات ٹھیک وہ

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ اِنَّآ

وہ دن ہے برحق پھر جو کوئی چاہے بنا رکھے اپنے رب کے پاس ٹھکانا ہم نے

اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ

خبر سنادی تم کو ایک آفت نزدیک آنے والی کی جس دن دیکھ لیگا آدمی جو آگے بھیجا اس کے ہاتھوں نے

وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾ ع

اور کہیگا کافر کسی طرح میں مٹی ہوتا

سورۃ النباء مکیہ

(کاشتکاروں کی ذہنیت کے مطابق قیامت کی حقیقت پر روشنی ڈالنے والی سورت ہے)

* آیت ۱ تا ۳: عم یتساءلون. عن النبأ العظیم. الذی هم فیه مختلفون انسانیت پر جو سب سے بڑا واقعہ آنے والا ہے وہ یہی ہے کہ جس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ آیت ۴ تا ۵ کلا سیعلمون اس میں جھگڑنے کی بات ہی نہیں، یہ جلد ہی سمجھ لیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کو یہی مسئلہ اس صورت میں سمجھا دیتے ہیں۔ آیت ۶ تا ۱۶ الم نجعل الارض مهادا الی قوله تعالی و جنات الفافاً اس مقدمہ کو مد نظر رکھ کر آگے بڑھیے۔ کہ ہم نے انسان کو زمین میں کاشت کیا ہے اور اس کے کاشت (بونے) کرنے کے لیے جس قدر سامان کی ضرورت تھی وہ ہم نے اسے بہم پہنچا دیا ہے۔ غرض ان آیات میں یعنی آیت ۱۶ تک انسان کی ضرورت کے واسطے تمام چیزیں بنائیں تاکہ انسان بڑھے پھلے پھولے، جب زمین پر انسان کی کاشت کر لی تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ ان یوم الفصل الخ کہ ایک دن فصل کاٹنے کا دن آئیگا۔ تو آیت ۱۸ تا ۲۰ میں اس فصل یعنی غلہ اور بھوسا جدا کرنے کا تھوڑا سا خاکہ ہے اور آگے قیامت کا ذکر آجائیگا۔

* آیت ۶: الم نجعل الارض مهاداً ہم نے زمین کو وسیع بنایا تاکہ تم اس میں کھیتی باڑی کر سکو۔ اسی طرح انسان کو زمین میں کاشت کیا اور اس کے واسطے تمام سامان بہم پہنچا دیئے۔ آیت ۷ و الجبال اوتاداً انسان کی زندگی پختہ قلعوں اور پختہ عمارتوں کی محتاج ہے۔ لڑنے بھڑنے میں انسان پہاڑوں سے سنگین عمارتیں بنا کر

اپنے لیے محفوظ جگہ بنالیتا ہے۔ یہی مطلب ہے کہ پہاڑوں کے میخ بنانے کا۔ اگر خالی زمین ہی نرم نرم ہوتی تو یہ انسان کی ضرورتوں کے واسطے کافی نہ ہوتی۔ (آیت۸) و خلقناکم ازواجاً یہ بیج بویا ہوا ہے اور اس سے تم سے آگے نسل بڑھتی ہے۔ (آیت۹) و جعلنا نومکم سباتاً نیند سے تکان دور ہوجاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم مسلسل کام کرتے رہو۔ اس واسطے تم کو تازہ دم کرکے وقفہ دیا تاکہ تم آگے پھر کام کرسکو۔ (آیت۱۰) و جعلنا اللیل انسان کی خاص ضرورتیں رات ہی کو پوری کی جاتی ہیں اور اس لیے اسے لوگوں سے علیحدگی ضروری ہے تاکہ ان سے ان کے کام ڈھکے رہیں۔ (آیت۱۱) و جعلنا النهار اور زندگی کا سامان جمع کرنے کے لیے دن کو۔ (آیت۱۲) و بنینا فوقکم تمہارے اوپر سات سخت چیزیں بنائیں یہ وہ سات آسمان ہیں جو اس زمین کے پہلے مرکز ہیں۔ پہلے وہاں چیزیں ہوتی ہیں اور پھر وہاں پر آتی ہیں قواصل مضبوط چیزیں وہاں (سات آسمان) ہی ہیں۔

* فلسفے کے سوچنے ہی کے دو مختلف طریقے ہیں (۱) ادنی سے شروع کرے۔ یہ ہے طبعی فلسفہ طبعیات کے عالم اسی طرح سوچتے ہیں اور ان کی یہی ذہنیت ہے۔ (۲) اور دوسرا سوچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اوپر سے نیچے کی طرف سوچا جائے۔ سب سے اوپر جس چیز کو انسان سوچ سکتا ہے اس کا نام ہے "وجود" اب اس ہستی میں جو سب سے پہلے غور کرنے بیٹھتے ہیں وہ الہیات کے عالم ہیں۔ وہ سب سے اوپر ایک قوی چیز مانتے ہیں۔ وجود سب سے قوی طاقت ہے اس وجود کا مالک ایک ہے جسے "اللہ تعالی" کہتے ہیں۔ پھر اس وجود سے نیچے اترنا شروع کرتے ہیں۔ وجود کا سب سے قوی حصہ روحانیات ہیں۔ اس سے دوم درجہ کی قوت کا مالک ہے عالم مثال جسے سمٰوات (آسمان) بھی کہا جاتا ہے یہ دوسرے درجہ کی چیز ہے اور تیسرے درجہ کی قوت کی چیز جسمانیات ہیں۔ پھر اسی طرح انسان سے بھی نیچے اترتے چلے جائیں اور اسی طرح سوچتے چلے جائیں۔ یہ الہیات کے حکماء کے سوچنے کا طریقہ ہے۔ الہیات کے طریقہ میں خاص لوگوں کے سوائے عام لوگوں کو تجربہ اور مشاہدہ نصیب نہیں ہوسکتا۔ عام لوگوں کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کا خیال درست کردیا جائے اسلئے اسے خیالی فلسفہ کہا جاتا

ہے۔ مگر ابھی حکیم صرف وہی شخص کہلاتا ہے جو صاحب تجربہ اور صاحب مشاہدہ ہو۔ جس کا نمونہ مسلمانوں میں کامل صوفی ملتے ہیں۔ جب کسی انسان کو سوچنے کے یہ دو طریقے میسر آجائیں اور ان کے خیالات میں دونوں طرف سے مطابقت پائی جائے وہ انسان حقیقت میں حکیم کے لفظ کا صحیح مصداق ہے۔

* غرض اب واضح ہو گیا کہ دنیا میں دو قسم کے حکیم ہیں (۱) ایک حکیم طبعیات کے اور (۲) دوسرے الہیات کے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ طبعیات کے حکیم ہر ایک چیز کو نیچے سے شروع کرتے ہیں اور اسے بتدریج ترقی دیتے ہوئے ایک حد کے بعد چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے آگے قیاسات ہیں۔ جیسے زمین گردش کر رہی ہے وغیرہ۔ اس کے خلاف الہیات کے حکیم کی فلاسفی اوپر سے نیچے آتی ہے وہ سب سے پہلے اس تمام کائنات عالم کو پیدا کرنے والی ایک ہستی مانتا ہے۔ اس کے بعد اس کے متصل نورانی ہستی ماننا شروع کر دیتا ہے اور درجہ بدرجہ مانتا چلا آتا ہے حتی کہ اس کثیف درجہ پر پہنچنے کے قابل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد نورانی جسم کی بحث شروع کرتے ہیں۔ پھر ظلماتی جسم کی اور یہاں آکر وہ طبعیات کے حکیم سے مل جاتا ہے۔ الہیات کے حکیم کی تعلیم انبیاء کی تعلیم کی طرف لے آتی ہے اور ان کے نصب العین (Ideal) کو اس قدر قریب کر دیتی ہے کہ انبیاء کی تعلیم بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔ مگر طبعیات کا حکیم اپنی تعلیم کو انبیاء کی تعلیم کے نزدیک نہیں لاسکتا۔ مثال کے طور پر ایک مادی قوت کو لیجیے۔ اس مادی قوت میں یہ ہوسکتا ہے کہ اس پر روحانی قوت سے نورانی اثر ڈالا جائے اور جو کام ایک عرصے کے بعد ہوتا ہے اسے تھوڑے عرصے میں کر دیا جائے مثلاً بچہ نو ماہ کے بعد ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ بچے کی روح پر روحانی قوت سے اثر ڈالا جائے اور وہ قبل از وقت پوری نشو و نما حاصل کرے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ مادی چیز (بچہ) موجود ہو۔ خواہ ماں کے پیٹ کے اندر ہی موجود ہو۔ سے روحانی قوت سے نشو و نما دی جاسکتی ہے۔

* رسول کریم ﷺ کی سیرت کا واقعہ ہے کہ آپ نے تھوڑے سے پانی سے بہت سے لوگوں کو سیراب کیا ہے اور پانی اپنی اصلی مقدار میں محفوظ رہا ہے۔ طبعیات کے حکیم

تسلیم کرتے ہیں کہ سمندر سے پانی کے بخارات اٹھتے ہیں وہ ہوا میں موجود رہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی روحانی قوت نے ہوا کی روح پر اثر کیا ہو اس واسطے پانی کے بخارات آپ کے ہاتھ کے ساتھ پانی میں شامل ہوتے رہے اور آپ نے اس طرح تھوڑے سے پانی کی مقدار سے لوگوں کو سیراب کیا۔ جب آپ نے پانی سے ہاتھ نکال لیا تو پانی کے بخارات کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

* اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس قدر عظیم الشان روحانی قوت تھی کہ آپ نور پر اپنا اثر ڈالتے اور پھر ہاتھ کو بغل میں ڈالتے آپ کی روحانی قوت نور کو اپنے ہاتھ میں لے آتی اور وہ نور سے پُر دکھائی دیتی۔ اسی طرح عصائے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ آپ کی روحانی قوت عصاء کی روح پر اپنا اثر ڈالتی اور جب اس کے بعد اسے زمین پر مارتے وہ سانپ بن جاتا۔

* اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک آدمی ہے اس نے فطری طور پر دعا کی اس کے دل میں فطری طور پر وہ قوت پیدا ہوتی ہے کہ اس کی دعا سے بارش ہونے لگتی ہے۔ یہ دعا ہے انبیاء کے نفوس قدسیہ کی۔ جب ان کے قلب میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے تو انکی دعا سے وہ تاثیر پیدا ہونے لگتی ہے جو بعض دفعہ موسیقی کے مقنن کے گانے سے پیدا ہوتی تھی کہ بارش ہو گئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ لیجئے ان کا تمام کلام دیکھئے آپ کو سب بھجن یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد کے ترانے دکھلائی دینگے۔ ہمیں علم نہیں ہے کہ انہوں نے علم موسیقی کو سیکھا۔ ممکن ہے کہ انہوں نے سیکھا ہو اور جانتے ہوں۔ مگر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انکے بھجن سے وہ حالت طاری ہوجاتی تھی جو اس فن کے مقنن سے پیدا ہوتی ہے۔" مولانا جامی رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ آپ ایک دفعہ اپنے دس بیس احباب کے ساتھ ترکستان سے جا رہے تھے ایسا اتفاق ہوا کہ آپ کو ایک رات برفانی پہاڑ پر گزارنی پڑی۔ جہاں آگ کا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا تھا۔ آپ اپنے احباب کے حلقے میں بیٹھے اور اپنی توجہ سے اس قدر گرمی پیدا کردی کہ تمام احباب گرمی کی تاثیر میں رہے اور صبح اٹھ کر چل دیے"۔

* سبعا شدادا کا مطلب ہے کہ وہ جسمانی طاقتوں سے زیادہ قوت کے مالک

ہیں۔ طبعیات کے طریقہ پر سوچنے والا حکیم سماویات میں خیال کے سوائے کوئی اور چیز نہیں پاتا۔ مگر الٰہی حکیم اپنے تجربہ کی بناء پر اجسام کو ٹھوس چیز مانتے ہیں۔ اور اس کے مقابلہ میں یہ جسمانیات (جس میں ہم رہتے ہیں) ٹھوس جسم کی سطحیں ہیں۔ غرض آیت۱۶ تک انسان کی ضرورت کے واسطے تمام چیزیں بتائیں تاکہ انسان بڑھے، پھلے پھولے۔

* (آیت۱۷) ان یوم الفصل کان اب جب زمین میں کاشت کریں تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ ایک دن فصل کا آئیگا جس دن غلہ اور بھوسا جدا جدا کردیے جائیں گے۔ (آیت۱۸تا۲۰) یوم ینفخ اس فصل کا تھوڑا سا خاکہ ہے اور آگے قیامت کا ذکر آجائیگا۔ (آیت۱۸) فتأتون افواجاً فصل کا دن شروع ہوگا اور انسان گروہ گروہ ہوکر وہاں آئیں گے۔ (آیت۱۹) و فتحت السماء اور دروازے (آسمان کے) کھول دیے جائیں گے اور ہر ایک آدمی اس میں سے گذر جائیگا۔ (آیت۲۰) و سیرت الجبال یہاں کی زندگی اب پوری ہوگئی تو اسکے بعد اس دنیا کے تمام سازوسامان درہم برہم ہوجائیں گے۔ (آیت۲۱تا۳۰) ان جھنم کانت اب انسان کے دو حصے کردیے جائیں گے۔ ایک غلہ اور دوسرا بھوسہ۔ بھوسے کی قسم کے لوگوں کا نام ہے طاغین یعنی حد سے گذرنے والے لوگ۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے یعنی ظالم لوگ۔ آیت۳۱تا۳۵) ان للمتقین مفازا. الایہ متقی لوگوں کا بیان ہے کہ یعنی عدالت اور احسان کرنے والے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تقوی کے معنی ان اللہ یأمرکم بالعدل ہیں۔ آیت۳۶ جزاءً من ربک یہ جزا جو دی گئی ہے یہ ایک حساب کے ماتحت ہے غرض ان کے کاموں کا جو بدلہ دیا جارہا ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ آیت۳۷ رب السموات والارض. الایہ اللہ تعالی کا ہر ایک حکم ماننا پڑیگا غرض اعمال کے نتائج لازمی ہیں ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ اب یہ تو حکمت کی بات ہے کہ جو اعمال کا نتیجہ ہوگا اس میں تبدیلی نہیں ہوگی مگر شرائع العلیہ میں بتلایا جاتا ہے کہ بعض لوگوں کی شفاعت ہوگی اور یہ اس قاعدہ سے ایک استثناء کی شکل میں پیدا کیا جاتا ہے۔ اور اس سے فقہاء اور حکماء میں خوب جھگڑے

شروع ہوجاتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ شفاعت بھی انسان کے بعض اعمال کا نتیجہ ہوگی۔ ہر شخص کے لیے شفاعت نہیں ہے۔ اس لیے حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں۔ بعض اعمال کا حساب اول ہوتا ہے کیونکہ وہ اول دفتر میں ثبت ہوتے ہیں اس کے بعد ایسے اعمال ہیں جو خصوصی دفتر میں محفوظ ہیں۔ ان کا حساب بعد میں ہوتا ہے تو اس دوسرے حساب سے پہلے حساب پر اثر پڑتا ہے۔ لوگوں کو کم فہمی کی وجہ سے یہ اختلاف دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ یہ اختلاف کی بنا ہی نہیں اعمال کی سزا ایک قاعدہ کے مطابق لازمی ہے اور اس میں کبھی تخفیف نہیں ہوتی یعنی سبب کے موجود ہونے سے مسبب پیدا نہ ہو اور علت سے معلول متولد نہ ہو۔ یہ ہے تخفف تو یہاں تو شفاعت بھی ان کے دوسرے اعمال کا نتیجہ ہے وہ اگرچہ ابتدا میں ظاہر نہ ہو۔ دوسری جلد تفسیر میں مسئلہ شفاعت کا بسط سے ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ النمل میں دیکھو۔

* آیت ۳۸ **یوم یقوم الروح** اب حکمت الٰہی میں جو قیامت کا سبب بتایا جاتا ہے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ انسانوں کی روحیں جس قدر بھی ہیں وہ ایک بڑی روح سے نکلی ہوئی ہیں۔ اور وہ بڑی روح ایک انسان کی شکل میں ہے۔ اس بڑی روح کی خدمت کرنے والوں کا نام ملائکہ ہے۔ آفتاب کی شعاع آفتاب سے نکل کر زمین کو روشن کرتی ہے اور اس کے بعد پھر آفتاب کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اسی طرح تمام جزوی (شخصی) روحوں کے واپس جانے کی کیفیت ہے۔ یہ روحیں اس بڑی روح سے نکل کر دنیا میں آتی ہیں اور اپنا کام کر کے پھر اس بڑی روح میں مل جاتی ہیں۔ فلسفۂ الٰہیات کا یہ مرکزی نقطہ ہے کہ تمام انسانی روحیں اور ملائکہ ایک معین ہستی کا ایک جزو بن جاتی ہیں۔ اور اس بڑی ہستی (روح اعظم) کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق پیدا ہوجاتا ہے۔ اس آئینہ میں وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھتے ہیں اور اسی پردہ سے ان کو اللہ تعالیٰ کی بات سنائی دیتی ہے۔ قیامت کے واقعے سے درحقیقت مدعا یہ ہے کہ انسانی روحیں وہاں تک پہنچ جائیں اور اس کے واسطے قیامت کا واقعہ ایک درمیانی حادثہ ہے۔ روحانی قوتوں کا اس مرکز سے انتشار (پھیلنا) خاص قواعد کے ماتحت مدت سے جاری ہے۔ پھر یہ جو روحانی قوت اپنے کام سے فارغ ہوتی ہے اسے اپنے مرکز میں واپس جانا ہوتا ہے۔

ان کی واپسی کے بھی خاص قواعد ہیں جن کے ذریعہ وہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بنتی جاتی ہیں۔ پھر یہ تمام جماعتیں ایک ہوجائیں گی اور اس روح اعظم سے ان کا اتصال ہوجائیگا۔ یہ روحانیت کا ایک دورہ ہے جسے اللہ تعالی کی شان کے مطابق ایک دن کھلنا چاہیے۔ اس تمام دورے میں اللہ تعالی کا ایک خاص قسم کا جلال، جمال اور کمال ظاہر ہوتا ہے۔ اس خصوصیت کے لحاظ سے اسے شان الہی کہا جاتا ہے۔ اور اس تمام زمانہ سے روحانیت کا پھیلاؤ شروع ہوا۔ اور جب تک کہ یہ تمام پھیلاؤ ظاہر نہ ہوجائے اسے شان الہی کے ایک دن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس جگہ ایک نازک مسئلہ ہے جس پر الہی حکماء ہمیشہ توجہ دلاتے چلے آتے ہیں۔ اس کی طرف اب توجہ دلانی منظور ہے۔ اس خاص دورے میں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں وہ خواہ بڑی ہوں خواہ چھوٹی اگر اس دورے کے تمام احکام کا خیال رکھا جائے تو اس موقع پر وہ اس سے بڑھ کر کوئی زیادہ اچھی چیز بن ہی نہیں سکتیں۔ مثلاً اس دورے کے کروڑوں حصوں میں ایک چھوٹی سی جماعت انسانوں کی پیدا کی گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس چھوٹی سی جماعت سے بڑھ کر کوئی اور بہتر جماعت اس موقع پر پیدا ہوسکتی تھی؟ حکماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ اس سے بہتر پیدا نہیں ہوسکتی تھی امام غزالی رحمہ اللہ تعالی انہی لوگوں میں سے ہیں۔ غرض اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر اس دورے کے تمام نظام کو مد نظر رکھ کر سوچا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ نہ تو اس سے بہتر انسان پیدا ہوسکتا تھا اور نہ اس سے کم درجہ کا انسان پیدا ہوسکتا تھا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس تمام دورے کے اثر سے یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور وہ علیحدہ علیحدہ کچھ چیز نہیں ہیں۔ اگر ان میں تبدیلی کی جائے تو اس کا اثر تمام نظام پر پڑتا ہے۔ اور تمام نظام کو بدلنا پڑتا ہے۔ اور کوئی عقلمند انسان اسے برداشت نہیں کرسکتا۔

* جب یہ جملہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت سے اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز پیدا نہیں ہوسکتی تھی تو علماء کا ایک ایسا طبقہ ہے جو کہ اس جملہ کو برداشت نہیں کرسکتا وہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ اس سے بہتر چیز پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ حالانکہ اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے۔ اور وہ اس سے بہتر چیز پیدا کرسکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ

ان علماء کی نظر اس دور کے نظام میں مقید نہیں ہے (یعنی نظام الٰہی کے مطابق جو کام ہو رہا ہے کہ تمام دنیا ایک سلسلہ میں منسلک ہے اس کے متعلق سوچتے ہی نہیں بلکہ وہ اس شان الٰہی پر نظر رکھتے ہیں جس کا یہ تمام کرشمہ ہے۔ یعنی انسانی پیدائش وغیرہ) اس لیے ان لوگوں کے فیصلہ میں تعارض نہیں ماننا چاہتی۔ بلکہ ہر ایک کی بات علیحدہ علیحدہ نقطۂ نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ کا احیاء العلوم میں ایک مشہور فقرہ ہے۔ لیس فی الامکان ابدع مما کان یعنی جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اس سے بہتر پیدا کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں یہ تو اس دور کے احکام کو ملحوظ رکھ کر کہا جاسکتا ہے۔ دوسری جماعت نے امام غزالی کی تردید میں تشنیع تک نوبت پہنچادی۔ انکا نقطۂ نظر اس خاص دور کے احکام نہیں بلکہ عموم قدرت الٰہی جس کا کرشمہ یہ تمام دور ہے۔ تو ہر ایک جماعت کا نقطۂ نظر علیحدہ علیحدہ ہوا۔ اسی طرح یہ جھگڑا ختم کیا جاسکتا ہے۔ جس نے اہل نظر کو پریشان کر رکھا ہے۔

* **یوم یقوم الروح و الملائکۃ صفا** وہ دن ہوگا جس دن بڑی روح اور اس کے خدمت گار ملائکہ ایک صف میں کھڑے ہوں گے۔ بعض روایتوں میں اس کی یہ تعبیر آئی ہے کہ اس کے بے حد سر اور منہ ہوتے ہیں اب انسانی روحیں جب روح اعظم کے پاس جاتی ہیں تو یہ اپنی تھوڑی تھوڑی سی مختلف ذہنیت لیکر جاتی ہیں اور یہی وہ سر اور منہ ہیں جنکے متعلق کہا گیا ہے کہ اس بڑی روح کے بہت سے سر اور منہ ہیں۔ اسی طرح روحیں اس روح اعظم سے نکل کر اور اپنا کام پورا کرکے پھر واپس اس سے جاملتی ہیں۔

* **لایتکلمون الا من اذن له الرحمن و قال صوابا** اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کشش ارادی نہیں ہے کہ انسان اپنے ارادہ سے حرکت کر رہا ہے۔ وہ طبعی کشش ہے کہ وہ اپنی شاخوں کو مرکز سے لپیٹتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی حقیقت نہیں ہے۔ روحوں کا اس روح اعظم میں پہنچ جانا یہ ہے قیامت۔ **ذالک الیوم الحق** روحوں کا اس روح اعظم تک پہنچ جانا در حقیقت قیامت ہی کا دن ہے۔ اس کے بعد جو زندگی ہوگی اس کے متعلق یہاں حساب نہیں ہوتا۔ پھر اللہ کے ساتھ انسان کا تعلق ہوگا اور اس کی تفصیل یہاں نہیں بتلائی جاسکتی۔ (آیت ۳۹ میں اس کی تفصیل دیکھو)

فمن شاء اتخذ الی ربه مابأ جب روح اعظم تک کوئی روح انسانی پہنچ جائے تو پھر اس کو اپنے رب کا راستہ صاف نظر آئیگا جس کا جی چاہے چلے یعنی انسان کا جب روح اکبر سے اتصال ہوگیا تو اس کے بعد انسان اللہ تعالی کے دیدار سے مشرف ہوتا ہے۔ تو اب جس کا جی چاہے اس طرف آئے۔ انا انذرناکم عذاباً قریباً عذاب نزدیک آنے والے سے تم کو ڈرایا۔ کیونکہ انسان کی موت کے بعد یہ دور شروع ہوجاتا ہے۔ اس واسطے اسے انسان کے نزدیک بتلایا گیا ہے۔ و یقول الکافر یالیتنی کنت ترابا کافر کہتا ہے کہ کاش میں انسان ہی نہ ہوتا بلکہ مٹی ہوتا۔ اس جگہ اس کے سامنے تمام حقیقت آرہی ہے اور کسی پر ذرہ بھر ظلم نہیں ہوتا۔

* دنیا میں انسانی نظام قائم کرنے کے لیے حکومت بنانا ضروری ہے اور ایک حقیقت جو مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے اس کی زبان اور ہوتی ہے اور وہی حقیقت اگر حکومت کی زبان سے سمجھائی جائے تو اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ بعض انسانوں کو حکومت کی زبان سے بات سننا ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حکومت کا لہجہ سخت ہوتا ہے انکو یہ باتیں ناگوار معلوم ہوتی ہیں مثلاً جب کہا جائے دیکھو اگر تم نے چوری کی تو تمہارا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ تو حکومت کی زبان و لہجہ سے تو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت کا اظہار تھا۔ مدرسہ میں وہی بات پڑھی تھی اس کو ناگوار معلوم نہ ہوئی اور حاکم سے سنی تو وہ ناگوار معلوم ہوئی۔ یعنی جب اس نے چوری کی تو حاکم نے حکم دیا کہ اسکا ہاتھ کاٹ دو۔ تو اب اس کو ناگوار معلوم ہوا کہ یہ سخت لہجہ میں تھا۔ حالانکہ حقیقت میں اس کے عمل کی حقیقت کا اظہار ہورہا ہے۔ جیسے ایک شخص نے زہر کھالیا اور اس کا لازمی نتیجہ ظاہر ہونے لگا تو اسکو اب نفرت آنے لگی ہے حالانکہ اب زہر کی حقیقت منکشف ہورہی ہے۔ جب وہ اعمال مخالف انسانیت کے کرتا رہا ہے تو اس کو ناگوار معلوم نہ ہوا۔ اور جب اسکے نتیجہ کا وقت آیا اور حاکم نے کہا کہ اس کی یہ سزا ہے اسکو جیل خانہ میں لے جاؤ تو اس کو اب ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ نتیجہ لازمی تھا۔ اب فقط حقیقت کا اظہار حاکم کی زبان سے ہوا ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتٌّ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ نازعات مکہ میں نازل ہوئی اس کی چھیالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ☆

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ﴿۳﴾

قسم ہے گھسیٹ لانے والوں کی غوطہ لگا کر اور بند چھڑا دینے والوں کی کھول کر اور پیرنے والوں کی تیزی سے

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ﴿۴﴾ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴿۵﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ﴿۶﴾

پھر آگے بڑھنے والوں کی دوڑ کر پھر کام بنانے والوں کی حکم سے جس دن کانپے کانپنے والی

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ﴿۷﴾ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ﴿۸﴾ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ﴿۹﴾

اس کے پیچھے آئے دوسری کتنے دل اس دن دھڑکتے ہیں ان کی آنکھیں جھک رہی ہیں

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا كُنَّا

لوگ کہتے ہیں کیا ہم پھر آئیں گے الٹے پاؤں کیا جب ہم ہو چکیں

عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿۱۱﴾ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا

ہڈیاں کھوکھری بولے تو تو یہ پھر آنا ہے ٹوٹے کا والا سو وہ تو

هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾ هَلْ اَتٰىكَ

صرف ایک جھڑکی ہے پھر تبھی وہ آ رہیں میدان میں کیا پہنچی ہے تجھ کو

حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾

بات موسیٰ کی جب پکارا اس کو اس کے رب نے پاک میدان میں جس کا نام طویٰ ہے

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾

جا فرعون کے پاس اس نے سر اٹھایا پھر کہہ تیرا جی چاہتا ہے کہ تو سنور جائے

وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾

اور راہ بتلاؤں تجھ کو تیرے رب کی طرف پھر تجھ کو ڈر ہو پھر دکھلائی اس کو وہ بڑی نشانی

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾

پھر جھٹلایا اس نے اور نہ مانا پھر چلا پیچھے کو تلاش کرتا ہوا پھر سب کو جمع کیا پھر پکارا

فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ

تو کہا میں ہوں رب تمہارا سب سے اوپر ف پھر پکڑا اس کو اللہ نے سزا میں آخرت کی

وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾ ءَاَنْتُمْ

اور دنیا کی ف بیشک اس میں سوچنے کی جگہ ہے جس کے دل میں ڈر ہے ف کیا تمہارا

اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾

بنانا مشکل ہے یا آسمان کا ف اس نے اس کو بنایا اونچا کیا اس کا ابھار پھر اس کو برابر کیا

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ

اور اندھیری کی رات اس کی اور کھول نکالی اس کی دھوپ ف اور زمین کو اس کے پیچھے

دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾

صاف بچھا دیا ف باہر نکالا زمین سے اس کا پانی اور چارا ف اور پہاڑوں کو قائم کر دیا ف

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾

کام چلانے کو تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے ف پھر جب آئے وہ بڑا ہنگامہ

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ

جس دن کہ یاد کرے گا آدمی جو اس نے کمایا اور نکال ظاہر کریں دوزخ کو جو چاہے

يَّرٰى ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ

دیکھے ف سو جس نے کی ہو شرارت اور بہتر سمجھا ہو دنیا کا جینا ف سو دوزخ ہی ہے

هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ

اس کا ٹھکانا اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اس نے جی کو

الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ

خواہش سے سو بہشت ہی ہے اس کا ٹھکانا ف تجھ سے پوچھتے ہیں وہ گھڑی

اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿۴۲﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾

کب ہوگا قیام اس کا ف تجھ کو کیا کام اس کے ذکر سے تیرے رب کی طرف ہے پہنچ اس کی ف

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿۴۵﴾ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا

تو تو ڈر سنانے کے واسطے ہے اس کو جو اس سے ڈرتا ہے ف ایسا لگے گا جس دن دیکھیں گے اس کو کہ نہیں ٹھہرے تھے دنیا میں

اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾

مگر ایک شام یا صبح اس کی ف

سورۃ النازعات مکیہ

* پچھلی سورت کی آیت ۳۸ میں روح اعظم کا ذکر کیا گیا ہے اس روح اعظم کے واسطے سے قدرت الہی مختلف نظام پیدا کرتی ہے اور پھر ان کو اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ اس قسم کے نظام میں چھوٹے بڑے واقعات تقسیم ہوتے ہیں اگر ایک چھوٹا سا واقعہ سمجھادیا جائے تو اس سے بڑے واقعہ کا سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ اب اس سورت میں قیامت کا مسئلہ اس طرح پر حل کیا جائے گا اس لیے اسے آیت ۱۵ سے شروع کیا جاتا ہے۔ (آیات ۱ تا ۱۴ کو، بعد آیت ۴۲ دیکھو)

* آیت ۱۵ **هل اتاک حدیث موسی الایہ** مصر میں ایک بادشاہ ہے اور وہ اپنی رعیت پر ایک خاص طرح پر ظلم کرتا ہے یہ ظلم طبعی قواعد یعنی قانون کے اندر پیدا ہوتا ہے مادی استعداد ایسی پیدا ہوتی جاتی ہے کہ زمین پر ایک ظالمانہ نقشہ اور نمونہ بن جاتا ہے اب رحمت الہی کی شان اس ظلم میں تبدیل کرکے اسے درست کرنا چاہتی ہے تو اس میں ایک جذب کی قوت پیدا کی جائیگی۔ اگر یہ اس جذبہ میں ٹھیک چیز بن گئی تو دنیا میں رہ سکے گی ورنہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اس واقعہ کا آیت ۱۵ سے لے کر آیت ۲۶ میں ذکر کیا گیا ہے۔ آیت ۱۸ و ۱۹ **فقل هل لک الی ان تزکی** کیا تجھے شوق ہے کہ تو پاک ہوجائے یعنی تمہاری تمام بداخلاقیاں دور ہوجائیں اور تو ایک مقدس آدمی بن جائے تو میری طرف التفات کرے تجھے اس بات کا علم دوں گا اور تو اس کو سمجھنے لگ جائے اور پھر اللہ تعالی سے ڈرنے لگ جائے اور اللہ تعالی کی طرف بڑھنے لگ جائے۔

* آیت ۲۲ **ثم ادبر یسعی** اس نے موسی (عبداللہ) کے مخالف کوشش کرنی شروع کردی۔ آیت ۲۴ **فقال انا ربکم الاعلی** سیدنا موسی (عبداللہ) دعوت دیتے ہیں کہ تم ایک بڑے حاکم (اللہ عز اسمہ) کی اطاعت کرو اور اس کے احکام کی پیروی کرو مگر فرعون کہتا ہے کہ سیدنا موسی (عبداللہ) جھوٹے ہیں تم کو میری اطاعت

کرنی چاہیے کیونکہ میں تمہارا بڑا حاکم ہوں اور میرے سوا یہاں کوئی حاکم نہیں۔ میں نے جو سلطنت کے احکام بنائے ہیں اس کی تابعداری کرنی تم پر واجب ہے۔ یہاں نفی حکومت کی کر رہا ہے یعنی دوسرے کی حکومت نہیں ہے۔ آیت ۲۵ **فاخذه الله نكال الاخرة و الاولى** دونوں گناہوں کے عوض اللہ تعالی نے اس کو خوب پکڑا۔ ایک گناہ وہ تھے جو اس نے موسی علیہ السلام کے آنے سے قبل کیے تھے اور ایک گناہ وہ تھے جو موسی علیہ السلام کے آنے کے بعد کیے تھے۔ ان کی سزا میں فرعون کو پکڑا اور اس کے نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ آیت ۲۶ **ان فی ذلک لعبرة لمن یخشی** جو عواقب سے ڈرتے ہیں ان کے لیے عبرت اور یاددہانی ہے اور کافی نصیحت ہے۔ جو لوگ عالم ہیں انہیں ان واقعات کے نتائج سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ان کے لیے ان آیات میں بہت سے عبرت آمیز واقعات ہیں۔ وہ اس طرح قیاس کرسکتے ہیں کہ اس طرح کا ظلم دنیا میں کبھی چھپایا نہیں جاسکتا۔ اس واسطے اللہ تعالی کی طرف سے پہلے اسے اصلاح کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ نظام کی نوعیت ایک ہی ہے کہ جیسے فرعون کو غرق کردیا گیا اسی طرح وہ دنیا کو غرق کرسکتا ہے۔ آیت ۲۷ تا ۳۳ **ءانتم اشد خلقا ام السماء بناها** انسانیت اور اس عالم کا جو آپس میں ربط ہے ان آیات میں اسکا ذکر کیا گیا ہے کہ دیکھو آسمان بنایا اور اسے بلند کیا۔ دن اور رات بنائے اور چراگاہ وغیرہ بنائے۔ آیت ۳۳ **متاعا لكم و لانعامكم** یہ تمام سامان تمہارے اور تمہارے چوپایوں کی روزی کا ذریعہ ہیں یہ چیزیں اسی طریقہ سے بنائے گئے ہیں کہ تم ان سے فائدہ اٹھاسکتے ہو۔

* آیت ۳۴ **فاذا جاءت الطامة الكبرى** کوئی چیز دنیا میں جو اللہ تعالی نے پیدا کی ہے جب تک یہ نظام قائم ہے اس کو فنا نہیں کرتا۔ محض صورت کی تبدیلی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص مالدار تھا اور اس کے بیٹے جو نالائق تھے انہوں نے تمام جائداد تباہ کرڈالی۔ تو وہ تمام دولت فنا نہیں ہوئی مگر وہ قوم میں تقسیم ہوگئی۔ جو چیز ایک شخص کے ہاتھ میں تھی وہ تقسیم ہوکر قوم کے حصہ رسدی میں آگئی ہے اسی طرح جب کہا جاتا ہے کہ فلاں قوم تباہ و برباد ہوگئی اور اسکی قوت زائل ہوگئی تو اس

کے معنی بھی وہی ہوتے ہیں۔ یعنی جو قوت اور طاقت اور ذہنیت اور لیاقت ان کے اعلیٰ طبقہ میں تھی۔ ان سے نکل کر ادنیٰ طبقہ میں آگئی یعنی اعلیٰ اور اوسط طبقہ جس قوت کا مالک تھا ان کی نالائقی کے باعث ان سے نکل کر وہ ادنیٰ طبقہ میں آجاتی ہے۔ پہلے وہ قوت اور طاقت اور اعلیٰ طبقہ میں تھی جو بہت نمایاں تھی اب نچلے طبقہ میں جا کر بیٹھ گئی ہے یعنی تہ نشین ہو گئی ہے۔ اس لیے وہ قوت اور طاقت نظر نہیں آتی مگر موجود ویسی ہی ہے۔ اس کی حقیقت وہ لوگ جانتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ مردہ اقوام کے زندہ کرنے کو پیدا کرتا ہے۔ ان کو آج کل کی اصطلاح میں انقلابی جماعت کہتے ہیں۔ وہ کایا پلٹ دیتے ہیں۔ اور اعلیٰ ذہنیت اور قوم اور طاقت جو ادنیٰ طبقہ میں جا کر تہ نشین ہو گئی تھی اسکو منصۂ شہود پر لاتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام سب کے سب انقلابی ہوتے ہیں۔ ان کا مطمح نظر ادنیٰ طبقہ ہوتا ہے۔ بعد ازاں اوسط طبقہ، مگر جو اعلیٰ طبقہ یعنی سرمایہ دار ہے اس طبقہ سے یہ قوت زائل ہو کر رہ گئی۔ انبیاء کا روئے سخن ان کی طرف نہیں ہوتا۔ ان کے لیے فقط انذار ہوتا ہے۔ ادنیٰ طبقہ میں اعلیٰ ذہنیت اور قوت موجود ہوتی ہے کیونکہ ان کو سوچنے کی عادت ہوتی ہے اور سوچنے کے باعث ان میں ذہنیت اچھی پیدا ہو جاتی ہے۔ تو اب ایک نبی کا یہی کام ہوتا ہے کہ اس طاقت کو جو نچلے طبقے میں آ کر تہ نشین ہو چکی ہے اس کو ظاہر کر دے۔ اور اس میں اسکو بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور بڑا زور لگانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد جتنی رکاوٹیں پیش آئیں ان کو دور کر دے۔ اسکے بعد جس طرح سمندر میں تیرا کرتے ہیں وہ طبقہ اسی طرح ترقی کے میدان میں تیرنا شروع کر دیتا ہے اور اسی باعث وہ سب سے آگے بڑھ جاتا ہے اور سبقت لے جاتا ہے۔ اور اسی سبب وہ مالک تدبیرات ہو جاتا ہے۔ مثلاً قریش کا اعلیٰ طبقہ کہ اس سے طاقت، قوت اور اعلیٰ ذہنیت نکل کر ادنیٰ طبقہ میں آگئی تھی۔ آنحضرت ﷺ اس ادنیٰ طبقہ کو کھینچ کر اوپر لانا چاہتے ہیں۔ اعلیٰ طبقہ قریش کا جو مکہ میں اقتدار رکھتا تھا وہ کہتا ہے کہ ہم آپ کو ایسا کرنے نہیں دیتے۔ یہ ہمارا ملک ہے اس میں ہماری تدبیرات چلتی رہیں گی۔ دوسری تعلیم و تربیت ہم نہیں دینے دیتے تو یہ خدائی دعویٰ ہے جیسے فرعون نے خدائی دعویٰ کیا تھا۔ تو اس صورت میں کہا جاتا ہے کہ تم کو فرعون کے غرق ہونے سے عبرت حاصل کرنی

چاہیے۔ اور یہ کہ تم آسمان اور زمین سے زیادہ سخت چیز نہیں ہو۔ آسمان اور زمین بھی ہماری مرضی اور تدبیر سے چل رہے ہیں۔ ان میں روزانہ انقلاب آتا ہے اس سے عبرت لو۔ اسی طرح قیامت آنے سے قبل بھی انسان اور حیوان کی استعدادات ختم ہوجائیں گی۔ تو اس وقت بھی وہ استعدادات مکنون ہوجائیں گی اس لیے انقلاب کیا جائے گا۔ پھر تمام مخفیہ ظاہر ہونے لگ جائیں گے تو دنیاوی انقلاب سے استدلال ہے قیامت کے انقلاب پر کہ یہ انقلاب جو تمہارے شہر مکہ میں ہورہا ہے اس پر غور کرو تو نقشہ قیامت تمہارے پیش آجائے گا۔ انقلاب میں ایک قیامت برپا ہوتی ہے بہت سے لوگ مارے جاتے ہیں۔ اور تمام قوم پر (جب قوم میں انقلاب ہو) بربادی، افلاس اور دہشت چھا جاتی ہے۔ جب انقلاب درجۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو پھر تعمیر شروع ہوتی ہے۔ اور ہر طرح کی آسودگی ادنی طبقہ کو حاصل ہوتی ہے۔ مظلوم طبقہ جو امیروں کے ظلم کا تختۂ مشق بنا ہوا تھا وہ پھر برسرِ اقتدار آجاتا ہے۔ اور وہی مالک تدبیرات و سلطنت ہوجاتا ہے۔ (اب آیات کا ترجمہ شروع کرتے ہیں)

* آیت ۱ والنازعات غرقاً وہ جماعت گواہ ہے جو استعداد کاملہ کو جو تہ نشین ہوگئی تھی اور ادنی طبقہ میں بیٹھ گئی تھی غوطہ لگا کر اس کو کھینچ کر باہر لاتے ہیں۔ آیت ۲ و الناشطات نشطاً راہ ترقی میں جو رکاوٹیں تھیں ان کو وہ جماعت دور کرتی ہے یعنی جو آدمی کی ترقی کے لیے سدِ راہ ہیں ان کو بھی راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ (یہ دو درجے انقلاب میں تخریب کے ہیں) آیت ۳ والسابحات سبحاً تو پھر وہ جماعت آسانی سے چلنا شروع کردیتی ہے اور ترقی کے سمندر پر تیرنا شروع کردیتی ہے۔ آیت ۴ و السابقات سبقاً تو پھر یہ جماعت سب سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ فالمدبرات امراً پھر تو یہ جماعت مدبرات امر بن جاتی ہے اور امر و حکم کی تدبیر کرنے والی یہی ہوتی ہے اللہ تعالی کے امر کے مطابق کام کرتی ہے۔ یہ تین درجے تعمیر کے بنے۔ عام مفسرین جو انبیاء کی حقیقت کو نہیں جانتے ان کو ایسی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ حالانکہ انبیاء انقلابی ہوتے ہیں اور اس انقلاب سے لوگوں کو ڈراتے ہیں۔

* یہ سب جماعتیں گواہ ہیں کہ بڑا انقلاب قیامت والا ہونے والا ہے اور جواب قسم ہے یوم ترجف الراجفہ یعنی ضرور قیامت ہونے والی ہے۔ یہ محذوف ہے۔ ان فی ذلک لعبرۃ لمن یخشی یعنی وہ لوگ جن کو اپنے کام کی بربادی کا ڈر لگا رہتا ہے وہ ان سے نصیحت لیتے ہیں فرعون جیسا مستبد حاکم انقلاب کو نہ روک سکا تو پھر قریش کی کیا طاقت ہے کہ انقلاب کو روکے۔ یوم ترجف الراجفہ یعنی ایک جھٹکے سے زیر و زبر ہوجائیں گے اور تباہی پھیل جائے گی۔ ءانتم اشد خلقا اس میں روزانہ انقلاب ہورہے ہیں جس سے یہ لوگ اور ان کے چارپایہ مستفید ہورہے ہیں یہ عبرت پذیر نہیں ہوتے یہ زمین و آسمان انقلاب ہی انقلاب ہے۔ تو ایک فرعون کی مثال اور دوسری زمین و آسمان کی مثال دے کر ان کو سمجھایا گیا کہ جو اصلح للبقاء ہے وہ قائم رہتی ہے اور دوسری چیزیں انقلاب کے وقت تباہ و برباد ہوجاتی ہیں۔ اور پھر نئے سرے سے اور طرح کی تعمیر کی جاتی ہے۔ جس سے مظلوم طبقہ مستفید ہوسکے۔ اور انقلاب کا بڑا سبب ظلم ہوتا ہے جس سے مخفی قوت ظاہر ہوجاتی ہے اور ظالم لوگ عوام کی طاقت کو دباتے ہیں اور وہ طاقت دبتے دبتے جب ایک جگہ اکٹھی ہوجاتی ہے تو ایک دم اوپر کو پھٹ کر نکل پڑتی ہے جیسے پانی اور گھاس جو زمین سے باہر نکل پڑتے ہیں۔ اب چونکہ اس مخفی قوت کو تربیت دینے کے لیے آنحضرت ﷺ تشریف لائے ہیں اس لیے وہ قوت ظاہر ہو کر رہی۔ اس انقلاب سے تم کو بھی فائدہ ہوگا اور تمہارے خدام جو جانوروں کی طرح تھے ان کو بھی فائدہ ہوگا۔ فقط ظالم طبقہ برباد ہوجائے گا جو سرمایہ داری کے باعث نعرہ انا ربکم الاعلی فرعون کی طرح مار رہا ہے۔

* یہ سورت مضمون قیامت سمجھانے کے لیے اتری ہے تاکہ الٰہی حکماء اس سے قیامت کے مضمون کو سمجھ جائیں۔ یہ بات الٰہی حکماء کے یہاں ثابت ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنی صورت بدلتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دو نام یعنی صفات یہ بھی ہیں کہ وہ الباطن بھی ہے اور الظاہر بھی الٰہی حکماء اس کو باطن الوجود اور ظاہر الوجود سے تعبیر کرتے ہیں۔ جتنی روحانی صورتیں ہیں وہ باطن الوجود ہیں۔ اور جتنی مادی اشیاء ہیں وہ ظاہر الوجود کے ٹکڑے ہیں۔ روحیں اور صورتیں باطن الوجود کے ٹکڑے ہیں تو جب

مادے میں استعداد پیدا ہوجاتی ہے تب اس کے موافق باطن الوجود سے ایک ٹکڑا نازل ہوجاتا ہے اور ان کو آپس میں ربط دینے والی صفت کا نام اگر وہ جبروتی رکھتے ہیں تو مادہ چونکہ ظاہر الوجود سے آیا تھا اور ظاہر الوجود بھی صفات قدیم سے ہے اور باطن الوجود سے روحیں اور صورتوں کے ٹکڑے آتے رہتے ہیں اس لیے وہ بھی قدیم ہے اس سے اوپر وجود ہے۔ چنانچہ یہ تو دونوں جب قدیم ہوئے تو فنا نہیں ہوتے۔ مادہ ایک مدت تک کام کرتا رہتا ہے پھر اسکی استعداد نیچے چلی جاتی ہے۔ جیسے زمین پر آبادی ہوتے ہوتے زمین کی قوت نیچے ہوجاتی ہے اور ہل جوت کر اس کو اوپر لایا جاتا ہے پس دونوں جب قدیم ہوئے تو فنا کے قابل نہیں رہے۔ حدوث کا مطلب فقط اتنا ہے کہ جب ایک ٹکڑا ظاہر الوجود کا ہمیں نظر آنے لگا اور اس کی استعداد کے موافق باطن الوجود سے ایک ٹکڑا اس سے مل گیا تب ایک نئی چیز ظاہر ہوئی۔ بہت مدت تک مستعمل ہوتے ہوتے مادے کی استعداد نیچے کی جانب ہوجاتی ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ زمین کی قوت آبادی بڑھنے کی وجہ سے نیچے دب جاتی ہے اور اس کو باہر لانے کے لیے انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مادے کی طاقتیں جب نیچے کی جانب منتقل ہوجاتی ہیں تو ان کو دوبارہ اوپر لانے کے لیے (و النازعات غرقا) بڑی طاقت سے غوطہ لگا کر باہر کھینچ کر لانے والی جماعت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ طاقتیں جن سے استعداد نیچے چلی جاتی ہے ان کو دور کردیا جاتا ہے۔ (و الناشطات نشطا) ان کی تمام گرہیں کھول دی جائیں گی اور تمام رکاوٹوں کو دور کردیا جائے گا۔ تو (و السابحات سبحا) وہ تیرنے لگ جائیں گی اور وہ آگے ترقی کرنے اور سب سے آگے جا کر کام کرنے والی طاقتیں ہوں گی۔ (فالمدبرات امر) حکم الٰہی سے تدبیر کرنے والی ہوں گی۔ حکم اور امر کے مطابق تدبیر کرتے ہیں۔ جواب قسم ہے یوم ترجف الراجفه تو قیامت میں بھی واقعہ ہوگا کہ استعدادات جو نیچے چلی گئی تھیں ان کو اوپر لانے کے لیے جھٹکے آئیں گے اور بہت جھٹکے آئیں گے تب جا کر وہ استعداد ظاہر ہوگی۔ تو جب تمام قوت اور استعداد اور ہر چیز کا منہ ان جھٹکوں سے باہر نکل آئیگا تب اس سے قلوب یومئذ واجفه اس وقت تمام چیزیں نظر آنے لگ

جائیں گی۔

* الٰہی حکیم اس بات کو مانتا ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی اور نہ ضائع ہوتی ہے تو جب استعداد مخفی ہو جائیں گی ان کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ باطن الوجود کو ظاہر الوجود سے ربط دینے کا نام ہے ربط الحادث بالقدیم اور یہ مشکل مسئلہ ہے اس کے حل کرنے والے فقط حکماء الٰہی ہیں۔ اس کو شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب "عبقات" میں وحدت وجود کے اثبات سے ثابت کیا ہے اور مولانا مولوی محمد قاسم رحمہ اللہ نے جو ہندوستان کے ایک مجدد اعظم ہیں اس مسئلہ کو اپنی کتاب "تقریر دلپذیر" میں واضح کیا ہے۔ تو قیامت کا واقعہ فقط اس استعداد کو ظاہر کرتا ہے جو تہ نشین ہو گئی تھی اور وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

* اللہ تعالیٰ کے چار اوصاف بالترتیب مانے جاتے ہیں۔ (۱) ابداع (۲) خلق (۳) تدبیر (۴) تدلی یعنی تجلی۔ بغیر مادہ کے عالم امر سے یعنی حکم سے ایک چیز پیدا ہو گئی جس کو صوفیاء کرام شخص اکبر کہتے ہیں اور چونکہ ابداع کے تجلی کے خدام اور روحانیات کو اس شخص اکبر کی ترقی کے لیے اور اسکو ظاہر کرنے کے لیے بہت بڑی مشقت کرنی پڑے گی اس لیے اس کو و النازعات غرقا کہا گیا۔ ابداع والی تجلی کے رموز و نکات اور قوائے کامنہ کو حالت بُروز میں لانے والے ملائکہ اور روحانیت کو والنازعات غرقا (اور جب ان کے قوائے کامنہ بارز ہو گئے) تو صفت خلق پیدا ہو گئی۔ ایک چیز سے دوسری چیز ہونے کا نام خلق ہے اور خلق کی صفت کے خدام کو و الناشطات نشطا یعنی قوائے کامنہ شخص اکبر کے جب بارز ہو گئے تو آگے سرحد خلق آجاتی ہے۔ وہاں اس سے کم مشقت ہوتی ہے تو ان ملائکہ کو والناشطات سے تعبیر کیا ہے اور بحر خلق اپنی موجوں سے نمودار ہو گیا اور یہ وہ صفت ہے جس کو ماء سے تعبیر کیا ہے (و کان عرشه علی الماء) تو وہ خدام اس صفت مذکور میں تیرنے اور شناوری کرنے لگے یعنی اس بات کو انواع اور اقسام کی صورت دینے والے فرشتوں اور خدام سے اور روحانیات کو والسابحات سبحا سے تعبیر کیا گیا تاکہ اس دنیا میں تیریں اور صدفِ انواع پیدا ہوں جیسے آسمان اور زمین اور اقسام عنصریات اور روحانیات اور عالم

مثال پیدا ہوجائے۔ پھر جب عالم کے انواع، علویات اور سفلیات کے انواع بن گئے اور اس میں مشقت کم ہے تو اس درجہ کو والسابحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور جب یہ مدارج نمودار ہوگئے تو آگے ان کو درجۂ تکمیل تک پہنچانا نہایت آسان ہے۔ یہ جماعت نہایت تیزی سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے دوڑتی ہے۔ تاکہ اس کے جو کام سپرد ہے وہ جلد سرانجام ہوجائے تو اس درجہ کو کہا گیا ہے والسابقات سبقاً پھر جب ہر ایک چیز اور انواع اور ان کے افراد اپنے تقاضے کے موافق بڑھنا شروع ہوگئے تو مزاحمت ایک دوسرے سے ہوجائے گی۔ مثلاً ایک درخت اتنے تخم دے گا کہ ساری زمین اس سے بھر جائے اور دوسرے قسم کے درخت کے لیے جگہ نہ رہے تو اب اس مزاحمت اور تخاصمت کو دور کرنے کے لیے مدبرات امر پیدا فرمائے تاکہ اصلح للبقا کو قائم رکھیں۔ اسی طرح تنازع للبقا میں تدبیر کی صفت کو آگے بڑھایا۔ جب تدبیر مکمل ہوگئی تو تدلی یعنی تجلی کا دور آئے گا اور اس کی بڑے اعلیٰ درجہ کی مثال یوم القیامت ہے۔

* آیت ۳۴ فاذا جاءت الطامة الكبرى جب ایسا وقت آجائے کہ تم کو ان (آیت ۲۷ تا ۳۲) کے سامان سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش باقی نہ رہے مثلاً تمہارے یہاں ایک ظالمانہ نظام غالب آجائے تو تمہیں اس پہلے قاعدہ کے مطابق ہلاک کر دینا چاہیئے۔ (آیت ۲۶) تم اس قدر بڑی ہستی نہیں ہو کہ تمہیں ہلاک نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح تم نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق ہوتے دیکھا اسی طرح جب اس سامان سے تمہارے نفع حاصل کرنے کا طریقہ ختم ہوجائے گا تو اس نظام کو بھی یونہی (موجودہ صورت میں) نہیں رکھا جائے گا بلکہ اسے توڑ پھوڑ کر اور طریقہ سے چلایا جائے گا۔ جب یہ تمام نظام توڑ دیا جائے گا (اسے طامة الکبری کہا گیا ہے دیکھو آیت ۱۴ فقرہ ۴۔ آیت ۲۷ میں کہا گیا تھا کہ تم کو برباد نہیں کیا جاسکتا یا آسمان برباد نہیں کیا جاسکتا؟) تو دونوں باتیں ہوسکتی ہیں۔ تمہاری بربادی تمہارے ظلم کے باعث ہوگی۔ جب زمین پر انسان اور حیوان نہ رہے تو اس نظام کو ایسے طریقہ پر چلایا جائے گا کہ اس سے فائدہ اٹھایا جاسکے اس لیے کہ یہ نظام انسان اور حیوان کے واسطے بنایا گیا تھا۔ اب جب دونوں

نہ رہے تو اب اس نظام کو بدلنا ضروری ہے تاکہ اسے اس طرح سے چلایا جاسکے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی بلکہ اس کی فقط صورت تبدیل ہوتی ہے۔ آیت ۳۵ یوم یتذکر الانسان اب جب یہ نظام بدل جائے گا تو انسان کی کیا کیفیت ہوگی؟ روح اعظم کی ایک ایسی شان ظاہر ہوگی جس سے انسان کی تمام کوششیں اس کے سامنے آجائیں گی اس لیے کہ روح اعظم میں انسان کی تمام کوششیں محفوظ ہوتی چلی آئی ہیں۔ آیت ۳۶ و برزت الجحیم ان کوششوں کے نتیجے کے دو راستے ہیں دوزخ اور بہشت (آرام کی جگہ) یہ دونوں سامنے آجائیں گے۔ (اس جگہ صرف جیل خانے کا ذکر ہے سمجھنا چاہیے کہ یہ راستہ بھی سامنے آجائے گا یعنی جیل خانے کو دیکھنے والوں کے لیے یعنی اس کی سیر کرنے والوں کے لیے جہنم ظاہر ہوجائے گا اور وہ اس میں چلے جائیں گے) آیت ۳۷و۳۸ و من طغی و آثر الحیاۃ الدنیا وہ آدمی جو اس قریب کی زندگی میں مستغرق ہوگیا۔ اور انجام سے بے خبر ہوگیا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ آیت ۱۷ میں فرعون پر جرم تھا کہ وہ طاغی ہوگیا اس واسطے اسے سزا دی گئی اور اسے برباد کیا گیا بعینہ اب اس جگہ بھی یہی کیفیت بیان کی جارہی ہے کہ جو (آیت ۳۷) اسی طرح (فرعون کے مانند) طاغی ہوگیا اس کے لیے بھی بربادی کی سزا ہے۔ آیت ۴۰ و اما من خاف مقام ربہ اب جو شخص انجام کو سامنے رکھتا ہے اور خواہشوں کے پیچھے نہیں رہتا بلکہ اپنی عقل سے کام لیتا ہے (آیت ۴۱ فان الجنۃ ھی الماوی) اس کے واسطے جنت ہے۔

* (۱) قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی عقل کے مطابق جتنا صحیح راستہ سمجھ سکا ہے اور اس پر چلتا بھی ہے تو اسکا ٹھکانا جنت ہے اور جو عقلی تقاضے کو چھوڑ کر شہوتوں کے پیچھے پڑ گیا وہ جہنم میں جائے گا۔ انبیاء کی تعلیم عقلمندوں کے واسطے ایسی ہے جیسے وہ کاشتکار جو کنویں سے کھیت کو سیراب کر رہا ہے۔ اور اس پر بارش ہوجائے تو وہ اس کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھے گا غرض جس طرح کسان کے واسطے بارش ایک زائد رحمت ہے اسی طرح انسان پر بھی انبیاء کی تعلیم زائد رحمت ہے۔

* (۲) انبیاء کی تابعداری کا دعویٰ کرنے والوں (جاہل علماء) کی ایک جماعت نے

عقلمندوں سے لڑائی خرید رکھی ہے اور عقلمندوں کا چھوٹا طبقہ ان کی بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے ان دونوں کا جھگڑا ختم ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس قسم کے لوگوں کو سامنے رکھ کر کبھی قرآن مجید کی آیات کو حل نہیں کرنا چاہتے۔ غرض مطلب یہ ہے کہ صحیح عقل اور انبیاء کے طریقے میں کبھی معارضہ نہیں ہوسکتا اور انبیاء کے طریقے کو صحیح سمجھنے والا کبھی عقلمندوں سے نہیں لڑتا۔

* (۳) عربی زبان میں ہویٰ کا لفظ اس چیز (جذبہ) کے لیے بولا جاتا ہے جو چیز (جذبہ) انسان کی طبعیت میں پیدا ہو اور عقل کے خلاف ہو۔ اس آیت میں صاف طور پر عقل کی تابعداری کا ذکر نہیں آیا۔ مگر عربی جاننے والا آدمی اس کا بھی مطلب سمجھ سکتا ہے کہ صحیح فطرت عقل کے تابع ہونا چاہتی ہے عقل اور انبیاء کے طریقہ کو آپس میں لڑا دینا یہ بے عقلوں کے طریقہ کا کام ہے۔ یعنی انبیاء کا طریقہ ہمیشہ صحیح فطری اور عقل پر ہوتا ہے۔

* (۴) عقلمندوں میں بعض ایسی جماعتیں پیدا ہوگئیں کہ وہ خود تو عقل نہیں رکھتیں مگر عقلمندوں کی باتیں ان کو یاد ہیں۔ اور خود ان میں عقل نہیں ہے۔ یہ عقل مند کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ عقلمند وہ ہے جس کو فطرۃً عقل ملی ہو اور وہ فطرت کو سمجھے اور اس پر چلے۔ ایسے عقلمند جن میں خود تو عقل نہیں مگر انبیاء کے طریقے کی جھوٹی سچی تابعداری کا دعوی رکھتے ہیں تو یہ بھی عقلمند نہیں ہیں۔ فطری عقل تھوڑی یا زیادہ جو اپنے اندازے پر رہے اس جگہ وہ مراد ہے (اور یہ ایک زائد مسئلہ ہے عقل اور شرع کا مقابلہ جو ضمناً آگیا ہے)

* (۵) اصل مسئلہ ہے قیامت کا۔ اسکا خلاصہ یہ نکلا کہ اگر تمام انسانوں میں ایسی حالت پیدا ہوجائے کہ انسانیت میں وہ استعداد نہ رہے اور تمام انسانوں میں قابل تبدیل حالت پیدا ہوجائے تو اس نظام میں بھی تبدیلی ضروری ہوگی اور اسی تبدیلی کا نام قیامت ہے۔ انسان کی تبدیلی کی وجہ سے یہ موجودہ نظام (زمین و آسمان کا) بدلنا پڑے گا۔ اس کو وہ باریک بین حکیم بہت جلد مان سکتا ہے جو انسانی پیدائش کو ان علتوں کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ کوئی علت اپنے معلول سے علیحدہ ہوکر اپنی شان قائم نہیں رکھ

سکتی۔ جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو زمین روشن ہوجاتی ہے اب اگر فرض کرلیا جائے کہ زمین پر تاریکی چھاگئی ہے تو ماننا پڑے گا کہ آفتاب ضرور غروب ہوچکا ہے۔ اس نظام قدرت سے انسان اور حیوان وغیرہ پیدا ہوئے تھے اور اس نظام سے یہ رونق (انسان و حیوان کی پیدائش) پیدا ہوگئی۔ مگر جب ہم یہ دیکھیں کہ یہ روشنی گم ہوگئی یعنی انسان و حیوان نہیں رہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ نظام قدرت بدل چکا ہے۔ اور نظام قدرت کی اس تبدیلی کو طامۃ الکبریٰ کہا گیا ہے۔

* آیت ۴۲ **یسئلونک عن الساعۃ** جب اس مسئلہ پر زیادہ توجہ کریں اور اس کو ذہن نشین کرنے کے لیے عقل پر زیادہ زور دیں تب اصل مسئلہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور جب اس کی طرف کم توجہ دیں تو اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ وہ چونکہ اس مسئلہ کی حقیقت سمجھنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے اور بے عقلی کی وجہ سے بھاگتے ہیں اور عقل پر زور نہیں دیتے اس واسطے اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ فضول سوال کرتے ہیں جیسے کہ قیامت کب آئے گی یعنی اس کا وقت بتاؤ۔ آیت ۴۳ و ۴۴ **فیما انت من ذکرٰھا** اے رسول (ﷺ) بھلا اس کا وقت بتانے سے تجھے کیا تعلق؟ وقت کا تعین صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اسے فرشتے بھی نہیں جان سکتے۔ آیت ۴۵ **انما انت منذر** جو لوگ اس سلسلے کی علت اور معلول کو سمجھنے والے ہیں تو ان کو فقط تنبیہ کرنے والا ہے۔ آیت ۴۶ **کانھم یوم یرونھا** یہ لوگ تو کہتے ہیں کہ وہ وقت جلد معلوم ہوجائے مگر جب وہ وقت سر پر آجائے گا تو کہیں گے کہ ہم کو کام کرنے کی بہت کم مہلت ملی کہ آدھے دن کے قریب رہے۔ تو یہ ان کی بے عقلی کی بات ہے کہ وہ ابھی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنا کام نہ کریں۔ یہ مہلت اس واسطے دی گئی ہے تاکہ یہ سوچیں اور اس سے فائدہ اٹھا کر کام کریں۔

(اب شروع سورت سے ترجمہ کرتے ہیں)

* روح اعظم اور اس دنیا کا تعلق قائم کرنے کے لیے فرشتے کام کرتے ہیں جیسے کہ انسانی حواس اور عصبات (یعنی انسان کی رگیں اور پٹھے) جس طرح یہ حواس اور پٹھے کام کرتے ہیں اسی طرح روح اعظم اور اس عالم کے اندر فرشتے کام کرتے ہیں ان فرشتوں کی

یہاں مختلف طریقے پر شہادت پیش کی گئی ہے۔ یہ سورت ان لوگوں کے واسطے ہے جو روحانی اسباب کو جانتے ہیں یعنی یہ مضمون ان لوگوں کے لیے ہے جو ان مضامین عالیہ کو جانتے ہیں اور روحِ اعظم اور فرشتوں کے حالات کا ان کو علم ہے۔ ہمارے مفسرین نے ایک غلطی کر رکھی ہے کہ قرآن مجید کی تمام آیات کو عام بدویت کی ذہنیت پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن مجید چونکہ دنیا کی تمام قوموں کو دعوت دیتا ہے اس واسطے ہر طبقہ کی سمجھ کے لیے اس کی ذہنیت کے مطابق سمجھا دیتا ہے۔ ہم نے قیامت کے متعلق بعض سورتوں کو کاشتکاروں کے احوال کے مطابق پایا ایسی ہی بعض سورتوں کو الٰہی حکماء کی ذہنیت کے مطابق پاتے ہیں۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ایک ہے جو لوگ فرشتوں کا واسطے روح اعظم میں اور اس انسانی جسم میں جانتے ہیں ان کے لیے یہ سورت مسئلہ قیامت کو سمجھنے کا آسان طریقہ ہے۔

* آیت ۱ **و النازعات غرقا** وہ اس نظام میں ڈبکی (غوطہ) لگاتے ہیں یعنی وہ کسی نظام کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ آیت ۵ **فالمدبرات امرا** تدبیر کر کے کام کرنے والے جن کے ذریعے روح اعظم کا تمام فیض زمین پر آرہا ہے۔ آیت ۱ تا ۴ یہ اس کام کے حصے ہیں اور اس کام کے درمیانی درجے ہیں اور اس کا آخری حصہ ہے کہ وہ مدبرات (آیت ۵) یعنی تدبیر کے مکمل کرنے والے ہیں۔ یعنی جو جماعت تدبیر سے کام کرتی ہے یہ آخری جماعت ہے۔ پہلی جماعتیں ابتدائی کام کر رہی ہیں یہ آخری جماعت ہے جو اپنی تدبیر سے کام کرتی ہے۔ آیت ۶ **یوم ترجف الراجفة** جس دن بڑا زبردست جھٹکا آئے گا۔ اور روح اعظم کھینچ کر تمام دنیا کو ہلا دے گی۔ آیت ۷ **تتبعها الرادفة** اس کے بعد دوسرا جھٹکا آئے گا۔ یہ جھٹکے جاری رہیں گے یہاں تک کہ تمام نظام بدل کر رکھ دیں گے۔ آیت ۸ و ۹ **قلوب یومئذ واجفة** اس دن وہ دل میں ڈر رہے ہوں گے اور آنکھیں جھکی ہوں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روح اعظم سامنے دکھائی دے رہی ہوگی اور یہ تمام سمجھ رہے ہوں گے کہ اب حساب ہونے والا ہے۔ غرض فرشتوں کی جماعتیں گواہ ہیں کہ ایسا واقعہ ضرور ہونے والا ہے۔

آیت ۱۰ انا لمردودون فی الحافرۃ جس طرح ہمیں پہلی دنیا میں بدن ملا کہ ہم پیدا ہوئے بچپن، جوانی اور بڑھاپا دیکھا کیا اب بھی اسی طرح ہوگا۔ آیت ۱۱ کیا ہم فنا ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے؟ یعنی یہ لوگ تسلسل حیات کے قائل نہیں ہیں کہ مر کر دوبارہ اٹھیں گے۔ مگر جب ان کو سمجھایا جاتا ہے تو وہ حیران ہو کر کہتے ہیں کہ کیا ہم پھر دوبارہ پیدا ہوں گے؟ جب ان کو سمجھایا جاتا ہے کہ تم فنا نہیں ہوتے بلکہ یہ حالت کی تبدیلی ہے تو کہتے ہیں (آیت ۱۲ تلک اذاً کرۃ خاسرۃ) چونکہ ہم نے دنیا میں بڑے بڑے ظلم کیے ہیں۔ اس واسطے ہم کو اس جگہ بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ آیت ۱۳ فانما ھی زجرۃ واحدۃ فاذا الایہ جو قوتیں اس عالم کو روح اعظم سے وابستہ رکھتی ہیں ان میں شدت آجائے گی اور اس شدت کی وجہ سے تمام کے تمام ننگے ہوجائیں گے اس جذب (کشش) اور نتیجہ کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات سے بتائی گئی ہے کہ اسی جذب کا نتیجہ تھا (آیت ۱۵)۔

سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِثْنَتَانِ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ كَذَا اِلَخ

سورۂ عبس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بیالیس آیتیں ہیں اور ایک رکوع اور اسی طرح آخر تک

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ☆

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۝١ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ۝٢ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۝٣

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس بات پر کہ آیا اس کے پاس اندھا اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا

اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝٤ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝٥ فَاَنْتَ لَهٗ

یا سوچتا تو کام آتا اس کے سمجھانا وہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اس کی

تَصَدّٰى ۝٦ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝٧ وَاَمَّا مَنْ جَاۗءَكَ يَسْعٰى ۝٨

فکر میں ہے اور تجھ پر کچھ الزام نہیں کہ وہ نہیں درست ہوتا اور وہ جو آیا تیرے پاس دوڑتا

وَهُوَ يَخْشٰى ۝٩ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝١٠ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝١١

اور وہ ڈرتا ہے سو تو اس سے تغافل کرتا ہے یوں نہیں یہ تو نصیحت ہے

فَمَنْ شَاۗءَ ذَكَرَهٗ ۝١٢ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝١٣ مَّرْفُوْعَةٍ

پھر جو کوئی چاہے اس کو پڑھے لکھا ہے عزت کے ورقوں میں اونچے رکھے ہوئے

مُّطَهَّرَةٍ ۝١٤ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝١٥ كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ۝١٦ قُتِلَ الْاِنْسَانُ

نہایت ستھرے ہاتھوں میں لکھنے والوں کے جو بڑے درجہ والے نیک کار ہیں مارا جائیو آدمی

مَآ اَكْفَرَهٗ ۝١٧ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝١٨ مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ

کیسا ناشکر ہے کس چیز سے بنایا اس کو ایک بوند سے بنایا اس کو

فَقَدَّرَهٗ ۝١٩ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۝٢٠ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۝٢١

پھر اندازہ پر رکھا اس کو پھر راہ آسان کر دی اس کو پھر اس کو مردہ کیا پھر قبر میں رکھوایا اس کو

ثُمَّ اِذَا شَاۗءَ اَنْشَرَهٗ ۝٢٢ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۝٢٣ فَلْيَنْظُرِ

پھر جب چاہا اٹھا نکالا اس کو ہرگز نہیں پورا نہ کیا جو اس کو فرمایا اب دیکھ لے

الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝٢٤ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَاۗءَ صَبًّا ۝٢٥ ثُمَّ

آدمی اپنے کھانے کو کہ ہم نے ڈالا پانی اوپر سے گرتا ہوا پھر

شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿٢٦﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿٢٧﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿٢٨﴾

چیرا زمین کو پھاڑ کر پھر اگایا اس میں اناج اور انگور اور ترکاری

وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿٢٩﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿٣٠﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿٣١﴾

اور زیتون اور کھجوریں اور گنجان کے باغ اور میوہ اور گھاس

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٢﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿٣٣﴾ يَوْمَ

کام چلانے کو تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے واسطے پھر جب آئے وہ کان پھوڑنے والی جس دن کہ

يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿٣٤﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿٣٥﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿٣٦﴾

بھاگے مرد اپنے بھائی سے اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی ساتھ والی سے اور اپنے بیٹوں سے

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿٣٧﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ

ہر مرد کو ان میں سے اس دن ایک فکر لگا ہوا ہے جو اسے کافی ہے بہت سے منہ اس دن

مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا

روشن ہیں ہنستے خوشیاں کرتے اور کتنے منہ اس دن ان پر

غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾

گرد پڑی ہے چڑھی آتی ہے ان پر سیاہی یہ لوگ وہی ہیں جو منکر ہیں ڈھیٹھ

سورۃ عبس مکیہ

* سورۃ والنازعات میں ہے الطامۃ الکبری یعنی اینٹ سے اینٹ بجا دینے والی چیز یعنی نظام عالم کو برباد کرنے والی۔ عالم کے نظام پر جو بربادی آئے گی اس سے اس کا تعلق ہے۔ اب سورۃ عبس کا مطلب ہے کہ انسانی جماعت کے نظام پر جو اس کا اثر آئے گا یعنی نظام کی تبدیلی کے وقت اس جماعت پر جو اثر آئے گا اس کے اثر سے ہر ایک آدمی اپنی نجات کے واسطے چیخ رہا ہوگا۔ آیت ۱ تا ۲۳ دیکھو، آیت ۲۴ کے بعد۔

* آیت ۲۴ تا ۳۲ **فلینظر الانسان الی طعامہ** ہم نے کس طرح نظام قدرت سے انسان کو کھانا دیا۔ آسمان و زمین کی قوتیں کام کرتی ہیں تو اس کے نتیجے سے انسان اور حیوان فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آیت ۳۲ متاعا یہ سب تمہارے اور تمہارے جانوروں کے لیے سامان ہیں۔ آیت ۳۳ تا ۳۷ **فاذا جاءت الصاخۃ** یہ تبدیلی لازمی ہے اور جب تبدیلی ہوگی تو ایک طرف تو زمین و آسمان کا نظام بدل جائے گا اور دوسری طرف انسان تبدیل ہو جائے گا۔ وہ دن ایسا ہے کہ انسان اپنے تمام عزیز و اقارب سے بھاگے گا۔ ہر انسان اپنے اپنے کام میں مستغرق ہوگا اور کسی کو ایک دوسرے کی خبر بھی نہیں ہوگی۔ آیت ۳۸ تا ۳۹ **وجوہ یومئذ مسفرۃ** اس وقت بعض صورتیں خوش ہوں گی یعنی یہ تو اچھے لوگ ہیں۔ آیت ۴۰ تا ۴۲ **وجوہ یومئذ علیھا غبرۃ الآیہ** اور بعض صورتیں ایسی ہوں گی کہ ان کے منہ پہلے تو غبار آلود ہوں گے اور بعد میں ان کی سیاہی بڑھتی چلی جائے گی، یہ جہنمی ہیں۔ غرض انسانیت دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔

(اب اول سورۃ سے ترجمہ شروع کرتے ہیں)

* آیت ۱ تا ۱۰ **عبس و تولی ان جاءہ الاعمی** یہ جو دو قسم کے انسان ہیں ان کا نمونہ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہاں اس دنیا میں بھی انسانوں کی حالت ایسی ہی ہے کہ ایک تو بڑے خوبصورت مہذب اور باتمیز آدمی ہیں۔ ان کی اپنی زندگی کا ایک

خاص نظام قائم ہے مگر ان میں گھر کی سوچ اور سمجھ کچھ بھی نہیں ایک تو یہ لوگ ہیں اور دوسرے ایسے لوگ ہیں کہ انہیں آرام کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بلکہ بعض اوقات وہ معمولی سی ظاہری خوبصورتی سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ جیسے اندھے۔ مگر اس کے باوجود وہ خوب سوچنے والے آدمی ہیں اور مسئلہ کو آخر تک سوچنے والے انسان ہیں۔ قرآن مجید ان سوچنے والے (اگرچہ بدصورت ہی ہوں) لوگوں کو سب سے پہلی صف میں جگہ دیتا ہے۔ اور بے تمیز خوبصورت لوگوں کو پیچھے رکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ایک واقعہ اتفاقیہ طور سے آگیا ہے کہ آپ قریش مکہ کی محفل میں اسلام کے احکام سمجھا رہے تھے کہ ایک نابینا (ابن ام مکتوم) مسلمان اس مجلس میں آگیا۔ وہ اسلام کے متعلق آپ سے دریافت کرتا تھا اور آپ دوسری طرف منہ موڑ رہے تھے اس سے ایک شبہ پیدا ہوسکتا تھا کہ اس قسم کے سرمایہ دار اور بے سمجھ لوگوں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم میں ایک امتیازی درجہ ہے اس واسطے رسول کریم ﷺ کو تنبیہ کردی گئی کہ آپ نے ایک دفعہ تو ایسا کیا مگر آئندہ کبھی ایسا نہ کریں۔ غرض آیت ۱ تا ۱۰ میں اس واقعہ کا ذکر ہے۔ آیت ۳ و مایدریک لعله یزکی پاکیزہ اخلاق کا مالک ہوجائے۔ آیت ۴ او یذکر یا وہ اچھی بات یاد کرلے اور اس سے بتدریج فائدہ حاصل کرلے۔ جب اس نے بات کو یاد کرلیا تو اب وہ اس میں غلطی نہیں کرے گا بلکہ فائدہ اٹھاتا رہے گا۔ جو لوگ اعلیٰ دماغی قوتوں کے مالک ہیں ان کو ایک علمی اشارہ (جھلک) آخر نتیجہ تک پہنچنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور دوسرے درجہ کے آدمی وہ ہوتے ہیں کہ انہیں یک بات سمجھادی جائے اور وہ اسے سمجھ کر خوب یاد کرلیتے ہیں اور پھر اس پر غور کرتے رہتے ہیں تو وہ آہستہ آہستہ آخری نتائج پر پہنچ جاتے ہیں۔ آیت ۵ و اما من استغنی جو بے راہ ہے اسے کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت نہیں۔ سرمایہ دار بے پرواہ ہیں ان کو کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔ نہ علمی ترقی کا ان کو خیال ہے اور نہ پاکیزہ اخلاق کی ان کو خواہش ہے۔ اور جس کو ضروت ہوتی ہے وہ ہر بات میں سوچ بچار کرتا ہے۔ اس واسطے کہا گیا ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" یہ حکیمانہ قول ہے۔ اور مسکین آدمی کو ہر چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سوچ بچار میں ہوتا ہے تو اس

میں سوچ کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے بڑے بڑے راز دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب غرباء اہل عقل سے وجود میں آئے ہیں۔ آیت ۶ و ما علیک تو اسے کیوں سمجھا رہا ہے؟ وہ تو سمجھے گا ہی نہیں۔ ان بے وقوفوں کے پڑھانے کی تم پر ذمہ داری نہیں ڈالی گئی۔ جس میں لیاقت ہو ان کو پڑھاؤ۔ جب وہ تعلیم کی پروا نہیں کرتے تو سمجھانا بالکل عبث ہے۔ آیت ۷ و اما من جاءک یعنی ہم نے تجھے ایسے بے وقوفوں کی تعلیم کے لیے نہیں روانہ کیا بلکہ ان لوگوں کی تعلیم کے واسطے روانہ کیا ہے جو سمجھتے ہیں یعنی رسول کریم ﷺ کی بات کو سوچ سمجھکر کرتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں کو سمجھانا اور سکھلانا آپکے ذمہ ہے نہ کہ ان لوگوں کو جو سوچتے سمجھتے ہی نہیں۔ آیت ۸ تا ۱۰ یسعی (۸) جو کوشش کرتا ہے دوڑتا ہوا تیرے پاس آتا ہے۔ (۹) علمی ذوق رکھتا ہے کہ علت معلول اور سبب مسبب کو سمجھتا ہے (۱۰) اس کو سمجھانا تم پر فرض ہے اور تم کو اس سے غفلت نہ ہو۔ غرض ان آیات میں اس خاص واقعہ کے متعلق ایک تنبیہ کردی گئی ہے اور اس کے بعد آپ نے ایسا کبھی نہیں کیا اور یہ تمام استادوں کا فرض ہے۔ آیت ۱۱ کلا انها تذکرة یہ تعلیم ایک قسم کی یاد دہانی ہے۔ جس کے اندر استعداد ہے اس کو بھولی ہوئی بات یاد آجاتی ہے۔ آیت ۱۲ فمن شاء ذکرہ جو اسے سمجھ اور سوچ سکتا ہے اس کے واسطے یاد دہانی ہے یعنی استعداد رکھنے والے لوگوں کے لیے اس تعلیم کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ جو لوگ اس تعلیم کو حاصل کرنے کا شوق رکھتے ہیں وہی اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ آیت ۱۳ تا ۱۶ فی صحف مكرمة قرآن مجید کی اشاعت کے طریقہ کی طرف اشارہ ہے۔ آیت ۱۳ فی صحف مكرمة قرآن شریف عزت والے کاغذوں میں لکھا جائے گا ایک ایک سورت ایک صحیفہ میں لکھی جائے گی۔ آیت ۱۴ مرفوعة یہ تعلیم اونچی جماعت کے واسطے ہے جو انٹر نیشنلزم قائم کرنا چاہتی ہے۔ مطہرہ پاکیزہ یعنی اس میں خدا پرستی، علم اور اخلاق اعلیٰ ہے۔ آیت ۱۵ و ۱۶ بایدی سفرة سفیروں کے ہاتھ میں ہے جو دنیا میں پھل رہے ہیں۔ کرام یعنی بڑے اخلاق کے مالک۔ بررة نیک طبعتیں مطلب یہ ہوا کہ رسول کریم ﷺ کو ایسے شاگرد تیار کرنے چاہئیں جو قرآن مجید کو دنیا

میں خدائی سفیر بن کر پھیلائیں اور وہ نیک طبیعت ہوں اور دنیا میں ایک اعلیٰ اخلاق کی جماعت بنانے والے ہوں۔ ایسی جماعت کو دنیا دار لوگوں کے آگے خوشامد کر کے تبلیغ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سرمایہ دار جماعت چاہتی ہے کہ کوئی ہماری خوشامد کرتا رہے۔ آیت ۱۷ **قتل الانسان ما اکفرہ** جو لوگ بے تمیز ہیں وہ توقع رکھتے ہیں کہ انبیاء اور انکے شاگرد ہماری خوشامد کرتے رہیں تب ہم ان کی بات سنیں گے، کیا یہ ان کے لیے جائز ہے؟ یہ اس واسطے کہا گیا کہ جو چیز انسان کو بلندی پر پہنچانے والی ہے وہ اسے ذلیل سمجھتا ہے۔ یہ نعمت کی قدر جاننے والا نہیں۔ آیت ۱۸ تا ۲۲ **من ای شیءٍ خلقه** یہ اپنی پیدائش کے مسئلہ پر شروع سے لے کر مرنے تک غور کرے اور سمجھے کہ ہم نے اسے کس قدر نعمتیں پہنچائی ہیں۔ اس کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے کہ یہ کس کام کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس میں خود ہی خواہش ہونی چاہیے کہ یہ اپنا فرض ادا کرے۔ قرآن مجید اس کو فرض ادا کرنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ اس واسطے اسے خود ہی قرآن مجید کی تعلیم کی طرف کوشش کر کے جانا چاہیے۔ آیت ۲۳ **کلا لما یقض ما امرہ** مگر یہ ایسا نہیں کرتا۔ اس کا جو فرض ہے اسے پورے کرنے کا یہ نام ہی نہیں لیتا۔ آیت ۲۴ تا ۳۲ **فلینظر الانسان الی طعامه** اگر یہ اس طرف توجہ کرتا تو اس کے لیے فقط ایک ہی چیز کافی تھی کہ یہ اپنے کھانے کی طرف دیکھتا کہ یہ کس طرح پیدا ہو رہا ہے تو اس میں یہ اپنے فرائض کو سمجھ سکتا۔ یہ چیزیں تمام انسانوں کے لیے قدرتی طور پر مساوی پیدا کی جاتی ہیں اور انسان ان کو اپنی تنہا کوشش سے پیدا نہیں کر سکتا۔ مگر قدرت ان کو پیدا کرتی ہے تو انسان اور حیوان دونوں ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اب یہ ظلم ہے کہ مساکین کو اس سے محروم کر دیا جائے اور ان تمام نعمتوں کو صرف اپنے واسطے ہی مخصوص کر لیا جائے۔ آیت ۳۳ تا ۴۲ **یوم یفر المرء من اخیه** جن عزیزوں، رشتہ داروں کے واسطے یہ لوگوں پر ظلم کرتا رہا۔ اس وقت یہ ان تمام سے بھاگے گا جب کہ یہ واقعہ وقوع میں آئے گا۔ آیت ۳۸ و ۳۹ **وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ** جن لوگوں نے انصاف کا خیال رکھا ہو گا وہ اس دن آرام سے رہیں گے۔ آیت ۴۰ تا ۴۲ **وجوہ یومئذ علیها غبرۃ** جن لوگوں

نے ظلم کیے ہوں گے وہ نقصان میں رہیں گے۔

* اس سورت میں زیادہ تر دو چیزوں پر زور دیا گیا ہے ایک تو کھانے پینے کی چیزیں اور دوسرے اولاد کی تربیت۔ تو یہ ابتدائی چیزیں ہیں اس کے بعد کتاب اللہ پڑھے گا تو اسے زیادہ توفیق ہوتی جائے گی۔

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۂ تکویر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انتیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ☆

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ﴿١﴾ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ﴿٢﴾ وَاِذَا

جب سورج کی دھوپ تہ ہو جائے ف اور جب تارے میلے ہو جائیں ف اور جب

الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ﴿٣﴾ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ﴿٤﴾ وَاِذَا الْوُحُوْشُ

پہاڑ چلائے جائیں ف اور جب بیاتی اونٹنیاں چھٹی پھریں ف اور جب جنگل کے جانوروں

حُشِرَتْ ﴿٥﴾ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿٦﴾ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴿٧﴾

میں رول پڑ جائے ف اور جب دریا جھونکے جائیں ف اور جب جیوں کے جوڑے باندھے جائیں ف

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ﴿٨﴾ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿٩﴾ وَاِذَا

اور جب بیٹی جیتی گاڑ دی گئی کو پوچھیں کہ کس گناہ پر وہ ماری گئی ف۱۲ اور جب

الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿١٠﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿١١﴾ وَاِذَا الْجَحِيْمُ

اعمالنامے کھولے جائیں اور جب آسمان کا پوست اتار لیں ف۱۳ اور جب دوزخ

سُعِّرَتْ ﴿١٢﴾ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿١٣﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿١٤﴾

دہکائی جائے اور جب بہشت پاس لائی جائے ف۱۴ جان لیگا ہر ایک جی جو لے کر آیا ف۱۵

فَلَآ أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿١٥﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿١٦﴾ وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ﴿١٧﴾

سو قسم کھاتا ہوں میں پیچھے ہٹ جانیوالوں سیدھے چلنے والوں دبک جانیوالوں کی ف۱ اور رات کی جب پھیلنے پر آئی ف۲

وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ﴿١٨﴾ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿١٩﴾ ذِي قُوَّةٍ

اور صبح کی جب دم بھرے ف۳ مقرر یہ کہا ہے ایک بھیجے ہوئے عزت والے کا قوت والا

عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ﴿٢١﴾ وَمَا صَاحِبُكُم

عرش کے مالک کے پاس درجہ پانے والا سب کا مانا ہوا وہاں کا معتبر ہے ف۴ اور یہ تمہارا رفیق کچھ

بِمَجْنُونٍ ﴿٢٢﴾ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ﴿٢٣﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ

دیوانہ نہیں ف۵ اور اس نے دیکھا ہے اس فرشتہ کو آسمان کے کھلے کنارہ کے پاس ف۶ اور یہ غیب کی بات بتانے

بِضَنِينٍ ﴿٢٤﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴿٢٥﴾ فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ ﴿٢٦﴾

میں بخیل نہیں ف۷ اور یہ کہا ہوا نہیں کسی شیطان مردود کا ف۸ پھر تم کدھر چلے جا رہے ہو ف۹

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿٢٧﴾ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ ﴿٢٨﴾

یہ تو ایک نصیحت ہے جہان بھر کے واسطے ف۱۰ جو کوئی چاہے تم میں سے کہ سیدھا چلے ف۱۱

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٢٩﴾

اور تم جبھی چاہو کہ چاہے اللہ سارے جہان کا مالک ف۱۲

سورۃ التکویر مکیہ

* یہ ایک خاص نقطۂ نظر سے قیامت کو واضح کرنے والی سورت ہے۔ آیت ۱ تا ۱۴ کی تشریح آیت ۲۶ کے بعد دیکھیں۔

* آیت ۱۵ و ۱۶ **فلا اقسم بالخنس الایہ** ان میں روشن ستاروں کی گواہی ہے اور اوپر کی طرف غور کرنے کا اشارہ ہے کہ کتاب الٰہی جیسی روشن ہے ویسے ہی اس کے لانے والے عمل کرنے والے معزز اور صاحب قوت وغیرہ ہوں گے۔ ان پانچ سیاروں (خمسہ متحیرہ) کو بطور شہادت پیش کیا جاتا ہے جن کی حرکتیں ایک طرح کی نہیں ہوتیں۔ یہ چلتے چلتے کبھی تو پیچھے آجاتے ہیں اور کبھی چلتے چلتے ٹھہر جاتے ہیں اور کبھی سیدھے نکل جاتے ہیں۔ تو ان کی صفات کا ذکر کرکے کہا کہ ان کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ سوائے سورج چاند کے باقی سبعہ سیارہ کو خمسہ متحیرہ کہتے ہیں۔
آیت ۱۷ و ۱۸ **و اللیل اذا عسعس و الصبح اذا تنفس** یہ دونوں گواہ ہیں۔ آیت ۱۹ **انہ لقول رسول کریم** یہ تمام آیت (۱۵ و ۱۶) اس بات کے گواہ ہیں کہ قرآن مجید ایک معزز پیغامبر (جبریل) کا قول ہے۔ خفی اشارہ اس کی طرف ہے کہ حاملین قرآن ایسے اوصاف والے ہوں گے

آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

آیت ۲۰ و ۲۱ **ذی قوۃ الایہ** یہ تمام اس پیغامبر (فرشتے) کے متعلق اوصاف ہیں جس کی زبان سے یہ قرآن مجید نازل کیا جارہا ہے۔ آیت ۲۲ **و ماصاحبکم بمجنون** صاحب کے معنی ہیں کامریڈ۔ رسول کریم ﷺ کی طرف اشارہ ہے جس طرح سورۃ نون میں گذر چکا ہے۔ اس آیت میں آپ کی تعریف کا بیان ہے کہ آپ خلق عظیم کے مالک ہیں۔ آیت ۲۳ **و لقد راٰہ** رسول کریم ﷺ نے جبریل کو آسمان پر دیکھا۔ افق المبین سے مراد حظیرۃ القدس ہے جس میں ملاء اعلیٰ کی جماعت ہے۔ وہاں تجلی الٰہی برس رہی ہے۔ آیت ۲۴ **و ما ھو علی الغیب بضنین**

اور رسول کریم ﷺ غیب پر بخیل نہیں ہیں انہیں جب غیب کی بات معلوم ہوتی ہے تو اس میں بخل نہیں کرتے اور اسے صرف اپنے لیے مخصوص نہیں کرتے۔ آیت ۲۵ **و ماھو بقول شیطان الرجیم** یہ شیطان کی بات نہیں ہے۔ آیت ۲۶ **فاین تذھبون** تو تم کیا سوچتے ہو اور کدھر جاتے ہو؟ شیطانوں کے کلام میں شر اور فساد برپا کرنا اور بے انتظامی ہوتی ہے یعنی ان کا قول فساد عالم کی طرف رہبری کرتا ہے اور کلام الٰہی اور آنحضرت ﷺ تو احسن اخلاق اور اعلیٰ نظام پیدا کرنا چاہتے ہیں کیا تم نہیں سمجھتے؟ (ا) آسمان پر دو نظام ہیں ایک چاند کا اور دوسرا سورج کا۔ **و اللیل اذا عسعس و الصبح اذا تنفس** دن اور رات ایک قاعدہ کے اندر گھٹتے اور بڑھتے ہیں اور ان کی تمام حرکتیں معلوم ہیں اور دوسرا حصہ یعنی بقیہ پانچ (آیت ۱۵ و ۱۶) سیارے بے قاعدہ ہیں۔ ان کی حرکت باقاعدہ نہیں ہے۔ یہ کبھی ٹھہر جاتے ہیں اور چل پڑتے ہیں اور کبھی واپس ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ ستاروں کا نظام ہے۔ یہ نظام آخری نہیں ہے بلکہ اس کے اوپر ایک اور اعلیٰ نظام ہونا چاہیے۔ جس کے ماتحت یہ بے قاعدہ رفتار بھی باقاعدہ بن جاتی ہو۔ اعلیٰ نظام کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے اس واسطے اس کے اوپر ایک اعلیٰ نظام ہونا چاہیے۔ (اس اعلیٰ نظام کا نام حظیرۃ القدس ہم نے رکھا ہے) یہ قرآن مجید اسی اعلیٰ نظام کی طرف سے ہے اور اسے ایک معزز فرشتہ لارہا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا اس فرشتہ کے ساتھ اتصال ہے اور آپ سوچ سمجھ کر پھر اس سے قرآن مجید اخذ کرتے ہیں۔ یہ اعلیٰ نظام اس وقت ہماری نظروں سے غائب ہے مگر جس دن یہ ظاہر ہوجائے گا اور وہ روشن عالم (اعلیٰ نظام) نمایاں ہوجائے گا تو اس آسمان کا سورج میں اندھیرا ہوجائے گا۔ اسی کا نام قیامت ہے۔ آیت ا تا ۱۳ **اذا الشمس کورت** اس اعلیٰ نظام کے ماتحت جو حظیرۃ القدس میں ہے۔ وہ حظیرۃ القدس جس دن ظاہر ہوگا اس دن یہ تمام واقعات ظہور میں آجائیں گے اس وقت اس نظام کی (موجودہ نظام جو زمین و آسمان پر ہے) ضرورت نہیں رہے گی اور یہ موجودہ نظام ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ آیت ۸ و ۹ **اذا الموءدۃ سئلت** چھوٹی بچی پر جو ظلم ہوا تھا کہ اسے زندہ دفن کردیا گیا تھا۔ اب حکومت اس کے متعلق باز پرس کررہی ہے۔

قاعدہ ہے کہ قتل کے مقدمات میں سرکار بذات خود دعویدار بنتی ہے۔ **و اذا الصحف نشرت** جب کہ نامۂ اعمال ہر ایک کا اس کے آگے آجائے گا۔ آیت ۱۱ **و اذا السماء کشطت** موجودہ صورت میں آسمان موجودہ ایک قسم کا پردہ ہے۔ اس کے اٹھ جانے کے بعد اس کے پرے جو اعلیٰ صفتیں ہیں وہ نمایاں ہوجائیں گی یعنی حظیرۃ القدس کا نظام ظاہر ہوجائے گا اور یہ موجودہ نظام انسانیت ٹوٹ جائے گا۔ آیت ۱۲ **و اذا الجحیم سعرت** اس کے کام کا وقت قریب آگیا۔ یعنی سزا دینے کا وقت آگیا اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے متفرق واقعات ہیں۔ کچھ زمین میں اور کچھ آسمان پر ہیں۔ چنانچہ یہ واقعات جب ظہور میں آجائیں گے تو انسان اس وقت (آیت ۱۴ **علمت نفس ما احضرت** جس وقت یہ تمام ظہور میں آجائیں گے اس وقت وہ حقیقت ظاہر ہوگی) جان لے گا کہ اس نے دنیا میں کیا اعمال کیے تھے۔ یعنی قیامت کا جو حادثہ ہونے والا ہے اس اعلیٰ نورانی طاقت (حظیرۃ القدس) کے ظہور سے ہونے والا ہے۔ جیسے رات کے بعد دن آتا ہے۔ اسی طرح تجلی الٰہی کا اس قدر بڑا سورج نکلے گا کہ یہ موجودہ سورج اس کے سامنے تاریک ہوجائے گا۔ آیت ۱۵ و ۱۸ اب آگے سوچنے اور سمجھنے کا موقع دیا گیا ہے۔ آیت ۱۵ و ۱۶ **فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس** جیسے انسان آسمان پر خمسہ متحیرہ ستاروں کی حرکت کو باقاعدہ دیکھتا ہے تو اسے اسی پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے آگے ترقی کرنی چاہیے اور اس نظام کے اوپر جو باقاعدہ نظام ہے اس کے متعلق غور کرنا چاہیے جس طرح سورج اور چاند کا نظام باقاعدہ نظر آرہا ہے اور خمسہ متحیرہ سیاروں کی چال بےقاعدہ نظر آرہی ہے تو انسان سمجھ جاتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی اعلیٰ نظام ہونا چاہیئے جسکے ماتحت یہ بےقاعدگی ظاہری باقاعدہ ہوجائے اسی طرح اعلیٰ نظام تجلی اعظم کے ماتحت کام کر رہا ہے۔ آیت ۱۹ تا ۲۶ **انہ لقول رسول** قیامت کا واقعہ ہونے والا ہے اس میں تو چارہ ہی نہیں ہے یعنی واقعہ ضرور ہو کر رہے گا اور اب یہ جو قرآن مجید نازل کیا جارہا ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ وہ (قرآن مجید) اس واقعہ کے واسطے لوگوں کو تیار کردے اور یہ دنیا کے لیے بڑی کارآمد چیز ہے کہ وہ اس بڑے واقعہ کے بچاؤ کی تدبیریں بتارہا ہے اور

دنیا کو بھی رحمت دے رہا ہے۔ آیت ۲۷ ان ھو الا ذکر للعالمین یہ تمام اقوام کے لیے ایک نصیحت ہے اس سے پہلے بھی رسول آئے۔ اس کا اور ان کا درجہ یہ ہے کہ یہ تمام اقوام عالم کے لیے ایک تذکرہ ہے۔ اس پاسپورٹ سے آگے بڑھنا اور چلنا ہوگا۔ جس کے پاس یہ تذکرہ نہ ہوگا ان کو اقوام عالم میں بڑھنے کا موقع نہیں ملے گا۔ آیت ۲۸ لمن شاء منکم اس بین الاقوامی تحریک کے لیے جس کا جی چاہے سیدھا کرلے۔ آیت ۲۹ و ما تشاؤن الا یشاء اللہ رب العالمین یہ کام وہی کریں گے جن میں اللہ تعالی نے اس کام کرنے کی پہلے ہی سے استعداد رکھی ہے اور وہی اس سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ اب ان دو واقعات کو جمع کردیا گیا ہے (۱) پہلے قیامت کا ذکر ہے اور آخر میں قرآن مجید کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد اور انسانیت کی اس قدر ترقی ہونے کے بعد اس عالم بالا سے ترقی کی کوئی اور چیز نازل نہیں ہوگی۔ یہ قرآن مجید بین الاقوامی ترقی کی چیز ہے اس کے بعد جو چیز آنے والی ہے وہ فقط قیامت ہے۔ گویا قرآن مجید نازل ہونے کے بعد قیامت اس کے ساتھ ہی متصل ہے اور قرآن مجید اور قیامت کے درمیان اب کوئی اور حجاب نہیں ہے۔ اللہ تعالی کے اوصاف سب قدیم ہیں مگر ارادہ اور کلام خاص استعداد و مستعدات کو چاہتا ہے۔

* اس سورت میں قرآن مجید کو جبریل کا کلام کہا گیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی کے اوصاف سب قدیم ہیں۔ ان میں سے ارادہ اور کلام حسب استعداد قابل کے نزول ہوتا ہے۔ جب مادہ میں استعداد موجود ہوتی ہے تو وہ ارادہ ازلی یا کلام ازلی بذریعہ تجلی، حظیرۃ القدس میں بلاکیف نازل ہوتا ہے۔ وہ معانی، معانی ہوتے ہیں اور حظیرۃ القدس میں ان کی صورت منطبع ہوتی ہے۔ اور جب کوئی کامل مکمل زمین پر موجود ہوتا ہے اور ارادہ الٰہی اس سے کلام کرنے کا ہے تو وہ معانی مصورہ بصورت خاص و الفاظ خاص، زبان خاص میں حظیرۃ القدس میں منطبع ہوجاتے ہیں اور جبریل کے دل پر وہ نقش خاص منقش ہوتا ہے اور بذریعہ جبریل اس کامل کے دل پر وہ معانی بالفاظ خاص وارد ہوتے ہیں جو تجلی الٰہی کے ذریعہ حظیرۃ القدس میں نازل ہوئے ہیں تو ایک گونہ جبریل کا کلام ہے اور ایک طرح خدائی کلام ہے۔

سُورَةُ الِانْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۃ انفطار مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے ☆

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ﴿۱﴾ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۙ﴿۲﴾ وَاِذَا

جب آسمان چر جائے اور جب تارے جھڑ پڑیں اور جب

الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۙ﴿۳﴾ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۙ﴿۴﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا

دریا ابل نکلیں اور جب قبریں زیر و زبر کر دی جائیں جان لے ہر ایک جی جو کچھ کہ

قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ؕ﴿۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۙ﴿۶﴾

آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا اے آدمی کس چیز سے بہکا تو اپنے رب کریم پر

الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ﴿۷﴾ فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ

جس نے تجھ کو بنایا پھر تجھ کو ٹھیک کیا پھر تجھ کو برابر کیا جس صورت میں چاہا

رَكَّبَكَ ؕ﴿۸﴾ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۙ﴿۹﴾ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾

تجھ کو جوڑ دیا ہرگز نہیں پر تم جھوٹ جانتے ہو انصاف کا ہونا اور تم پر نگہبان مقرر ہیں

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۙ﴿۱۳﴾

عزت والے عمل لکھنے والے جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو بےشک نیک لوگ بہشت میں ہیں

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۙ﴿۱۴﴾ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا

اور بےشک گنہگار دوزخ میں ہیں ڈالے جائیں گے اس میں انصاف کے دن اور نہ ہوں گے اس کو

بِغَآئِبِيْنَ ؕ﴿۱۶﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۙ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ

چھپ جانے والے اور تجھ کو کیا خبر ہے کیسا ہے دن انصاف کا پھر بھی تجھ کو کیا خبر ہے کیسا ہے دن

الدِّيْنِ ؕ﴿۱۸﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾

انصاف کا جس دن کہ بھلا نہ کر سکے کوئی جی کسی جی کا کچھ بھی اور حکم اس دن اللہ ہی کا ہے

سورۃ الانفطار مکیہ

* سورۃ مدثر میں ہے کہ کنا نکذب بیوم الدین تو قیامت کے دن کو یوم الدین بتلایا گیا ہے اسی طرح اور سورتوں میں قیامت کا نام یوم الدین رکھا گیا ہے اب سوال یہ ہے کہ قیامت کے دن کو یوم الدین کا نام کیوں دیا گیا ہے اس کی تفسیر کے لیے سورہ انفطار ہے۔

* آیت ۱تا۵ اذا السماء انفطرت. الایات قرآن مجید میں جس طرح واقعہ قیامت پر تنبیہ کرنے کا عام طریقہ ہے ان آیات میں بھی وہی طریقہ بتلایا گیا ہے کہ یہ تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ان آیات میں عربی ذہنیت کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ تمام ان پڑھ قوموں کی ذہنیت کا یہی مشترکہ درجہ ہے۔ ان پڑھ قومیں عموماً کسی تعجب انگیز بات کو سن کر زیادہ متوجہ ہوتی ہیں اس کے برخلاف کسی معمولی بات کو سن کر وہ متوجہ ہی نہیں ہوتیں۔ مگر جب کوئی عجیب بات ان تک پہنچتی ہے تو وہ تمام کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں جو دماغ، علت و معلوم کے سلسلہ کو سمجھ کر بات کو سمجھنے والے ہوں ان کے نزدیک کوئی بات عجیب نہیں رہتی۔ اور وہ بالکل نہیں ڈرتے۔ اب وہ سوچتے ہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ مگر جو لوگ اُمی ہیں اور علت و معلول کے سلسلے کو قائم نہیں کر سکتے ان کے لیے اگر کوئی ایسی بات آجائے تو وہ جھٹ گھبرا کر اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ اس طرف پوری طرح توجہ دیتے ہیں تب وہ بات کو اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں۔

* دنیا کے تمام انقلابات میں قیامت کا واقعہ سب سے بڑا واقعہ ہے جب سے اِنسانی پیدائش اس کرۂ ارض پر پیدا ہوئی ہے اس وقت سے لے کر اس قدر بڑا انقلاب نہیں آیا جتنا کہ قیامت کا انقلاب ہوگا۔ قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد فرض کرو کہ پچاس ہزار سال کے بعد قیامت آئے گی تو اس تمام زمانے میں انسانیت کے لیے

قرآن مجید کے سوائے کوئی اور پروگرام نہیں۔ فقط اسی (قرآن) کی حکومت ہوگی۔ لادینی انٹر نیشنلزم در حقیقت انٹر نیشنلزم کا ایک ٹکڑا ہے۔ پورا انٹر نیشنلزم تب ہوگا جب اس میں انسانی عقائد اور انسانی اخلاق کا پورا لحاظ رکھا جائے گا اور ہر طبقہ اپنی ذہنیت کے مطابق اس کی حقانیت کا قائل ہوگا۔ اور شوق سے اس انٹر نیشنلزم طاقت میں شامل ہوگا۔ یہ انٹر نیشنلزم کا نصب العین ہے۔ انسان کو جہاں تک ممکن ہو اس طرف آہستہ آہستہ پہنچنا چاہیے۔ اور یہی قرآن مجید کا مقصد ہے۔ چونکہ قرآن مجید کے پروگرام کو قیامت کے ساتھ خصوصی تعلق ہے اسی واسطے قرآن مجید میں قیامت کے واقعہ کا واضح طور پر سمجھانا ضروری ہے۔ اور اس کی روح فقط یہی ہے کہ دنیا کا فقط اللہ تعالی کے سوائے کوئی بادشاہ نہیں ہے اور انٹر نیشنلزم کی یہی روح ہے۔ اب عربی ذہنیت کو اس سے متاثر کرنے کے لیے اس کا جو عجیب تر حصہ ہے وہ پہلے کہا جاتا ہے۔ عقلی نظریہ سے اس حصہ کی تکمیل کردی جاتی ہے۔ آیت ۵ **علمت نفس ما قدمت و اخرت** انسان کو جو آگے آنے والے واقعات ہیں یا اس واقعہ (قیامت) کے وقوع میں آنے سے پہلے جو واقعات اس دنیا میں انسان پر گزر چکے ہیں۔ وہ تمام واقعات اس کے روبرو آجائیں گے۔ غرض قیامت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ تمام واقعات کو ظاہر کردے گی۔

* آیت ۷و۸ **یا ایھا الانسان ما غرک بربک الکریم** جب یہ واقعہ ہوجائے گا تو روح اعظم جو ایک پردہ کا کام دے رہی ہے اب اس کے بجائے انسان کا اللہ تعالی سے براہ راست تعلق ہوجائے گا۔ اللہ تعالی کی طرف سے اس کے دل میں تنبہ پیدا ہوگا کہ میں نے دوسری چیزوں میں رہ کر اللہ تعالی کو بھلا دیا۔ اصل کام کی چیز یہی تھی کہ مجھے اللہ تعالی سے تعلق رکھنا چاہیے تھا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک بڑے کام کرنے والی طبیعت ہے مگر وہ نہیں سمجھ سکتی کہ میری طبیعت اس پروگرام کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس واسطے ایسا شخص ایک سرپرست کی ہمیشہ ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح جو آدمی اپنے طور پر کام کرنا چاہتا ہے وہ ایسے آدمی کی ہمیشہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ اس سے تعلق پیدا کرکے اسے سرپرست بنائے اور اس کے ساتھ ہی کام کرے۔ اس واسطے وہ کبھی کسی سے اور کبھی کسی سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ اور اسی

طرح پریشان رہتا ہے۔ اس پریشانی میں وہ سوچتا ہے کہ وہ ایک شہزادہ تھا جو حقیقت میں اپنے ملک سے دور ہو گیا ہے اور اس کا باپ اب تک اپنے ملک میں حکمران ہے۔ اب چونکہ وہ اپنے سرپرستوں سے تنگ آیا ہوا تھا اس واسطے وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرکے اپنے باپ کے پاس جلدی پہنچتا ہے۔ جب باپ اور بیٹے ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں تو بیٹے کے دل میں ندامت پیدا ہوتی ہے کہ میں نے خواہ مخواہ ایک سرپرست کی تلاش میں وقت ضائع کیا میرا سرپرست تو میرا باپ تھا اور مجھے اسی کی طرف آنا چاہیے تھا۔ اس کیفیت سے اس کی طبیعت بھر جاتی ہے اس وقت بادشاہ (باپ) بیٹے سے کہتا ہے کہ بیٹا تو اتنی مدت ہم سے کیسے غافل رہا؟ تو اس کیفیت سے جو بیٹے کے دل میں پیدا ہوئی تھی اس کے (بیٹے) دل پر بہت اثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہر ایک بات کو پھوٹ پھوٹ کر کہے گا اور باپ کے سامنے رو پڑے گا۔ اس کے بعد اس کی طبیعت بالکل صاف ہو جائے گی۔

* آیت۶ ماغرک بربک الکریم کام کرنے والے انسان کو ایک سرپرست کی ازحد ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے لوگ غیر اللہ کی عبادت میں پھنس جاتے ہیں۔ انہیں جن جن سے توقع ہوتی ہے کہ وہ ان کی مدد کریں گے تو ان کی انتہائی غلامی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ انسان جو خود سوچ کر کام کرتا ہے اس کو ایسی جگہ مایوسی نظر آتی ہے۔ وہ جس آدمی یا جس طاقت (غیر اللہ) پر اعتماد کرتے ہیں وہ آخر نکمی ثابت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو اپنے اللہ تعالی سے تعارف ہو جائے اور یہ قیامت میں ہر شخص کو بلاواسطہ ہوگا۔ اس وقت اس سے کہا جائے کہ اے انسان! تجھے اپنے رب کی طرف سے کس نے دھوکے میں ڈال دیا کہ تو اپنے رب سے اتنا عرصہ بے پروا رہا۔ آیت۷ خلقک فسواک جس نے تجھے بنایا اور تیری ایک ٹھیک فطرت بنائی، جو فطرت تیری خودی کو بخشی گئی، اس کی تمام ضروریات مہیا کردیں یہ ہے سوی کا ترجمہ یعنی فطرت کی جس قدر اندرونی ضرورتیں تھیں وہ تمام اندر ہی اندر پورے طور پر پوری ہو گئیں۔ مثلاً ایک انسانی خودی کے لے ضروری ہے کہ وہ خود سوچ سمجھ کر کام کرے، ورنہ انسانی خودی قائم نہیں رہتی۔ انسانی خودی کے لیے خود

کام کرنا ضروری ہے۔ اگر اسے خود کام کرنا نہیں آتا تو سمجھ لو کہ اس کی خودی نامکمل ہے۔ اب ایک سمجھدار دماغ ہے اور ماں باپ اس کی پوری سرپرستی کرتے ہیں مگر وہ خود کو ان کے لیے ایک بوجھ سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اپنے والدین کے سر پر کیوں پڑا رہوں؟ میں خود کام کیوں نہ کروں؟ اس واسطے اس کے خود کے کام کے لیے اس کو خودی کا تمام حصہ اور تمام کام دے دیے گئے یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے۔

* فعدلک۔ ہر ایک عضو کی طاقت عدالت پر رکھی گئی۔ پاؤں کو اپنی طاقت دی گئی ہے اور آنکھ وغیرہ کو اپنی اور پوری پوری عدالت سے طاقتوں کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اب اس کے بعد انسان تمام قدرتی اسباب کا محتاج ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ایسے احاطہ (میدان) میں رکھتا ہے کہ اسے ہر ایک چیز اپنے مطلب کی ملتی ہے یہ ہے فعدلک کا ترجمہ یعنی اعتدال پیدا کر دیا۔ بیرونی طاقتوں میں اس قدر لچک رکھی ہے کہ انسان ان سے جس قدر فائدہ اٹھانا چاہے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یعنی یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام چیزیں خود بخود ہی اس کے پاس آجائیں بلکہ ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے انسان کو خود سوچ سمجھ کر کام کرنا پڑے گا، اور پھر تمام بیرونی چیزیں خود بخود ہی اس کے ماتحت (تسخیر) ہو جائیں گی۔ آیت ۸ فی ای صورۃ ماشاء مطلب یہ ہے کہ انسان کو ایک خاص انسانیت کی شکل دی گئی ہے اور تمام نظام انسانیت میں انسان کا کام اللہ تعالیٰ کے سوائے کوئی پورا نہیں کر سکتا۔ اسے ایسی خاص صورت دی گئی ہے کہ جو کام یہ صورت (خاص شخص مثلاً زید) خود کرے گی اس کے بغیر ساری انسانیت کا نظام نامکمل رہے گا اور اتنے کام کے حصہ کو انسان کے سوائے کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ بڑی جماعتوں میں کام کی تعداد سے قیمت نہیں لگائی جاتی ہے بلکہ اس کی نسبت دی جاتی ہے۔ تو مجموعی انسانی کام میں تمام انسانوں کی ایک ہی نسبت ہے۔ مثلاً ایک آدمی لاکھ روپے کا کام کرتا ہے اور دوسرا آدمی ایک پائی (۱) کا دونوں کے

(۱) یعنی اگر ایک پائی کا کام کرنے والا نہ ہوتا تو لاکھ کے کام کرنے والا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے کھیتی باڑی کرنے والا غریب اگر کھیتی نہ کرتا تو بڑی بڑی سلطنتیں اور سرمایہ دار تباہ ہو جاتے۔ اب مجموعی نظام عالم میں ایک بادشاہ اور ایک صفائی والے کی ایک نسبت ہے جس نے اس نسبت پر غور نہ کیا تو اس نے کچھ نہ سوچا۔

مجموعی کام کی نسبت یکساں ہے۔ جیسی لاکھ روپے والے کام کی تھی ویسی ہی پائی والے کی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان جب اپنی فطرت کا مطالعہ کرے تو وہ اپنے اوپر کسی آدمی کو حاکم نہیں مانے گا سوائے اس رب کے جس نے اسے یہ فطرت عنایت کی ہے۔ بادشاہ تمدن کی حالت میں صفائی والے کا ایسا محتاج ہے جیسے حلال خور پیسہ کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر حلال خور اپنی خودی کی طرف نگاہ کرے تو سوائے اللہ تعالیٰ کے اپنے اوپر کوئی بادشاہ و حاکم نہ مانے گا۔ اپنا سرپرست فقط اللہ تعالیٰ کو مانے گا اور بادشاہ کو اپنے مساوی سمجھے گا یہ تعلیم کتاب الٰہی کا خاصہ ہے۔

* آیت ۹ کلا بل تکذبون بالدین اس حقیقت سے انسان کیوں غفلت برتتا ہے اس کے متعلق آیت ۶ میں بحث ہے کہ اے انسان! تو اس حقیقت کو کیوں نہیں سمجھتا؟ اور تجھے کس چیز نے غفلت میں رکھا؟ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ تمام عمر اس کی اسی طرح گزر سکتی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں کسی ایسے دن کی توقع نہیں رکھتا جس دن تمام حکومتیں ختم ہوجائیں گی سوائے رب کی حکومت کے۔ اگر انسان کو یہ یقین ہو کہ ایسا دن آنے والا ہے تو پھر بھولے سے بھی وہ کسی کی حکومت کو تسلیم نہیں کرے گا۔ مگر وہ اس دن سے غفلت برتتا ہے اور اگر اس کے متعلق سمجھایا جائے تو وہ اس کے انکار پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ تو اسی طرح حقیقی سرپرست سے غفلت برت کر دوسرے دروازوں پر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ آیت ۱۰ تا ۱۲ ان علیکم لحافظین یہ غفلت اس واسطے ہے کہ تم اس یوم الدین کا انکار کر رہے ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی ایسی بنائی ہے کہ اس کے ہر کام کے ساتھ محافظ طاقتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو اس کے کسی کام کو ضائع نہیں ہونے دیتیں۔ آیت ۱۳ تا ۱۶ ان الابرار لفی نعیم محافظ قوتیں انسانی کام کو ضائع نہیں ہونے دیتیں۔ اب انہوں نے جو انسانی کام کو محفوظ رکھا ہے ان کا بھی کسی دن نتیجہ نکلنا چاہیے۔ قیامت کے دن نئی زندگی پیدا ہوگی اور اس زندگی کا خلاصہ اب بتلایا جاتا ہے کہ نیک لوگ آرام کی زندگی بسر کریں گے اور برے لوگ بری زندگی بسر کریں گے۔ ابرار وہ جماعت ہے جس کی روح اعمال پر نگاہ ہوتی ہے۔ اعمال کی ایک صورت ہوتی ہے جیسے صلوۃ کی ایک ہیئت

ہے، دوسری اس کی روح ہوتی ہے۔ صلوۃ کی روح کا نکتہ تراہ۔ آیت ۱۵ **لیصلونہا یوم الدین** یہ فیصلہ قیامت کے دن ہوگا کہ ان کو یہ بدلہ دیا جائے گا (جنت اور جہنم) اور یہ ان کاموں کو محفوظ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے جو محافظ قوت نے محفوظ رکھا تھا۔

* آیت ۱۶ **و ما هم عنها** اس محافظ قوت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ کبھی غائب نہیں ہوسکتے بلکہ ان کو حاضر کردیا جائے گا۔ آیت ۱۷ تا ۱۹ **و ما ادراک ما یوم الدین** اب یوم الدین پر بحث ہے۔ اس دن یہ بات ظاہر ہوگی کہ کوئی انسان کسی کا کام نہیں کرسکتا۔ **و الامر یومئذ للہ** اور انسان کا تمام کام فقط اللہ تعالی ہی کرتا ہے۔ انسانی فطرت سے جو زائد کام کرنا پڑتا ہے وہ اللہ تعالی ہی کے ہاتھ میں ہے اور کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں۔ غرض یہ بات اس دن ظاہر ہوجائے گی۔ اور انسان میں جو سرپرستی کی خواہش ہے، اگر انسان اپنی حقیقت پر غور کرلے تو وہ اللہ تعالی کے سوائے کسی کو اپنا سرپرست نہیں پائے گا۔ اور جب وہ نظام قدرت کا مطالعہ کرلے گا تب بھی وہ اللہ تعالی کے سوائے کسی کو اپنا سرپرست نہیں پائے گا۔ اس بات کو سمجھانے کے لیے کہ انسان کی سرپرستی اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں کرسکتا سورہ فاتحہ میں مالک یوم الدین کی صفت کا اظہار کیا گیا ہے جو ہر متدین آدمی کو ہر وقت پیش نظر رکھنی چاہیے اس واسطے سورہ فاتحہ میں یہ دفعہ بڑھادی گئی ہے۔

سُورَةُ التَّطْفِيفِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سِتٌّ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً

سورۂ تطفیف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھتیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴿١﴾ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ﴿٢﴾

خرابی ہے گھٹانے والوں کی وہ لوگ کہ جب ماپ کریں لوگوں سے تو پورا بھر لیں

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ﴿٣﴾ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ

اور جب ماپ کر دیں اُن کو یا تول کر تو گھٹا کر دیں ف۱ کیا خیال نہیں رکھتے وہ لوگ

اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ﴿٤﴾ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿٥﴾ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ

کہ اُن کو اُٹھنا ہے اُس بڑے دن کے واسطے جس دن کھڑے رہیں لوگ راہ دیکھتے جہان

الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦﴾ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ﴿٧﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ

کے مالک کی ف۲ ہرگز نہیں بیشک اعمالنامہ گنہگاروں کا سجین میں ہے اور تجھ کو کیا خبر ہے

مَا سِجِّيْنٌ ﴿٨﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٩﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٠﴾

کیا ہے سجین ایک دفتر ہے لکھا ہوا ف۳ خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی

الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿١١﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا

جو جھوٹ جانتے ہیں انصاف کے دن کو اور اُس کو جھٹلاتا ہے وہی جو

كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿١٢﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ

بڑھ نکلنے والا گنہگار ہے ف۴ جب سنائے اُس کو ہماری آیتیں کہے نقلیں ہیں

الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٣﴾ كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٤﴾

پہلوں کی ف۵ کوئی نہیں پر زنگ پکڑ گیا ہے اُنکے دلوں پر جو وہ کماتے تھے ف۶

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ اِنَّهُمْ

کوئی نہیں وہ اپنے رب سے اُس دن روک دیے جائینگے ف۷ پھر مقرر وہ

لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿١٦﴾ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٧﴾

گرنے والے ہیں دوزخ میں پھر کہا جائیگا یہ وہی ہے جس کو تم جھوٹ جانتے تھے

كَلَّآ إِنَّ كِتَٰبَ ٱلْأَبْرَارِ لَفِى عِلِّيِّينَ ﴿١٨﴾ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا

ہرگز نہیں ف بیشک اعمال نامہ نیکوں کا علیین میں ہے اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے

عِلِّيُّونَ ﴿١٩﴾ كِتَٰبٌ مَّرْقُومٌ ﴿٢٠﴾ يَشْهَدُهُ ٱلْمُقَرَّبُونَ ﴿٢١﴾ إِنَّ ٱلْأَبْرَارَ

علیین ایک دفتر ہے لکھا ہوا ف اسکو دیکھتے ہیں نزدیک والے یعنی فرشتے ف بیشک نیک لوگ

لَفِى نَعِيمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى ٱلْأَرَآئِكِ يَنظُرُونَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِى وُجُوهِهِمْ

ہیں آرام میں تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے ف پہچان لے تو انکے منہ پر

نَضْرَةَ ٱلنَّعِيمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ﴿٢٥﴾ خِتَٰمُهُۥ مِسْكٌ

تازگی آرام کی ف انکو پلائی جاتی ہے شراب خالص مہر لگی ہوئی ف جسکی مہر جمتی ہے مشک پر

وَفِى ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ ٱلْمُتَنَٰفِسُونَ ﴿٢٦﴾ وَمِزَاجُهُۥ مِن

اور اس پر چاہیے کہ رغبت کریں رغبت کرنے والے ف اور اسکی ملونی ہے

تَسْنِيمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا ٱلْمُقَرَّبُونَ ﴿٢٨﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ أَجْرَمُوا۟

تسنیم سے وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں اللہ کے مقرب ف وہ لوگ جو گنہگار ہیں

كَانُوا۟ مِنَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ يَضْحَكُونَ ﴿٢٩﴾ وَإِذَا مَرُّوا۟ بِهِمْ

تھے ایمان والوں سے ہنسا کرتے ف اور جب ہو کر نکلتے انکے پاس کو

يَتَغَامَزُونَ ﴿٣٠﴾ وَإِذَا ٱنقَلَبُوٓا۟ إِلَىٰٓ أَهْلِهِمُ ٱنقَلَبُوا۟ فَكِهِينَ ﴿٣١﴾ وَ

تو آپس میں آنکھ مارتے ف اور جب پھر کر جاتے اپنے گھر پھر جاتے باتیں بناتے ف اور

إِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوٓا۟ إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّونَ ﴿٣٢﴾ وَمَآ أُرْسِلُوا۟ عَلَيْهِمْ

جب انکو دیکھتے کہتے بیشک یہ لوگ بہک رہے ہیں ف اور انکو بھیجا نہیں ان پر

حَٰفِظِينَ ﴿٣٣﴾ فَٱلْيَوْمَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مِنَ ٱلْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿٣٤﴾ عَلَى

نگہبان بنا کر ف سو آج ایمان والے منکروں سے ہنستے ہیں ف

ٱلْأَرَآئِكِ يَنظُرُونَ ﴿٣٥﴾ هَلْ ثُوِّبَ ٱلْكُفَّارُ مَا كَانُوا۟ يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہیں ف اب بدلا پایا منکروں نے جیسا کچھ کرتے تھے ف

سورۃ التطفیف مکیہ

* یہ سورۃ قیامت کے مضمون کو تاجرانہ ذہنیت سے سمجھاتی ہے اور انسانی اعمال کی جو محافظ قوت ہے (کہ وہ انسانی اعمال کو ضائع نہیں ہونے دیتی) اس کی توضیح ہے۔ یہ سورت قیامت کے اس رخ کو واضح کرتی ہے جو انسانی اعمال کی محافظت سے تعلق رکھتی ہے۔ تاجرانہ سیاست یہ ہے کہ دوسرے کو کم منافع دیا جاتا ہے اور خود زیادہ منافع اٹھایا جائے۔ جو شخص اس کام میں ماہر ہو کہ خود زیادہ منافع اٹھائے اور حساب کتاب میں مشاق ہو اور ناپ تول میں بھی صرف اپنا ہی فائدہ ملحوظ رکھے اور اپنی اس بات کو (ناپ تول کی کمی وغیرہ) ظاہر نہ ہونے دے وہ اصل معنی میں تاجر ہے۔ اسے عربی میں تطفیف کہتے ہیں۔ تو گویا تاجرانہ کمائی کا نام تطفیف ہے۔

* آیت ۱ **ویل للمطففین** ان کے لیے افسوس ہے۔ آیت ۲ و ۳ **الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون** مطففین کی یہ تفسیر ہے کہ وہ صرف اپنا ہی فائدہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ تاجروں کی جو زندگی اور تاریخ ہے اس میں بے انتہا تجربے موجود ہیں کہ جس تاجر نے اس طرح مال جمع کیا وہ غارت ہو گیا بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ وہ بہت سال مال محتاجوں کو دیتا رہے تو وہ اس بد معاشی کے نتائج سے بچتا رہتا ہے۔ آیت ۴ و ۵ **الا یظن اولئک** اگر ان سے یہاں حساب نہ لیا گیا اور یہ اس جگہ کسی طرح سے بچ گئے تو کیا ان کو خیال نہیں ہے کہ ان سے ایک نہ ایک دن حساب لیا جائے گا؟ آیت ٦ **یوم یقوم الناس لرب العالمین** یہ حاضری کا دن ہے۔ آیت ۷ **کلا** لوگ اس مسئلہ سے غفلت برتتے ہیں مگر یہ ضرور ہو کر رہے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی کام ضائع نہیں ہوتا۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں محفوظ رہتا ہے۔ تو ایک قوت جو انسان سے نکلی ہے (روح) اور وہ فنا نہیں ہوتی۔ فطری طور پر اس کا انسانیت میں واپس آنا لازمی ہے یعنی انسان ہو کر قیامت میں آئے گا۔ دوسری

شکل(۱) بدل کر وہ پھر انسان پر آکر سوار ہوجائے گی تو اس حقیقت کو عام زبان میں سمجھایا گیا ہے۔ ان کتاب الفجار فجار وہ ہیں کہ ایک قانون کو مان کر پھر اس کو توڑتے ہیں۔ مع ہذا ان کو یقین ہے کہ یہ قانون سچا ہے۔ بدمعاشوں کا دفتر سجین میں ہے۔ آیت ۸ و ۹ کتاب مرقوم وہ ایک لکھا ہوا دفتر ہے۔ یعنی محافظ قوت نے انسان کے اعمال کو محفوظ کردیا ہے۔ آیت ۱۰ ویل یومئذ جن کا سجین میں دفتر ہے ان کا بہت برا حال ہوگا اور ان کو وہاں حاضر رہنا ہوگا اور سجین کے عذاب کا مزا چکھنا ہوگا۔ آیت ۱۱ الذین یکذبون سجین میں دفتر ان لوگوں کا ہے جو یوم الدین سے انکار کرتے ہیں۔

* آیت ۱۲ و مایکذب الا کل معتد جو شخص انسانی فطرت کو بگاڑ چکا ہے اور دوسرے کا مال غصب کرچکا ہے اب اسے فکر ہے کہ اسے اس کی سزا ملے گی اس واسطے یہ اس دن سے انکار کردیتا ہے اپنے دل کو اس طرح تسلی دیتا ہے کہ قیامت ہے بھی نہیں۔ آیت ۱۳ اذا تتلی علیہ انسان کو اعمال کی سزا ضرور ملتی ہے اور اس انسانی اعمال کے سزا کی دلیل میں جب اسے تاریخی واقعات بتلائے جاتے ہیں تو وہ اس کو خرافات کہتا ہے۔ آیت ۱۴ کلا بل ران ان کی یہ حالت اس واسطے ہوئی کہ یہ جب آہستہ آہستہ بدمعاشی کرتے رہے تو ان میں قوت ضمیری نہ رہی۔ اسے زنگ (گناہ) نے کھالیا اب ان میں کانشنس نہیں رہا۔ آیت ۱۵ کلا انھم عن ربھم اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ یہ اس دن اپنے رب سے دور ہوں گے۔ دوسرے لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی کہ وہ اللہ تعالی کو پردہ کے پیچھے دیکھیں گے۔ مگر انہوں نے چونکہ اپنی فطرت کو بگاڑ لیا ہے اس واسطے یہ اللہ تعالی کو نہیں دیکھ سکیں گے اور اس کی رحمت اور انعام سے دور رہیں گے۔ آیت ۱۶ و ۱۷ ثم انھم لصالوا الجحیم ان کی سزا دوزخ ہے، جس سے یہ انکار کرتے ہیں۔ حکمت کے طور پر اس طرح سمجھایا گیا ہے

---

(۱) دوسری بار دوسری شکل انسانی جس میں آگے سے زیادہ تیز حواس ہوں ظاہر ہوگی جس چیز کو دور بینوں سے نہیں دیکھ سکتا تھا اپنے حواس سے دیکھ رہا ہے اور جس چیز کو تنکے برابر سمجھتا تھا وہ بڑے پہاڑ کی شکل میں نمودار ہے اور وہ شکل حسب اعمال دی جائے گی یعنی بدصورت، خوبصورت اور خوبصورت، بدصورت۔

کہ زنگ کو دور کرنے کے لیے لوہے کو آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے زنگ کو دور کرنے کے لیے انہیں آگ میں ڈالا جائے گا۔ آیت ۱۸ تا ۲۰ کلا ان کتاب الابرار لفی علیین نیک لوگوں کا دفتر علیین میں ہوگا وہ حظیرۃ القدس میں ہے جہاں ملاء اعلیٰ ہیں۔ آیت ۲۱ کتاب مرقوم یشھدہ المقربون جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا انہی لوگوں کا وہاں دفتر ہوگا اور مقرب جماعت ملاء اعلیٰ وہاں ہر وقت حاضر ہیں۔ آیت ۲۲ تا ۲۶ ان الابرار من رحیق مختوم ان کو نعمتیں دی جائیں گی ان کی تھوڑی سے تفصیل ان آیات میں بتلائی جاتی ہے۔ تاجر روپیہ پیسہ جمع کر کے اس دنیا میں ترقی کرتے ہیں وہ عیش کی مجلس منعقد کرتے ہیں اور کرسیوں پر بیٹھ کر شراب پیتے ہیں اگلی دنیا میں یہی کیفیت ان نیک سوداگروں کی ہوگی جنہوں نے اس دنیا میں خیانت نہیں برتی۔ وہ ان تمام نعمتوں کے اگلی دنیا میں مالک ہوں گے۔

* آیت ۲۵ و فی ذلک فلیتنافس المتنافسون ایسی مقدس چیز جس سے انسان کو سرور حاصل ہو اور خوشبو بھی۔ اس کے حاصل کرنے کے لیے انسان کو کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی طرف رغبت کریں رغبت کرنے والے۔ (آیت ۲۷ دیکھو آیت ۲۸ کے بعد) آیت ۲۸ عینا یشرب بھا المقربون جو اول درجہ کے نیک لوگ ہیں ان کے لیے تسنیم ہے، وہ ایک چشمہ ہے مقرب لوگ سارا پیالہ تسنیم کا پیئیں گے۔ آیت ۲۷ و مزاجہ من تسنیم اور جو دوسرے درجہ کے نیک لوگ ہیں ان کے لیے تسنیم میں سے کچھ لے کر پیالہ میں ملا دیا جائے گا۔ بیت

ازیں افیون کہ ساقی در مے افگند
حریفان را نہ سرمایہ نہ دستار

یعنی مقرب لوگ تو تسنیم ہی پیئیں گے اور ابرار لوگوں کو اس کا ذرا سا ملا دیں گے۔ یہی معنی ہے مزاجہ من تسنیم کے۔ مقرب لوگ تو اس سے سیر بھی نہ ہوں گے

شربت الخمر کاساً بعد کاس
فما نفدت شراب و لا رویت

آیت ۲۹ ان الذین اجرموا مجرم لوگ دنیا میں مومنین کا مذاق اڑاتے تھے۔

آیت ۳۳ تا ۳۵ اس سورت کے آخر میں، آیت ۳۴ و ۳۶ کے بعد دیکھو۔ آیت ۳۴ و ۳۶ فالیوم الذین آمنوا مگر آج کے دن مومن کافروں کی ہنسی اڑائیں گے جس طرح کافر دنیا میں مساکین کی ہنسی اڑاتے تھے، اسی طرح آج کے دن مومن کفار کی ہنسی اڑائیں گے۔ جس طرح انہوں نے مساکین کو تکلیف دی اسی طرح آج یہ بھی تکالیف میں مبتلا ہیں۔ علی الارائک ینظرون مومن لوگ تختوں پر بیٹھ کر سیر کے طور پر ادھر ادھر دیکھتے ہوں گے آپس میں خوش و خرم ہوں گے اور باتیں کرتے ہوں گے۔ هل ثوب الکفار ماکانوا یفعلون اور آپس میں ہنسی کے طور پر کہیں گے بھائی بتاؤ تو سہی کیا کافروں، سرمایہ داروں کو پوری پوری سزا ملی؟ (اب سرمایہ دار مجرموں کا نقشہ آتا ہے)

* آیت ۳۰ تا ۳۲ کانوا من الذین آمنوا یضحکون کافر یا کٹری (Reactionary) لوگ ان مساکین کا مذاق اڑاتے تھے کہ دیکھو یہ مساکین کس قدر غلطی میں مبتلا ہیں کہ یہ ہماری طرح روپیہ پیسہ نہیں لوٹتے بلکہ انصاف کا ڈنکا بجا رہے ہیں اور بھوکے مر رہے ہیں۔ و اذا انقلبوا الی اھلھم بھوکے لوگوں کا ان کے دلوں میں خیال تک نہیں آتا انواع انواع کے لذیذ طعام اور میوے گھر میں کھاتے اور گھروں میں نہایت عیش و عشرت میں مزے کر رہے ہیں اور مساکین پر آنکھوں سے اشارہ کرتے ہیں کہ دیکھو یہ لوگ دنیا میں انصاف قائم کرنے کے لیے آئے ہیں۔ و اذا رأو ھم قالوا ان یوں کہتے ہیں کہ یہ کیسے گمراہ لوگ ہیں کہ روپیہ پیسہ کمانے کا موقع کھو رہے ہیں اور مساکین کی خدمت کرتے ہیں انسان کو چاہیے اپنے فائدہ کا خیال رکھے۔ یہ ایسا نہیں کرتے، یہ گمراہ ہیں۔ دیکھو تو سہی یہ لوگ مساوات مساوات اور حقوق الناس کہتے پھرتے ہیں اس سے کیا ہوتا ہے دنیا جہاں میں تو اپنا کماؤ اور کھاؤ بس۔ و ما ارسلو علیھم حافظین ان سرمایہ دار کفار کو لوگوں پر فتوی دینے کا کوئی حق نہیں دیا گیا اور نہ یہ کفار ان کے نگران کار تھے۔ اور ہم نے ان کفار کو انسپکٹر تھوڑا ہی بنایا ہے کہ تفتیش کرتے پھریں حالانکہ مومنین کی یہ جماعت بین الاقوامی کام کرتی ہے۔ ان کی یہ نادان ہنسی اڑاتے ہیں اور ان کو گمراہ کہتے ہیں۔

سُورَةُ الْإِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسٌ وَعِشْرُونَ آيَةً

سورہ انشقاق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ ۝١ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝٢ وَإِذَا الْأَرْضُ

جب آسمان پھٹ جائے اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ آسمان اسی لائق ہے ف۱ اور جب زمین

مُدَّتْ ۝٣ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝٤ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝٥

پھیلا دی جائے ف۲ اور نکال ڈالے جو کچھ اس میں ہے اور خالی ہو جائے ف۳ اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ زمین اسی لائق ہے

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ۝٦

اے آدمی تجھ کو تکلیف اٹھانی ہے اپنے رب تک پہنچنے میں سہہ سہہ کر پھر اس کو ملنا ہے ف۴

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۝٧ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا

سو جس کو ملا اعمالنامہ اسکا داہنے ہاتھ میں تو اس کو حساب دینگے آسان

يَسِيرًا ۝٨ وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝٩ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ

حساب ف۵ اور پھر آئیگا اپنے لوگوں کے پاس خوش ہو کر ف۶ اور جس کو ملا

كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۝١٠ فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُورًا ۝١١ وَيَصْلَىٰ

اس کا اعمالنامہ پیٹھ کے پیچھے سے ف۷ سو وہ پکاریگا موت موت ف۸ اور پڑیگا

سَعِيرًا ۝١٢ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝١٣ إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ

آگ میں وہ رہا تھا اپنے گھر میں بے غم ف۹ اس نے خیال کیا تھا کہ

لَنْ يَحُورَ ۝١٤ بَلَىٰ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ۝١٥ فَلَا أُقْسِمُ

پھر کر نہ جائیگا ف۱۰ کیوں نہیں اس کا رب اس کو دیکھتا تھا ف۱۱ سو قسم کھاتا ہوں

بِالشَّفَقِ ۝١٦ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝١٧ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۝١٨ لَتَرْكَبُنَّ

شام کی سرخی کی اور رات کی اور جو چیزیں اس میں سمٹ آتی ہیں اور چاند کی جب پورا بھر جائے ف۱۲ کہ تم کو چڑھنا ہے

طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝١٩ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝٢٠ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ

سیڑھی پر سیڑھی ف۱۳ پھر کیا ہوا ہے انکو جو یقین نہیں لاتے ف۱۴ اور جب پڑھیے ان کے پاس

الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۩ (٢١) بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ (٢٢) وَاللّٰهُ

قرآن تو سجدہ نہیں کرتے بلکہ اور بلکہ جو کافر جھٹلاتے ہیں اور اللہ

اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ (٢٣) فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (٢٤) اِلَّا الَّذِيْنَ

خوب جانتا ہے جو اندر بھر رکھتے ہیں ف۱ سو خوشی سنادے ان کو عذاب دردناک کی ف۲ مگر جو لوگ کہ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (٢٥)

یقین لائے اور کام کیے بھلے ان کے لیے ثواب ہے بے انتہا ف

سورۃ الانشقاق مکیہ

* اس سورت میں قیامت پر بحث ہے اور انسانیت کی فطری ترقی کے نقطہ نظر سے کی گئی ہے اگر تمام چیزوں کو چھوڑ دیا جائے اور انسانی ترقی فقط اپنی فطری ترقی کرتی جائے تو انسان کی فطری ترقی قیامت کی طرف ایک قدم آجائے گی(۱) آیت ۱۹ لترکبن طبقاً عن طبق تم چڑھتے جاؤ گے طبقہ بعد طبقہ، پہلے بیان کیا گیا ہے کہ انسانیت کا کہیں خاتمہ نہیں ہے۔ اب انسانیت ایک طبقہ کو ختم کرکے دوسرے طبقہ میں ترقی کرے گی۔ ایک کو ختم کرکے پھر دوسرے طبقہ میں جائے گی۔ غرض اس طرح درجہ بدرجہ ترقی کرتی جائے گی اور جب زمین کے طبقہ میں انسانی ترقی مکمل ہوجائے گی تو اسے چھوڑ کر یعنی اس دنیا کو چھوڑ کر اسے اوپر جانا ہوگا۔ اس کا نام قیامت ہے۔ انسان کے مرنے کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ ایک کی انسانیت فنا ہوجاتی ہے بلکہ اس کی انسانیت ویسی ہی قائم رہتی ہے اور اس کے تمام اعمال اپنے حس مشترک میں محفوظ رہتے ہیں اور اسی طرح عقائد اور علوم۔ گویا اس کی موت کا معنی یہ ہے کہ جسم کی ضروریات سے فارغ ہوکر وہ ان اعمال کے مطالعہ میں مشغول ہوتا ہے اس کی تشریح ہم قدرے تفصیل سے کرتے ہیں۔ فاستمع لاستلی علیک اگر انسانی طاقتوں کی تحلیل کی جائے تو اس کے دو حصے نکلتے ہیں ایک حصہ کا نام ہے بہیمیت یعنی حیوانیت جو جسمانی حیات کی مالک ہے کہ اس سے جسم زندہ رہتا ہے۔ اور دوسرے حصہ کا نام ہے ملکیت یعنی نورانیت۔ اس دوسرے حصے کے واسطے سے انسان کا تعلق مقدس لوگوں، فرشتوں اور بعد میں اللہ تعالی سے بالواسطہ پیدا ہوتا ہے۔ اس دنیا میں انسان کی زندگی میں جو چیز موت تک غالب (ظاہر) ہے۔ اس میں پھیلاؤ جزو بہیمیت کا ہے۔ یعنی حیوانیت کا جزو غالب (ظاہر) رہتا ہے۔ اور دوسرا جزو (ملکیت) اس کے اندر چھپ کر

---

(۱) یہ بھی طبی مسئلہ ہے کہ جس انسان میں غور کی عادت ہے تو جتنا بوڑھا ہوتا جائے گا اس کی دماغی ترقی بڑھتی جائے گی اور اگر اس میں غور کی عادت نہیں تو جتنا بوڑھا ہوتا جائے گا اتنا کم عقل ہوتا جائے گا یہ اس زمانہ کے ڈاکٹروں کا تجربہ ہے۔

کام کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹھنڈے پانی کو اس قدر گرم کریں کہ وہ کھولنے لگ جائے تاکہ وہ ایک ٹکڑا آگ کا معلوم ہونے لگے۔ مگر اس حالت میں بھی پانی اپنی طبعی ٹھنڈک کو نہیں چھوڑتا۔ اسی حالت میں اگر یہ کھولتا ہوا پانی آگ پر ڈال دیا جائے تو اس موقع پر وہ اپنا طبعی جذبہ زور سے ظاہر کرے گا اور آگ کو بجھادے گا۔ تو اس مثال میں یہ سمجھنا چاہیے کہ پانی اور اس کی طبیعی ٹھنڈک ظاہر اور غالب ہے اور اس میں جو ۹۹ درجہ کی گرمی ہے وہ مغلوب ہے اور چھپی ہوئی ہے۔ یعنی بظاہر گرمی محسوس ہو رہی ہے اور ٹھنڈک چھپی ہوئی ہے۔ موت کے بعد حالت بدل جائے گی اور حالت برعکس ہو جائے گی۔ اور دوسرا جزو (ملکیت) ظاہر (غالب) ہو جائے گا۔ اور پہلا جزو (بہیمیت) اس کے اندر چھپ جائے گا۔ بعض حکماء کا خیال ہے کہ پہلا جزء (بہیمیت) بالکل غائب ہو جائے گا اس کو شاہ صاحب کے فلسفہ میں بالکل قبول نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اس راستہ کو بالکل غلط مانا جاتا ہے۔ جس دن پہلا جزو (بہیمیت) بالکل غالب ہو گیا تو اس دن انسانیت بالکل غائب ہو جائے گی۔ ایک کسر اعشاریہ کا بہت ادنی درجہ یعنی پہلے جزو (بہیمیت) کا دوسرے جزو (ملکیت) کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ مثلاً اس پہلے جزو کا اتنا حصہ رہ گیا تو بھی انسانیت صحیح ہے۔ ان دونوں جزوں کا آپس سے علیحدہ ہو جانا ہمارے فلسفہ میں ناممکن مانا گیا ہے۔ جب تک انسانیت ہے دونوں جزء (بہیمیت اور ملکیت) ساتھ رہیں گے۔ یہ جو پہلا جزء (بہیمیت) ہے اس کا مددگار دنیا میں یہ جسم خاکی تھا۔ جتنا حصہ پہلے حصہ (بہیمیت) میں سے کم ہو جاتا ہے (جیسے متعارض قوتوں سے) تو اس کا بدل (اس کے بجائے) یہ حصہ (جسم خاکی) ہمیشہ تیار کر کے بھیجتا رہتا ہے۔

* موت کے بعد جب اس بدن (جسم خاکی) سے انسانی روح کا تعلق ٹوٹ گیا تو جو مدد اس پہلے حصہ (بہیمیت) کو یہ بدن پہنچاتا تھا وہ ختم ہو گئی۔ اور ملکیت کے آہستہ آہستہ غالب ہونے کی وجہ سے اسکے اجزاء میں کمی ہونی شروع ہو گئی جیسے گرم پانی آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ تو یہ کبھی یک لخت نہیں ہوگا۔ ایک زمانہ تک روح کی حالت ایسی ہی رہے گی کہ وہ سمجھے گا کہ میرے دونوں جزو بہیمیت اور ملکیت جیسے دنیاوی زندگی میں تھے ویسے ہی اب بھی قائم ہیں اور حیوانیت کا جزو غالب ہوگا اسکے دل

میں یوں خیال ہوگا کہ میرے دونوں جزء دنیاوی زندگی کے مانند بدستور قائم ہیں۔ اب صرف اس قدر فرق ہے کہ بدن (جسم خاکی) کے نہ ہونے سے میں کام نہیں کرسکتا اور باقی میں ویسے کا ویسا ہوں جیسا دنیاوی زندگی میں تھا۔ جب تک یہ خیال قائم رہے گا اس زمانے کو عالم قبر کہا جاتا ہے۔ یہ خیال آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوگا جب یہ خیال نصف سے زیادہ کم ہوگیا اور ملکیت غالب ہونے لگی تو اب اس طرح کا خیال پیدا ہونے لگے گا کہ مجھے ملکی قوتوں (ملکیت کی قوتیں) سے اتصال پیدا کرنا چاہیے اور پرانے طریقہ کو اب بھولنے لگے گا۔ جب اس دور کو پورا کرلے کہ اپنے درجہ کے مناسب ایک ایسی جماعت میں جہاں ملکیت ظاہر ہے شامل ہوسکے تو قبر کا زمانہ یہاں پر ختم ہوجائے گا۔ اب اس کے بعد ملکیت کی اجتماعی زندگی پر انانیت کا مدار ہوگا۔ جب یہ اپنے آپ کو "میں" تصور کرے گا تو اس کے سامنے وہ گروپ آجائے گا جس کا یہ جزء ہے (یعنی مثلاً ملائکہ) اور اس جماعت کی ہستی کے اندر اپنے آپ کو مضمحل پائے گا یعنی اس سے جدا ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر آگے جو زندگی ہے وہ اس طرح اجتماعی طور پر بڑھتی چلی جائے گی۔ محشر میں ایک درجہ طے کرے گا۔ جنت میں یا جہنم میں جدھر جائے گا اس کو جماعت کا ایک حصہ ہو کر رہنا پڑے گا۔ جس وقت تک وہ اپنا سرمایہ ملکیت کا جتنا اسکے پاس ہے اس کو سنبھال لے اور سمجھ جائے اور اس میں زیادتی سے قریب قریب مایوس ہوجائے اور وہ سمجھے کہ بس جو کچھ ہے یہی ہے۔ تو سمجھو کہ محشر کا دن قریب قریب ختم ہوگیا۔ اب یہاں سے نئی زندگی شروع ہوگی جس کا مدار ملکیت ہوگی اور حیوانیت کا ایسا ہی تھوڑا سا تعلق رہے گا مگر اس کا سیدھا کوئی نام نہ ہوگا۔ اس نئی زندگی کی طبعی ترقی کا میدان جنت ہے۔ اس میں ترقی کے لیے جنت کا ایک ایک درجہ آئے گا اور جس طرح سیڑھی پر ایک ایک زینہ طے کرنا پڑتا ہے اسی طرح مدتوں تک جنت کا ایک طریقہ (درجہ) طے کرنا پڑے گا۔ اور یہ ترقی جس کے زمانہ کا اندازہ انسان اس دنیا میں سمجھ نہیں سکتا۔ جاری رہے گی۔ بہت بڑے حکیم اس ترقی کے درجۂ انداز کو سمجھ لیں گے مگر عام لوگوں کو بتلانا اور سمجھانا ان کے واسطے ناممکن ہوتا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ ان کے قریب درجہ والے جو لوگ ہیں (عارف الکامل و راسخ فی العلم) وہ ان کو اشارتاً یا کنایتاً

کچھ سمجھا سکیں۔ جن لوگوں کی طبیعت میں اتنا نصاب نہیں ہے کہ جس سے جنت کا دروازہ کھلتا ہے یعنی وہ اتنے نمبر حاصل نہیں کرتے کہ وہ پاس ہوجائیں اور اتنی ترقی آگے جاری رکھ سکیں ان کو ایک عرصہ تک اعراف میں رکھا جائے گا یعنی جو قابل غور ہیں کہ ان کو موقع ملنا چاہیے کہ وہ جلدی سنبھل جائیں اور درست ہوجائیں۔ اور جو اس سے نیچے ہیں وہ سب جہنم میں داخل ہوجائیں گے۔ وہاں ان کے آپریشن ہوں گے ان کو داغ دیا جائے گا وہ بہت تکلیف اٹھائیں گے تب کہیں ان کے دماغ میں سمجھ کی بات پیدا ہوگی اور اسی طرح وہ جہنم میں ترقی کرتے رہیں گے یعنی وہ آہستہ آہستہ صحت کی طرف آتے جائیں گے۔

* جنت کے داخلے کے لیے جو درجہ ہے اس کو جو جماعت پورا کرلے گی وہ دوزخ سے نکال دی جائے گی۔ اسی طرح ہوتے ہوتے ایک ایسا زمانہ آجائے گا کہ دوزخ میں ایک آدمی بھی نہیں رہے گا اب دوزخ بالکل ختم کردی جائے گی اس لیے دوزخ کا وجود صرف اس لیے تھا کہ انسانیت کے نقائص یعنی جو بیماریاں ہیں ان کی صحت اور تندرستی کے لیے یہ ایک موقع تھا مگر دنیاوی حساب سے (یعنی اس دنیا کے سالوں کے حساب سے) یہ وقت (جس میں کہ جہنم میں صحت اور تندرستی ہوسکے) کتنے سالوں میں ہوگا کہ جہنم آخر ختم ہوجائے اس کا صحیح اندازہ لگانا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے بہت بڑا زمانہ ہے سرسری طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جب سے زمین و آسمان بنے اور پھر ان کا نظام قیامت کے دن ٹوٹے تو جتنا زمانہ زمین و آسمان کا ہے اتنا ہی زمانہ جہنم کی عمر کے لیے ضروری ہے۔ اس میں کسی قدر کمی بیشی ہوجائے تو وہ وقتی ضرورتوں کے مطابق ہوگی تو اب شرائع الٰہی میں کسی انسان کو رحمت الٰہی سے مایوس نہیں کیا جاتا اگرچہ وہ جہنمی ہی ہو۔ مگر یہ بھی مقصود نہیں ہے کہ اس کی مدت کو ہلکا دکھایا جائے اور اس طرح دنیا میں انسان کو اس کی ترقی سے پیچھے ڈال دیا جائے جہنم کی تکلیف کو جس قدر کم دکھایا جائے گا اتنا ہی ادنیٰ طبیعت کے لوگ کم ترقی کریں گے اور یہ ان پر ظلم ہوگا۔ ان کو جہنم میں جو تکالیف پیش آئیں گی انکے متعلق صحیح علم دینا چاہیئے تاکہ وہ ان تکالیف سے بچنے کے لیے اسی دنیا میں سامان مہیا کریں۔ جہنم کی تکلیفیں اس قسم کی ہیں جس

طرح انسان کو دنیا میں پیش آتی ہیں جیسے مرض ہے، دشمن کا غلبہ ہے، ضرورت کے وقت سامان کا نہ ملنا ہے، غرض جس طرح اس دنیا میں ضروریات ہیں وہاں بھی اس طرح ضرورتیں ہوں گی فرق اتنا ہے کہ یہاں جس قدر تکالیف ہیں یہ تھوڑی محنت سے زائل ہو سکتی ہیں اور وہاں کی تکالیف زائل کرنے کے لیے بہت محنت اور لمبا زمانہ چاہیے۔ یہاں کی تکالیف عموماً حیوانیت سے تعلق رکھتی ہیں اور وہاں کی تکالیف عموماً ملکیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر لیجئے کہ ایک مٹی (پتھر) کا بت کس قدر زمانہ دراز کے بعد ٹوٹتا ہے اور پھر وہ دریا میں گرتا ہے اور بذات خود پانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر پانی بننے کے بعد وہ ہوا بنتا ہے اور ہوا بننے کے بعد اس میں گیس وغیرہ کا کوئی حصہ باقی رہ جاتا ہے جس میں نورانیت کی زیادہ قابلیت ہوتی ہے پھر وہ آفتاب کے نور کی طرح بنتا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ آفتاب کے نور کو ملکیت کے نور تک پہنچنے کے لیے ایک لاکھ برس کی ضرورت ہے تو اس پتھر کو اس ملکیت تک پہنچنے کے لیے کتنا لمبا زمانہ درکار ہو گا۔ اسی طرح دوزخ کے زمانے کو کم کر کے دکھانا جرم کے مترادف ہو گا۔ البتہ جو لوگ اسے سمجھ ہی نہیں سکتے ان کو صرف اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ فقط دنیاوی مصیبتوں سے نجات حاصل کریں۔ اس واسطے ان کو دوزخ کا معاملہ بتلایا ہی نہیں جاتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں آخرت کا بہت تھوڑا ذکر ہے اور جو کچھ ہے وہ دنیاوی مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے سے متعلق ہے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں آخرت کا ذکر نسبتاً زیادہ ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم میں سب سے زیادہ ہے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت سے کام ایک تھوڑے سے وقت میں پورے کرنے تھے اس واسطے کام کرنے والی (کارکن) جماعت میں زیادہ قوت پیدا کرنے کا یہی ذریعہ تھا کہ اس جماعت کو تمام علم دے دیا جائے اور وہ انتہائی قوت سے کام کرنے لگ جائیں۔

* قرآن مجید کی ایک صفت فصاحت اور بلاغت ہے، لوگوں نے عام طور پر اسے عربی زبان کی فصاحت اور بلاغت پر ڈھال لیا ہے۔ اور اس سے یہ دعویٰ ہونے لگا ہے کہ عربی زبان در حقیقت تمام زبانوں کی ماں ہے۔ اور دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں

کر سکتی۔ اگر دوسری زبان سے اس کا مقابلہ کیا جائے جیسے سنسکرت یا عبرانی تو یہ دعویٰ اتنا روشن نہیں رہتا جتنا خالی عربی پڑھنے والوں کے دماغ میں قائم ہے۔ (اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عبرانی یا سنسکرت کا قطعاً مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو علم ہوجاتا کہ یہ زبانیں بھی کم نہیں ہیں) اس لیے ہم فصاحت اور بلاغت کا یہ مطلب نہیں لیتے۔ آخرت کے امور کو دنیاوی زبان میں بیان کرنا آسان بات نہیں۔ قرآن مجید نے اس میں اس قدر فصاحت استعمال کی ہے کہ جو بھی مطلب ہے وہ ٹھیک سمجھا دیتا ہے۔ اور انسانیت کے تمام طبقوں کے دماغ تک صحیح بات پہنچا دیتا ہے۔ طبقوں سے مراد ہیں اعلیٰ طبقہ، اوسط طبقہ، ادنیٰ طبقہ اور یہ طبقے فقط محنت کے اعتبار سے پیدا ہوتے ہیں۔ اعلیٰ طبقے کو ذرا کم محنت کرنی پڑتی ہے۔ متوسط کو ان سے زیادہ اور ادنیٰ طبقے کو سب سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس محنت سے قطع نظر کرکے دیکھیں تو بات یکساں ہی نظر آئے گی اور یہ بلاغت کا صحیح درجہ ہے۔ قرآن مجید کی عربی زبان بھی نہایت فصیح ہے یعنی دنیا کے باقی لٹریچر سے ممتاز ہے اور عربی زبان کی کوئی کتاب (نثر یا نظم) اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ تو زبان دانی کے لحاظ سے ہم اس کو عربی لٹریچر میں اعلیٰ درجہ دیتے ہیں اور آخرت کو دنیا بھر کی زبانیں (جیسے سنسکرت وغیرہ) اس قدر آسانی سے نہیں سمجھا سکتیں جس قدر آسانی سے قرآن مجید سمجھا دیتا ہے۔ اس میں قرآن مجید کا درجہ نہایت اعلیٰ ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ دنیا کوئی کتاب اس قدر فصاحت و بلاغت کے ساتھ لوگوں تک مسائل کو نہیں پہنچا سکتی۔

* ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ مسیحی دنیا نے کفارہ کا مسئلہ ایجاد کردیا اور آخرت کے ذکر سے جو فوائد حاصل ہوسکتے تھے اس کی قوت کو کم کردیا۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی شفاعت کے مسئلہ میں غلط فہمیاں پیدا کرکے قرآن کے ان بیانات سے جو افادہ حاصل ہوسکتا تھا اسے بہت کمزور کردیا۔ عام مسلمانوں میں قرآن مجید کی نسبت علم حدیث کی زیادہ محبت ہے۔ وہ قرآن مجید میں تھوڑی سی توجہ عربی لٹریچر کے ذریعہ قائم کرسکے یعنی قرآن مجید کو تمام دنیا میں اعلیٰ درجہ کی ادبی کتاب ثابت کرنے میں مسلمان لگے رہے۔ اور اس سے جو مدعا اور مطلب و مقصد حاصل کرنا تھا اس کی طرف توجہ کم

کردی۔ مسلمانوں میں ایک جملہ مشہور ہے کہ مسلمانوں کی آخری زمانہ کی مصیبتیں اس علاج سے دور ہوں گی جس سے پہلے زمانہ میں مسلمانوں نے ترقی کی تھی۔ اس کا درحقیقت مطلب تھا قرآن مجید کی طرف توجہ کرنا۔ مگر لوگوں نے اس کا مطلب بھی حدیث کی طرف توجہ کرنا لے لیا ہے۔ رسول کریم ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت شروع ہوئی۔ ابتدا میں عرب کی بغاوت عام کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس سے فارغ ہو کر روم اور ایران کی مہمیں شروع ہو گئیں اور ابوبکر کی مختصر خلافت میں حدیثوں کی چنداں اشاعت نہ ہو سکی۔ حضرتؓ عمر الفاروقؓ نے سات برس خلافت کی اور ملک میں نہایت امن و امان رہا۔ لیکن وہ دیدہ و دانستہ حدیثوں کی کثرت کو روکتے رہے۔ علامہ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اس خوف سے کہ حدیث بیان کرنے والا آنحضرت ﷺ کی طرف غلط روایت منسوب نہ کردے صحابہ کو ہمیشہ حکم دیتے تھے کہ حدیثیں کم بیان کریں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ابوسلمہ صحابی نے پوچھا کہ آپ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی اس طرح حدیثیں روایت کیا کرتے تھے؟ بولے کہ نہیں، اگر کرتا تو عمرؓ درے مارتے۔ ایک دفعہ گروہ انصار کو کوفہ بھیجا اور چلتے وقت کہا کہ تم لوگ کوفہ جا رہے ہو وہاں ایک قوم سے ملو گے جو بڑی رقت سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں اور وہ تمہارے آنے کا حال سن کر شوق سے تمہیں ملنے آئیں گے اور حدیثیں سننی چاہیں گے تو زیادہ حدیثیں نہ بیان کرنا۔ اسی طرح جو جماعت عراق کو جانے والی تھی، ان کی مشایعت کر کے فرمایا کہ میں نے کیوں تمہاری مشایعت کی؟ تو انہوں نے فرمایا کہ تکرمة علینا (عزت افزائی کے لیے) کہا ہاں لیکن مقصد اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تم جا رہے ہو وہاں لوگ اکثر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تو ان کو حدیثوں میں نہ پھنسانا چنانچہ وہ جماعت جب عراق کو گئی تو لوگ حدیثیں سننے آئے لیکن انہیں جماعت نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ عمرؓ نے منع کیا ہے۔

* امور آخرت کے سمجھنے کے لیے قوی فلسفی دماغ چاہیے۔ معلوم نہیں کیوں مسلمانوں کے عام دماغ کسی منظم عملی نظریہ کی طرف کم متوجہ ہوتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ مخالف لوگوں کے پروپیگنڈے نے مسلمانوں پر بہت برا اثر کیا۔ انہوں

نے مسلمانوں کو بے وقوف بنانا شروع کیا۔ اور یہ بے وقوف بن گئے۔ اس کے علاوہ اس خیال نے بھی مسلمانوں کو بے وقوف بنادیا ہے کہ صوفی منش لوگوں کے ایک طبقہ نے یہ زور سے کہنا شروع کردیا ہے کہ دنیا اور آخرت کو اکٹھا حاصل نہیں کیا جاسکتا یعنی اگر مسلمان آخرت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ دنیا چھوڑ دیں اس فکر کے غلبہ نے مسلمانوں کو عقلی منظم کاموں میں دخل دینے سے پیچھے ڈال دیا۔ حالانکہ صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین جس قدر زاہد منش لوگ تھے (ان کے حالات کتب تاریخ میں ظاہر ہیں) وہ دنیا کے کاموں میں بھی سب سے آگے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ایک صوفی منش آدمی تھے مگر اپنی بڑی تجارت رکھتے تھے اور اس سے محدثین اور فقراء و مساکین کی خدمت کیا کرتے تھے (اس کی اگر تفصیل دیکھنی ہے تو کتاب سیرۃ النعمان مصنفہ علامہ شبلی دیکھ لو)

* شاہ ولی اللہ کا فسلفہ پڑھنے سے ہمیں یہ یقین ہوگیا کہ یہ دونوں پروپیگنڈے غلط ہیں یعنی (۱) مخالف لوگوں کا پروپیگنڈا اور (۲) صوفی منش لوگوں کا یہ کہنا کہ دنیا اور آخرت کو اکٹھا حاصل نہیں کیا جاسکتا اور اسلام میں حکمت جاننے والے لوگوں کا مقابلہ دنیا کی دوسری قومیں آسانی سے نہیں کرسکتیں۔ اس لیے مسلمان حکیم کا پہلا فرض یہ ہے کہ قرآن میں آخرت کے متعلق جس قدر باتیں بیان کی گئی ہیں ان کو منظم کرلے۔ اس سے اس کا دماغ اتنا اونچا ہوجاتا ہے کہ دوسری قومیں آسانی سے وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں۔

* آیت ۱ تا ۵ **اذا السماء انشقت و اذنت لربها و حقت. الایات** قیامت کے واقعہ کو ایک عجیب صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ (۱) آسمان چر جائے گا (۲) اب چر جانے کے بعد یعنی آسمان کی موجودہ صورت ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد اسے کون سی دوسری صورت دی جائے گی؟ وہ اللہ تعالی کے حکم کا منتظر ہوگا۔ (۳) زمین اس کے متعلق ایک قسم کا بڑا تختہ بن جائے گی۔ (۴) زمین کے اندر انسان اور حیوان جو بھی موجود ہیں زمین ان تمام کو باہر نکال دے گی اور خالی ہوجائے گی۔ (۵) اور جب اس میں تبدیلی آجائے گی تو یہ بھی اللہ تعالی کے حکم کی منتظر ہوگی کہ اسے

(زمین) کو اب کونسی صورت و شکل دی جائے گی۔ آیت ٦ **یایھا الانسان انک کادح الایہ** جب زمین و آسمان پر یہ حالت طاری ہوگی تو اس وقت انسان کا کیا حشر ہوگا؟ اس واسطے انسان کو کہا گیا کہ اے انسان! تو ٹھوکریں کھاتے کھاتے اللہ سے ضرور ملے گا اور اس سے تجھ کو کوئی چیز نہیں روک سکے گی۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے رب تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا وہ بیچ میں خواہ لاکھوں ٹھوکریں کھائے، اس کا مضائقہ نہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی ہستی میں ایک نورانی جوہر ہے۔ وہ اسے حظیرۃ القدس کی طرف اس طرح کھینچ کر لے جاتا ہے جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف جاتا ہے انسان کو حظیرۃ القدس میں الٰہی تجلی کے روبرو پہنچنا ضروری ہے۔ وہاں پہنچنا تو اس کی کشش کا نتیجہ ہے اور یہ وہاں جبراً ہوگا اب اگر انسان اپنی فطرت کو اس طرف جانے کے لیے تیار کرلے تو یہ کسی قسم کی ٹھوکریں نہیں کھائے گا اور آرام سے اپنے راستے پر چلتا چلتا پہنچ جائے گا۔ اور اگر اس طرف چلنے سے اپنی فطرت کو الٹا کرلے اور منہ پھیرنے تو اس صورت میں بھی اسے حظیرۃ القدس کی طرف جانا پڑے گا۔ مگر مشکل یہ ہوگی کہ چونکہ یہ الٹے پاؤں جارہا ہے اس واسطے اس طرف راستے میں جہاں کہیں گڑھا آئے گا یہ دھڑام سے گر پڑے گا۔

* آیت ۷ تا ۹ **فاما من کتابہ بیمینہ** جس کسی نے اپنی طبعیت کو حظیرۃ القدس کی طرف جانے کے لیے آمادہ کرلیا اور اپنی طبعیت کو تجلی الٰہی کے روبرو ہونے کے لیے مشتاق بنالیا(۱) اس کے حساب کا کاغذ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا آیت ۸ اس کا حساب آسان ہوگا۔ ں کی وجہ یہ ہے کہ وہ سیدھے راستہ پر جارہا ہے اس واسطے اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی آیت ۹ اور وہ اپنے گھر میں مسرت سے پہنچ جائے گا۔ غرض اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ نیک لوگ تب ہی اپنی نیکی سے فائدہ اٹھائیں گے جب وہ اپنی سوسائٹی کو درست کر رکھیں۔ یہ دونوں (یہ اور اس کے خاندان کے لوگ) اپنی نیکی سے اس راستہ پر آسانی سے پہنچ جائیں گے کیوں کہ انسان اپنی سوسائٹی کا اثر بہت جلد

---

(۱) یعنی نوع انسان کے اکثر افراد اگر مذہبی ہوتے تو انکو اللہ تعالی کے ملنے کی خواہش ہوتی اور وہ اس کے لیے تکالیف برداشت کرتے۔ ان کی یہ کوشش ضرور کامیاب ہوگی۔

قبول کرلیتا ہے۔ آیت۱۰ و اما من اوتی کتابه وراء ظهره اب دوسری جماعت کا ذکر ہے جن کا نامۂ اعمال پیٹھ کے پیچھے سے دیا گیا ہے اس جماعت کا نامۂ اعمال اسے جس طرف کو کھینچتا ہے اس نے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار نہیں کیا (یعنی حظیرۃ القدس کی طرف) یہ الٹے پاؤں جہنم کو کھینچ رہا ہے۔ نامۂ اعمال کے لکھے جانے اور ان کے تولے جانے کے متعلق دو مختلف رائیں ہیں (۱) متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ فی الواقع نامۂ اعمال تولے جائیں گے اور اس سے غرض یہ ہوگی کہ قیامت میں تمام حاضرین پر یہ آشکارا ہوجائے کہ فلاں شخص کے اعمال اچھے ہیں اور فلاں شخص کے برے (۲) حکماء اسلام کی رائے یہ ہے کہ انسان جب کوئی اچھا کام کرتا ہے یا برا کام کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک خاص اثر پیدا ہوتا ہے اور جس قدر یہ افعال مکرر سرزد ہوتے ہیں اس اثر کا نقش گھرا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دل میں نیکی یا برائی کا ایک ملکۂ راسخہ پیدا ہوجاتا ہے اسی کا نام کتابت اعمال ہے۔ اور چونکہ ہر فعل کچھ نہ کچھ اثر پیدا کرتا ہے اس لیے ہر فعل گویا ایک نقش اور تحریر ہے عمل اور وزن تب ہوگا جب نیت اور ارادہ سے ہو۔ آیت۱۱ فسوف یدعو تو وہ اس طرح کے جانے کی نسبت موت کو ترجیح دے گا۔

* آیت۱۲ و یصلی سعیرا اور آگ کے گڑھے میں گر پڑے گا۔ آیت۱۳ انه کان فی اهله مسرورا اس آدمی نے غلط راستہ پر چل کر دنیا میں عارضی مسرت حاصل کرلی تھی اس نے اپنے بال بچوں کو بھی اسی غلط رستہ پر چلایا۔ آیت۱۴و۱۵ انه ظن ان لن یحور یہ سرمایہ پرست آدمی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اس طرح ترقی کرتا جائے گا مگر اللہ تعالی اسے دیکھ رہا ہے اور اسے علم نہیں ہے کہ ظلم کی بنیاد پر جو ترقی ہوگی وہ کبھی نہیں پھولے پھلے گی۔ (اب اگلی حرکت کا نقشہ دیا جاتا ہے) آیت۱۶ فلا اقسم بالشفق دن کی روشنی کا بقیہ ہے جسے شفق کہا گیا ہے۔ موت کے بعد پہلا طبقہ ایسا ہے جس میں اس دنیا کی زندگی کا بقیہ ابھی ساتھ ہی چلا جارہا ہے۔ انسان اس دنیا کے اثرات کو یک لخت نہیں چھوڑ سکتا بلکہ درجہ بدرجہ چھوڑتا چلا جائے گا، اس حصہ کو اصطلاح میں عالم قبر کہا جاتا ہے۔ و اللیل و ما وسق ایک طبقہ ایسا ہے کہ اس

سے دنیا کے اثرات دور ہو گئے جیسے شفق کے بعد رات آتی ہے اس کو اصطلاح میں عالم محشر کہا جاتا ہے۔ و القمر اذا اتسق اندھیری رات کے بعد چاند کی روشنی درجہ وار شروع ہوتی ہے (القمر کہتے ہیں اول دس تاریخ تک) یعنی آج ماہ (چاند) ہلال ہے۔ کل اس سے زیادہ بڑھے گا حتی کہ یہ چودھویں کا چاند ہو جائے گا۔ غرض اسی طرح درجہ وار بڑھتا ہے تو اس واسطے تجلی اعظم کا آنا ہے۔ آیت ۱۹ لتركبن طبقاً عن طبق یہ تینوں چیزیں (آیت ۱۶ تا ۱۸) گواہ ہیں کہ انسان بھی اس طرح درجہ وار ترقی کرے گا یہاں تک کہ انسان اللہ تعالی تک پہنچ جائے گا بس یہی ہے انسانی فطرت۔ آیت ۲۰ فمالهم لايؤمنون یہ لوگ اپنی فطرت پر زور دے کر ان باتوں کو کیوں نہیں مان لیتے۔ آیت ۲۱ و اذا قرء عليهم القرآن اگر انسان کی فطرت ان کی رہ نمائی کے لیے کافی نہیں ہے تو جب ان پر قرآن شریف پڑھا جاتا ہے تو یہ اس کی کیوں نہیں اطاعت کرتے؟ اگر یہ قرآن مجید کو سمجھنے لگیں تو ان کو تمام بات سمجھ میں آجائے گی۔ آیت ۲۲ بل الذين كفروا غرض اس طرح انسانیت دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ ایسا ہے کہ وہ نہ تو اپنی فطرت پر غور کرتا ہے اور نہ قرآن مجید سنتا ہے بلکہ وہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ طبقہ ریا کشنری (Reactionary) ہے۔

* آیت ۲۳ و الله اعلم بما يوعون وہ نورانی جوہر ہے جو ان کے اندر رکھا گیا ہے اللہ تعالی اسے بخوبی جانتا ہے۔ بھلا ان کے انکار کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ انہیں جھک مار کر اس طرف جانا پڑے گا۔ اس کے وعاء میں جو نورانی روح ہے اللہ تعالی اس کو خوب جانتا ہے۔ اس نورانی چیز کو ضائع کرنے سے جو مضرات آئیں گے ان کو بھگتنا پڑے گا۔ آیت ۲۴ فبشرهم بعذاب اليم اس طرح تجھ کو بہت تکلیف ہوگی عذاب الیم سے گزر کر ان کو اللہ تعالی تک پہنچنا پڑے گا۔ ہمارے واعظوں نے یہ غفلت برتی ہے کہ انہوں نے جہنم کی زندگی کو عذاب کی تفصیلات پر ختم کر دیا ہے۔ اور اس طرح حکیم طبیعتوں کو قرآن مجید کی تعلیم سے دور ڈال دیا ہے۔ غرض اس آیت میں اس طبقہ کا ذکر ہے جو نہ فطرت پر غور کرتا ہے اور نہ قرآن مجید کو غور سے سنتا ہے۔ آیت ۲۵ الا الذين آمنوا اب اس طبقہ کا ذکر ہے جو فطرت پر غور کرتا

ہے اور قرآن کو سنتا ہے ان کے لیے مزدوری ہے بے انتہاء۔

* اب صاف مسئلہ یہ ہے کہ انسانی فطرت راستہ میں کہیں گم ہونے والی نہیں ہے مگر ان بارک حقیقتوں کو عام ذہنیت کے نزدیک کرنے کے لیے اس طریقہ سے بیان کیا گیا ہے اب تیسرے درجہ کے عالم ان الفاظ کا صرف ترجمہ کردیں گے اور حکمت کی بات کو تو زبان سے کہہ دیں گے مگر نہ خود سمجھیں گے اور نہ کسی کو سمجھا سکیں گے اور نہ حکماء کو غور کرنے دیتے ہیں قرآن مجید کی تعلیم اس قسم کے علماء میں محصور نہیں ہے۔ حکمت سکھانے کی یہ سب سے اولی درجہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔ دوسری کتابیں تو حکماء کا ایک خاص طبقہ پیدا کردیتی ہیں لیکن اگر قرآن مجید کی تعلیم باقاعدہ رکھی جائے تو تمام نوع انسانی کے واسطے مفید ہے اور قرآن شریف کے سمجھنے کے لیے شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا اور ان کی جماعت کا فلسفہ سمجھنا اس زمانے میں ضروری ہے۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اثْنَتَانِ وَعِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۂ بروج مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بائیس ۲۲ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝۱ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝۲ وَشَاهِدٍ

قسم ہے آسمان کی جس میں برج ہیں ف۱ اور اُس دن کی جس کا وعدہ ہے ف۲ اور اُس کی جو حاضر ہوتا

وَّمَشْهُوْدٍ ۝۳ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝۴ النَّارِ ذَاتِ

ہے اور اُس کی کہ جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں ف۳ مارے گئے کھائیاں کھودنے والے آگ ہے بہت

الْوَقُوْدِ ۝۵ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝۶ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ

ایندھن والی ف۴ جب وہ اُس پر بیٹھے اور جو کچھ وہ کرتے

بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝۷ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا

مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ف۵ اور اُن سے بدلا نہ لیتے تھے مگر اس بات کا کہ وہ یقین لائے

بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ

اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں والا جس کا راج ہے آسمانوں میں اور

الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ

زمین میں اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز ف۶ تحقیق جو

فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ

دین سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو پھر توبہ نہ کی تو اُن کے لیے

عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰ اِنَّ الَّذِيْنَ

عذاب ہے دوزخ کا اور اُن کے لیے عذاب ہے آگ لگنے کا ف۷ بیشک جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

یقین لائے اور کیں انہوں نے بھلائیاں اُن کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں

الْأَنْهٰرُ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ﴿١١﴾ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿١٢﴾

نہریں یہ ہے بڑی مراد ملنی ف۱ بیشک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے ف۲

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴿١٣﴾ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴿١٤﴾ ذُو

بیشک وہی کرتا ہے پہلی مرتبہ اور دوسری ف۳ اور وہی ہے بخشنے والا محبت کرنے والا ف۴ مالک

الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ﴿١٥﴾ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿١٦﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ

عرش کا بڑی شان والا کر ڈالنے والا جو چاہے ف۵ کیا پہنچی تجھ کو بات

الْجُنُوْدِ ﴿١٧﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ﴿١٨﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ

اُن لشکروں کی فرعون اور ثمود کے ف۶ کوئی نہیں بلکہ منکر

تَكْذِيْبٍ ﴿١٩﴾ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿٢٠﴾ بَلْ هُوَ

جھٹلاتے ہیں ف۷ اور اللہ نے اُن کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے ف۸ کوئی نہیں یہ

قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾

قرآن ہے بڑی شان کا ف۹ لکھا ہوا لوح محفوظ میں ف۱۰

سورۃ البروج مکیہ

(آیت ۱و۲ دیکھو آیت ۱۰ کے بعد)

* آیت ۳ **و شاھد و مشھود** اور شاہد و مشہود کو گواہ بتاتے ہیں آگے شاہد و مشہود کی توضیح آتی ہے۔ آیت ۴ تا ۷ **قتل اصحاب الاخدود** ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ یمن میں ایک خدا پرست قوم تھی۔ اتفاقاً ایک مخالف بادشاہ یمن پر حاکم ہوگیا اس نے خدا پرستوں کے طریقۂ عبادت کو بند کرکے اپنا طریقۂ عبادت رائج کرنا چاہا مگر یہ خدا پرست جماعت اس پر راضی نہ ہوئی۔ اس واسطے اس نے ان کو خندق میں جلادیا۔ مومنین یعنی خدا پرست لوگ جو جلائے جارہے ہیں یہی مشہود (آیت ۳) ہیں اور ان کو جلانے والے شاہد ہیں (یعنی حاضر کیے ہوئے) اور حاضر کرنے والے یا دیکھنے والے جن کو دیکھ رہے ہیں وہ مشہود ہیں۔ آیت ۸ و ۹) **و مانقموا منھم** **الایہ** ان کا جرم یہی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے جو زمین و آسمان کا بادشاہ ہے اور اس بادشاہ کی حمد گاتے تھے۔ اس ظالم بادشاہ نے ان خدا پرستوں کو اس جرم میں جلادیا کہ وہ خدا کو مانتے تھے۔ یہ چیز قیامت ہونے کا باعث بنجائے گی کہ جب دنیا میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ لوگ خدا پرستوں کو آگ میں جلادیتے ہیں تو اس کا بدلہ ان کو ضرور ملے گا کہ جو لوگ اس طرح مومنوں کو جلاتے ہیں ان کو بھی جلایا جائے گا۔ آیت ۱۰ **ان الذین فتنوا المؤمنین الایہ** شاہد اور مشہود اس بات پر گواہ ہیں کہ جن لوگوں نے خدا پرستوں کو جلادیا ان کو بھی جلادیا جائے گا یہ ہے جواب قسم کہ قسم اس واسطے کھائی جارہی ہے۔ آیت ۱و۲ **و السماء ذات البروج و الیوم الموعود** آیت ۳ میں قسم کھائی گئی ہے اب آیات ۱و۲ میں آیت ۳ سے پہلے دو قسمیں ہیں اب ان کی کیفیت بتلائی جارہی ہے۔ (۱) بروج کا ترجمہ اصطلاحی طور پر ۱۲ برج کا ہے۔ مگر اس جگہ آسمان کے ۱۲ برج مراد نہیں ہیں۔ یہ جو علم ہیئت کی اصطلاح ہے کہ آسمان کے ۱۲ برج (حصے) بناکر آسمان کے ۱۲ حصے کیے گئے ہیں ان کو

اہل عرب نہیں جانتے۔ بروج کے معنی ہیں ظاہر ہونے والی چیز۔ ہر ستارہ ظاہر ہونے والی چیز ہے۔ اس واسطے آیت کا ترجمہ ہوگا ستاروں بھرے آسمان کی قسم۔ وہ قوم جنہوں نے ان خدا پرستوں کو جلادیا تھا وہ غالباً ستارہ پرست تھے۔ اہل ایران اگرچہ آتش پرست تھے مگر ان کے فرقے ستارہ پرست بھی تھے اور تاریخی طور پر ثبوت ملتا ہے کہ بارہا ان کا قبضہ یمن کے ملک پر ہوا حتیٰ کہ جس وقت اسلام آیا اس وقت بھی یمن کا حاکم ایرانی وائسرائے تھا۔ نجوم کے ماننے والے لوگ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اگر ستاروں کی وضع ایسی واقع ہو جو ایک قوم کے لیے مضر پڑے کہ وہ جلانے کا باعث ہوئی تو اس کا رد عمل ضروری ہے پھر ستاروں کی ایک ایسی وضع بنے گی کہ جلانے والوں کی (جنہوں نے جلایا) نسل کو وہ ضرور جلادے گی۔

* غرض **والسماء ذات البروج** بھی اس بات پر گواہ ہے کہ جن لوگوں نے ان خدا پرستوں کو جلایا ہے وہ بھی ضرور جلائے جائیں گے۔ آیت ۲ **و الیوم الموعود** اور کتب الٰہیہ کو ماننے والے (توریت و انجیل) جو قیامت اور یوم الموعود کو ماننے والے ہیں وہ بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ جن لوگوں نے ان خدا پرستوں کو جلادیا وہ بھی ایک دن اسی طرح جلائے جائیں گے۔ (آیت ۳ تا ۱۰ دیکھو شروع سورت میں)

* آیت ۱۱ **ان الذین آمنوا و عملوا** جو لوگ جلائے گئے اور انہوں نے اس قدر استقامت دکھلائی اور ثابت قدم رہے ان کے لیے جنت ہے اور یہ بڑی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس آیت ۱۵ کو آیت ۱۰ کے ساتھ ملادینا چاہیے تاکہ یہ دونوں آیات جواب قسم بن جائیں۔ (آیت ۱۲ تا ۲۰ دیکھو آیت ۲۱ و ۲۲ کے بعد) آیت ۲۱ و ۲۲ **بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ** جو حکم آیت ۱۰ و ۱۱ میں دیا گیا ہے وہی حکم قرآن مجید میں ہے جو آیت ۲۲ محفوظ ہے۔ غرض یہ سورت نوع انسانی کی بدامنی سے قیامت پر استدلال بنے گی۔ آیت ۱۲ و ۱٦ (اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے) **ان بطش ربک لشدید انه ھو یبدء و یعید. الی قوله تعالی فعال لما یرید** ان آیات میں اسماء الٰہی کا ذکر ہے اور مختلف اسماء کے اثر ظاہر ہونے کے لیے دنیا میں مختلف چیزیں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ آیت ۱۰ **ان بطش**

الایہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نام لینے والوں کو محض اس وجہ سے تکلیف دیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نام لیتے ہیں ان پر تیرے رب کا حملہ بہت سخت ہے۔ آیت ۱۳ **انہ ھو یبدء الایہ** وہ نیا (پہلی دفعہ) اور دوبارہ پیدا کرسکتا ہے اب اگر ظالموں کو سزا دینے کے لیے دوبارہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے تو وہ انکو دوبارہ پیدا کردے گا۔ اس کے لیے یہ مشکل نہیں ہے۔ آیت ۱۴ **و ھو الغفور الایہ** اگر انسان جرم کرکے اس سے معافی مانگے تو وہ بخش دیتا ہے اور اس انسان کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا ہے۔ آیت ۱۵ **ذو العرش المجید** اللہ تعالیٰ بڑی عزت والے تخت کا مالک ہے یعنی اس کی حکومت میں ظلم کی کہیں بھی گنجائش نہیں ہے۔

* آیت ۱۶ **فعال لما یرید** اس کے تمام کام اور اس کا ارادہ حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ بعض آدمیوں کو دنیا میں فوراً جزا مل جاتی ہے اور بعض کو آخرت (قیامت) تک تاخیر ہوجاتی ہے اور ان کو دوبارہ پیدا کرکے سزا دی جائے گی۔ اس میں مختلف آدمیوں کی آمیزش کا اثر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو آج سزا دی جائے تو اس کے ساتھ بعض بے گناہ بھی سزا پاجائیں گے۔ اس واسطے انکی سزا موخر ہوجاتی ہے جب تک کہ بے گناہ آدمی ان سے علیحدہ نہ ہوجائیں۔ آیت ۱۷و۱۸ **ھل اتاک حدیث الجنود** اگر کوئی آدمی اس خیال سے طاقت پیدا کرلے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرلے گا تو یہ باطل خیال ہے۔ اس واسطے مثال کے طور پر کہا کہ دیکھو فرعون اور ثمود کی بڑی بڑی جماعتیں کس طرح ہلاک کردی گئیں۔ آیت ۱۹ **بل الذین کفروا الایہ** جاہل لوگ اس جزا کے نظام کا انکار کرتے ہیں۔ آیت ۲۰ **و اللہ من ورائھم محیط** اور اللہ تعالیٰ ان کو گھیرے ہوئے ہے اور وہ کسی طرف نکل نہیں سکتے غرض ان کو سزا کا ملنا ضروری ہے۔ آیت ۲۱و۲۲ **بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ** اور یہ قانون اٹل ہے کسی جبر اور زور سے ٹل نہیں سکتا۔ بڑی عزت والا قانون، جو ان کو بڑی عزت سے پڑھتے ہیں۔ اور یہ قانون پختہ اور مضبوط بورڈ (محفوظ) پر لکھا ہوا ہے کہ کوئی طاقت اسکو مٹا نہیں سکتی اور نہ بدل سکتی ہے ان کے خلاف چلنے والے ذلیل اور برباد ہوجائیں گے۔

سُورَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعَ عَشْرَةَ آيَةً

سورۂ طارق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی سترہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے ★

وَالسَّمَاۗءِ وَالطَّارِقِ ﴿١﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿٢﴾ النَّجْمُ

قسم ہے آسمان کی اور اندھیری میں آنیوالے کی اور تونے کیا سمجھا کیا ہے اندھیرے میں آنے والا وہ تارا

الثَّاقِبُ ﴿٣﴾ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿٤﴾ فَلْيَنْظُرِ

چمکتا ہوا کوئی جی نہیں جس پر نہیں ایک نگہبان اب دیکھ لے

الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ﴿٥﴾ خُلِقَ مِنْ مَّاۗءٍ دَافِقٍ ﴿٦﴾ يَّخْرُجُ مِنْ

آدمی کہ کاہے سے بنا ہے ف۱ بنا ہے ایک اچھلتے ہوئے پانی سے ف۲ جو نکلتا ہے

بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَاۗىِٕبِ ﴿٧﴾ اِنَّهٗ عَلٰي رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ﴿٨﴾ يَوْمَ

پیٹھ کے بیچ سے اور چھاتی کے بیچ سے ف۳ بیشک وہ اس کو پھیر لا سکتا ہے ف۴ جس دن

تُبْلَى السَّرَاۗىِٕرُ ﴿٩﴾ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴿١٠﴾ وَالسَّمَاۗءِ ذَاتِ

جانچے جائیں بھید ف۵ تو کچھ نہ ہوگا اس کو زور اور نہ کوئی مدد کرنے والا ف۶ قسم ہے آسمان چکر

الرَّجْعِ ﴿١١﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿١٢﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿١٣﴾

مارنے والے کی ف۷ اور زمین پھوٹ نکلنے والی کی ف۸ بیشک یہ بات ہے دو ٹوک

وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿١٤﴾ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَّاَكِيْدُ

اور نہیں یہ بات ہنسی کی ف۹ وہ لگے ہوئے ہیں ایک داؤ کرنے میں اور میں لگا ہوا ہوں

كَيْدًا ﴿١٦﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿١٧﴾

ایک داؤ کرنے میں سو ڈھیل دے منکروں کو ڈھیل دے ان کو تھوڑے دنوں ف۱۰

سورۃ الطارق مکیہ

* قرآن مجید میں یہ ذکر بار بار آتا ہے کہ انسان کو قیامت کے دن دوبارہ پیدا کیا جائے گا یہ سورت اسی مسئلہ پر روشنی ڈالنے والی ہے۔ آیت ۱ و السماء والطارق آسمان اور روشن ستارہ گواہ ہے۔ آیت ۲ و ۳ و ما ادراک ما الطارق النجم الثاقب(۱) اس آیت میں طارق کا ترجمہ خود قرآن مجید نے کردیا کہ وہ روشن ستارہ ہے (جو رات کے پہلے حصہ میں مشرق کی طرف سے عموماً نکلتا ہے) یا سورج ہے۔ آیت ۴ ان کل نفس الایہ یہ دونوں اس بات کے گواہ ہیں کہ ہر انسان کے اوپر ایک محافظ طاقت ہے جس طرح چمکنے والا ستارہ اپنی روشنی کو اپنے ساتھ ہمیشہ محفوظ رکھتا ہے اور ستارہ کے غروب (دن کے وقت) ہوجانے سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ستارے کی روشنی غائب ہوگئی بلکہ وہ دوسری شام کو اپنی تمام روشنی سے دوبارہ نمودار ہوجاتا ہے۔ اسی طرح انسانی روح سونے کے بعد انسانی نظروں سے غائب ہوجاتی ہے۔ مگر اس کے سنبھالنے والی طاقت اور نگہبانی کرنے ولی قوت آسمان میں محفوظ ہے اس واسطے وہ مرنے والی روح ضائع نہیں ہوتی بلکہ محفوظ رہتی ہے۔ آیت ۵ فلینظر الانسان اب باقی رہا انسان کا جسم۔ اس کے واسطے انسان کو پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ انسان خود کس طرح پیدا ہوا؟ آیت ۶ و ۷ خلق من ماء دافق یخرج من بین الصلب والترائب ایک کودنے والے پانی سے پیدا ہوتا ہے اور بین الصلب والترائب کا ایک ترجمہ تو یہ ہے کہ مرد کی پشت اور عورت کے سینہ سے جو منی نکلتی ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ مرد کی پشت اور سینہ سے اور عورت کی پشت اور سینہ سے یہ منی نکلتی ہے (یعنی منی مرد اور عورت دونوں کی پشت اور سینہ کے اندر سے نکل رہی ہے) یہ دوسرا ترجمہ آج کل کی سائنس کے زیادہ قریب ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس دوسرے ترجمہ کا رواج سب سے پہلے مولوی نورالدین

---

(۱) النجم الثاقب سے بعض مفسرین مراد سورج لیتے ہیں کہ وہ لوگوں کو جگاتا ہے نیند سے۔

نے دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ترجمہ دوسری تفسیروں میں پہلے ہی سے موجود ہے۔
آیت۸ انه علی رجعه لقادر جس طرح انسان کا بدن پانی سے پیدا ہوا اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کو دوبارہ پیدا کرسکتا ہے۔ وہ ایسی تمام قوتیں جمع کردے جو نطفہ میں تھیں تو انسان پھر پہلی کی طرح پیدا ہوجائے گا۔

* آیت۹و۱۰ یوم تبلی السرائر جب مخفی قوتوں کو ظاہر کردیا جائے گا تو ان کو چھپانے کے لیے کسی کی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ پہلی زندگی (دنیاوی) اور اخروی زندگی میں یہ فرق ہوگا کہ انسان پہلے جو کچھ کرچکا ہے (اعمال) اس میں اب اخروی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا یہ بات کہ اللہ تعالیٰ (آیت۶) انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اسے آیت۱۳و۱۴ میں کہا گیا ہے کہ یہ قطعی طور پر طے شدہ بات ہے اور یہ مذاق نہیں ہے انه لقول فصل و ما هو بالهزل یہی فیصلہ شدہ بات ہے اور مسخرگی نہیں کیونکہ وہ ضرور دوبارہ پیدا کردیا جائے گا۔ آیت۱۱و۱۲ و السماء ذات الرجع و الارض ذات الصدع قطعی طور پر ہونے کے لیے شہادت پیش کی گئی ہے کہ یہ ضرور دوبارہ پیدا ہوگا۔ آیت۱۱ و السماء ذات الرجع سے بار بار روشن کرنے والا آسمان مراد ہے۔ و الارض ذات الصدع سے فصل پیدا کرنے والی زمین مراد ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان کو بنایا وہ پھر ایسی بارش کردے گا کہ انسان کو دوبارہ پیدا کرلے۔ اس واسطے اب اس میں کس بات کا تردد ہے؟ اس میں ایک بات بہت ضروری ہے کہ جو چیز دوبارہ بنتی ہے وہ پہلی چیز یعنی اصلی چیز نہیں ہوتی بلکہ وہ پہلی چیز کی مثل ہے۔ اس طرح قیامت کے دن انسان کو جو دوبارہ جسم دیا جائے گا وہ اس دنیاوی جسم کا اصل جسم نہیں ہوگا بلکہ اس کی مثل ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو دوبارہ پیدا کرنے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔

* آیت۱۵ انهم یکیدون کیدا یہ لوگ خاص قسم کی تدبیریں کرتے ہیں یعنی مسئلہ قیامت کو مشکوک بنانے کے لیے نئے نئے شبہات کھڑے کرتے ہیں۔ آیت۱۶ و اکید کیدا اور اللہ تعالیٰ بھی ان کے مقابلے میں نئے تدبیر کردیتا ہے کہ ان کے تمام شبہات کو دور کرنے کے لیے قرآن مجید میں ایک نئی سورت نازل کردی جاتی

ہے تاکہ ان کے ہر قسم کے شبہات دور ہو سکیں۔ آیت ۱۷ **فمهل الكافرين** ظاہر میں یہ پوزیشن تکلیف دہ ہے اس واسطے آنحضرت ﷺ کو کہا گیا ہے کہ تم اس کو برامت مناؤ، ان کو مہلت دیتے جاؤ ایک زمانہ تک جہاں تک یہ چاہیں انہیں شبہات دور کرنے کے لیے مہلت دیتے جاؤ تاکہ یہ اپنے شبہات دور کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جس قدر اس مسئلہ کے پہلو پر قرآن مجید میں بحث ہو گی اسی قدر یہ مسئلہ واضح اور مکمل ہوتا جائے گا۔ اگر ان کافروں کو اس کے باوجود ہدایت نہ ہو تو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے مگر بعد میں آنے والی قوموں کے لیے قرآن مجید کی رہنمائی مکمل ہو جائے گی۔ اب اگلی ۹ سورتوں میں اقرء باسم ربک تک انسانیت پر بحث ہے انسانیت کے جو طبعی تقاضے ہیں ان کو واضح کر دیا جائے گا اس کے بعد میں یعنی اقرء باسم ربک سے قرآن مجید کے آخر تک کی سورتوں میں قرآن مجید کا لب لباب یعنی خلاصہ بتلادیا گیا ہے۔ اور ان سورتوں میں نتیجہ کا اظہار ہو گا۔

سُوْرَةُ الْاَعْلٰى مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۂ اعلیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ☆

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴿۱﴾ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۲﴾ وَالَّذِيْ
پاکی بیان کر اپنے رب کے نام کی جو سب سے اوپر ف۱ جس نے بنایا پھر ٹھیک کیا ف۲ اور جس نے

قَدَّرَ فَهَدٰى ﴿۳﴾ وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ﴿۴﴾ فَجَعَلَهٗ
ٹھہرا دیا پھر راہ بتلائی ف۳ اور جس نے نکالا چارا پھر کر ڈالا اس کو

غُثَاۗءً اَحْوٰى ﴿۵﴾ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَاۗءَ
کوڑا سیاہ ف۴ البتہ ہم پڑھائینگے تجھ کو پھر تو نہ بھولیگا مگر جو چاہے

اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ﴿۷﴾ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ﴿۸﴾
اللہ ف۱ وہ جانتا ہے پکارنے کو اور جو چھپا ہوا ہے ف۲ اور سہج سہج پہنچائینگے ہم تجھ کو آسانی تک ف۳

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ﴿۹﴾ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿۱۰﴾ وَ
سو تو سمجھائے اگر فائدہ کرے سمجھانا ف۴ سمجھ جائیگا جس کو ڈر ہوگا ف۵ اور

يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ﴿۱۱﴾ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴿۱۲﴾ ثُمَّ
یکسو رہیگا اس سے بڑا بدقسمت وہ جو داخل ہوگا بڑی آگ میں ف۶ پھر

لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۱۳﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ
نہ مریگا اس میں اور نہ جئے گا ف بیشک بھلا ہوا اس کا جو سنورا ف اور لیا اس نے

اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۱۶﴾ وَالْاٰخِرَةُ
نام اپنے رب کا پھر نماز پڑھی ف۹ کوئی نہیں تم بڑھاتے ہو دنیا کے جینے کو اور پچھلا گھر

خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۷﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ ع ۱۹ ۱۲
بہتر ہے اور باقی رہنے والا ف یہ لکھا ہوا ہے پہلے ورقوں میں صحیفوں میں ابراہیم کے اور موسیٰ کے

سورۃ الاعلیٰ مکیہ

* تمام ادیان اور تمام شریعتوں کی حکمت اس وقت تک واضح نہیں ہوتی جب تک کہ انسانی نوع کے خواص پر اور اس کے طبعی تقاضوں پر پوری نظر نہ ڈال لی جائے یہ علم شریعت در حقیقت انسانی تقاضوں کی تکمیل کی ایک صورت ہوتی ہے اب اس سورت میں اس کو پیش نظر رکھ کر تمام شریعتوں کی حکمت واضح کردی گئی ہے۔ انسان کو جو انعامات ملے اگر جسمانی ہیں تو انہیں اللہ تعالیٰ کے اسم عظیم کا فیض سمجھنا چاہیے اور اگر علمی اور روحانی ہیں تو انہیں اسم اعلیٰ کا اثر ماننا چاہیے جسمانی انعامات سورۃ الواقعہ میں ذکر ہوچکے ہیں وہاں ہے فسبح باسم ربک العظیم تو یہ جسمانی فیض، اسم عظیم اور صفت عظیم کے اثرات ہیں اور اس سورت میں علمی اور روحانی فیض کا ذکر ہے تو یہ فیض اسم اعلیٰ کا ہے۔ تو جسمانی انعام کے شکریہ میں رکوع ہے، رکوع نصف سجدہ ہے، سجدہ تلاوت اس میں ادا ہوجاتا ہے۔ اس میں سبحان ربی العظیم پڑھنا مسنون ہے۔ اور روحانی انعام کے شکریہ میں سجدہ ہے اس میں سبحان ربی الاعلیٰ کہنا مسنون ہے۔ انسان کو دونوں طرف متوجہ ہو کر کام کرنا چاہیے۔

* انسان کو علم دینے کا پہلا ذریعہ ہیں اندرونی قوتیں جیسے حس اور عقل وغیرہ اور دوسرا ذریعہ ہے باہر سے الہام اور وحی۔ تو اس اندرونی اور بیرونی نظام کا ایسا تطابق ہے کہ اس نظام پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا اس لیے اس سورت کو اس حکم سے شروع کیا گیا ہے کہ سب سے زیادہ انعام روحانی ہے۔ جب انسان کو ملے تو شکرانے کے لیے سجدہ میں گرے۔ آیت ۱ **سبح اسم ربک الاعلیٰ** اپنے رب کی پاکی بیان کر یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم دینے کے لیے جو نظام قائم کیے ہیں وہ تمام بے عیب ہیں۔ آیت ۲ **الذی خلق فسوی** اس نے پیدا کر کے تمام اندرونی قوتیں (جیسے حس وغیرہ) پیدا کردیں۔ اس کی تفسیر سورۃ انفطار میں زیادہ تفصیل سے بیان کی جاچکی ہے۔ آیت ۳ **والذی قدر فھدی** صورت نوعیہ انسانی کے خواص

جیسے ہر انسان کے ذاتی خواص ہوتے ہیں اسی طرح جماعتوں کے خاصے ہوتے ہیں۔ اس اجتماعی ترقی میں آخری نقطہ اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کو ملا دیا جائے اس نوع انسانی کے لیے طبعی خواص ہیں جو اس کو دوسرے نوع سے ممتاز کر دیتے ہیں۔ ان میں تبدیلی ناممکن ہے۔ اس نوع کے جو افراد ہیں ان کی یہی تقدیر ہے اور وہ اس سے باہر نہیں جاسکتے۔ کوئی فرد اپنی نوع کے حکم سے باہر نہیں نکل سکتا۔ تو ہر فرد کی ترقی کا یہی راستہ مقرر ہے کہ وہ اپنی نوع کے خواص اپنے اندر زیادہ سے زیادہ پیدا کرے۔ اس کی رہنمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام آتے ہیں کہ ہر انسان کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اندر اپنی نوع کے خواص زیادہ سے زیادہ پیدا کرسکیں اگرچہ کوئی فرد اپنی استعداد سے زیادہ ترقی نہیں کرسکتا مگر انسانی انانیت اس کی مقتضی ہے کہ وہ اپنے لیے اسی چیز کو اپنی ترقی سمجھے جسے اس نے خود اپنی کوشش سے حاصل کیا ہو۔ تو انبیاء علیہم السلام کے طریقہ سے لوگوں کو موقع دینا کہ وہ اپنی ترقی کریں یہ اس انانیت کے تقاضا کی تکمیل ہے۔ ان میں جو قوی ودیعت ہیں ان کی ترقی اور حفاظت جن اسباب سے ہوتی ہے اس کی طرف اس نوع کو ہدایت کردی۔ جیسے مرغی اپنے بچے پالتی ہے اس نوع کو اس طرف ہدایت کی۔ آیت ۴ و ۵ والذی اخرج المرعیٰ انسان کے بعد درجہ ہے حیوان کا، حیوانی جنس کے لیے چراگاہ وغیرہ ضروری ہیں چراگاہوں میں سبزہ اتنا پیدا ہوتا ہے کہ حیوان اپنا پیٹ بھر سکیں۔ حیوان اپنی کوشش سے چراگاہ پیدا نہیں کرسکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حیوان کو پیدا کرنے سے پہلے سبزہ زار میدان بنادیے فجعلہ غثاء احویٰ جب سبزہ کا موسم نہیں ہوتا تو اسی سبزہ کو خشک کیا جاتا ہے۔ اور وہ حیوان کے کام آتا ہے۔ آیت ۶ سنقرءک فلاتنسیٰ ہم تجھے پڑھائیں گے یعنی تم پر علم کی بارش ہوگی۔ حیوانوں کی چراگاہوں کے نظام پر قیاس کرکے دیکھے کہ انسان کو جس گھاس کی (سامان زندگی کی) ضرورت ہوگی، کیا اللہ تعالیٰ اس کے واسطے مہیا نہیں کرے گا؟ انسان کی عقل کے لیے حظیرۃ القدس میں سبزہ (ضرورت زندگی) کے میدان تیار کردیے گئے ہیں۔ اور ضرورت کے مطابق اس جگہ (حظیرۃ القدس) سے عقلی علوم انسان پر اترتے رہتے ہیں۔

جس طرح آفتاب کی شعاعیں زمین پر اترتی رہتی ہیں اور زمین کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں اسی طرح حظیرۃ القدس یعنی علم کے آفتاب سے انسان پر علم کی شعاعیں ہمیشہ پڑتی رہتی ہیں جو اس کی حاجت روائی کرتی رہتی ہیں۔ یہ جو الہام کی بارش ہوتی ہے یہ ہر انسان پر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہے اور اس کا فیض انسانی نوع میں ہر انسان کو کسی نہ کسی طرح ملتا ہے۔

* انبیاء کو اور انسانوں سے ممتاز سمجھنے کے لیے ایسی مثال سمجھ لو کہ جیسے پہاڑ ہیں کہ وہاں پانی اور برف پڑتی رہتی ہے۔ وہ ایسے اونچے ہیں کہ وہاں برف کے تودے کے تودے پڑے رہتے ہیں اور نیچے نہایت نشیبی جگہ میں آبادی کی زمینیں ہیں اور گھاس کے میدان ہیں، برف کا پانی پہاڑ کی رگوں میں جمع ہوجاتا ہے اور پھر وہاں سے پانی کے چشمے بن کر یا دریا بن کر نکلتے ہیں اور میدانوں کو سیراب کرتے ہیں اور انسان اپنے کھیت کو وہاں سے پانی دینے کے سامان کرلیتے ہیں اور وہاں سے نالے نکالتے ہیں بعض نہریں ایسی بنائی جاتی ہیں جو دریا میں اگر جوش ہو تو جاری ہوسکتی ہیں اور بعض نہریں ایسی ہوتی ہیں کہ ہمیشہ دریا سے پانی لیتی رہتی ہیں اور میدانوں کو سیراب کرتی رہتی ہیں اور بارش اگر میدان میں ہوتی ہے تو اس کا پانی تھوڑی دیر ٹھہر کر ختم ہوجاتا ہے۔ اور انبیاء زمین پر اس علم کے مخزن بن جاتے ہیں جن سے چشمے پھوٹ کر نکلتے ہیں اور فیض کے دریا بہتے رہتے ہیں۔ **فلاتنسیٰ الا ماشاء اللہ** اللہ تعالیٰ کو جس قدر منظور ہے اس کو تو نہیں بھولے گا یہ بھولنا اور نہ بھولنا اس خزانے کی طرف اشارہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا فیض ان کی زندگی میں ان کی امت پر رہتا ہے اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے علم کا فیض ان کی امتوں پر برابر رہتا ہے۔ قومیں اسی قدر (اتنی) ترقی کرسکتی ہیں جس قدر (جتنا) کہ ان کے انبیاء کے پاس علم کا خزانہ ہو۔ مگر اس میں صرف ایک استثناء ہے الا ماشاء اللہ یعنی کسی قدر بھول جائیں گے۔ بعض اہل علم نے اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت مراد لی ہے یعنی اظہار شان قدرت الٰہی ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ کچھ بھول بھی جائیں گے۔ مگر ہم اسے اصلی معنی میں بھی استثنا بنالیتے ہیں۔ جیسے سبز گھاس جب سوکھ جاتی ہے تو اس میں سے کچھ نہ کچھ چیز تو نکل جاتی ہے۔ نبی

کی زندگی میں علم تروتازہ رہتا ہے۔ اور اس کے بعد جب اس کی امت کے پاس وہ علم پہنچ جاتا ہے تو اس کی کیفیت خشک گھاس کے مانند ہوتی ہے اور اس کی روحانی قوت کسی قدر کم ہوجاتی ہے۔ اگر اس کمی کو اس استثنا کا مصداق بنادیا جائے تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ انه یعلم الجهر و مایخفیٰ جہر سے مراد ہے امت کا ظاہری کام بالفعل اور مایخفی سے مراد ہے امت کی استعداد۔ نبی یعنی آنحضرت ﷺ سے آگے فیض لینے والی جو قومیں ہیں ان کی ظاہری اور باطنی استعداد کے متعلق اللہ تعالی جانتا ہے کہ وہ کتنا علم رکھ سکتے ہیں اور کس قدر علم وہ بھول جائیں گے تو یہ استثناء کی حکمت آجائے گی۔

* آیت۸ و نیسرک للیسری انسانی تعلیم کے واسطے دو راستے ہیں ایک آسان اور دوسرا مشکل شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر بڑی بحث کی ہے اور ان دونوں راستوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آسان راستے کا مطلب یہ ہے کہ اول تو انسانی فطرت میں کوئی نقص پیدا نہ ہو۔ اصل فطرت میں جتنی چیز جہاں ضروری ہے اسی نسبت سے اس کو چیزیں ملنی چاہئیں۔ یعنی ہر ایک چیز (دل، دماغ وغیرہ) اپنے تناسب سے ہو ایسا نہ ہو کہ بدنی قوت تو زبردست ہو اور دماغ بہت کمزور ہو۔ اس کو اس طرح پرکھنا چاہیے کہ فطرت اپنی حقیقت پر ہو اور اس میں نقص نہ آئے۔ اب اگر علم اس فطرت کے مطابق دیا گیا ہے تو یہ آسان راستہ ہے۔ مثلاً جہاں عقلی چیزوں کی جتنی زیادہ ضرورت ہے اسی قدر وہ زیادہ دی گئی ہیں اور اس طرح ان کا تناسب قائم رکھا گیا۔ اب ایک علم ہے کہ جذبات سے بھرپور ہے اور عقل سے کم ہے تو صحیح فطرت والے انسان کے لیے یہ راستہ مشکل ہوجائے گا۔ اب آسان راستے کی تفصیل یہ ہے کہ اس میں عقل سب سے زیادہ ہو۔ کوئی چیز ایسی نہ بتائی جائے جسے عقل اپنا نہ سمجھ سکے اور اسے اپنا نہ بنا سکے۔ جذبات اس کے دوسرے درجہ پر ہونے چاہئیں۔ (اول درجہ عقل اور دوسرا درجہ جذبات) مطلب یہ ہے کہ جذبات، عقل کے تابع رہیں اور اگر جذبات عقل پر غالب آگئے تو یہ غلط طریقہ ہوگا۔ اس کے بعد انسان کی جو معاشی زندگی ہے اس کا نظام جذبات کے نظام سے بھی کمزور ہونا چاہیے۔ اس راستہ پر

نوع انسانی کے تمام افراد آسانی سے ترقی کرتے جائیں گے رسول کریم ﷺ کے طریقہ کا یہ عنوان ہے یعنی آپکو یہ شریعت دی گئی ہے غرض جہاں تک ہم نے سمجھا ہے اس میں یہ اصول نکلتا ہے کہ علوم شرعیہ کی حقانیت، فطرت کی مطابقت سے سمجھی جایا کرے گی۔

* آیت۹ **فذکر ان نفعت الذکریٰ** اب فرمایا کہ اگر تو سمجھے کہ لوگوں کو فائدہ ہوگا تو ان کو سمجھا آیت۸ میں تھا کہ جو قاعدہ بتلایا گیا ہے اس قاعدہ کے اندر اب رسول کریم ﷺ کا فرض معین ہوتا ہے۔ اگر کوئی فرد انسانی اس فطرت نوعی سے مخالف طبعیت رکھتا ہے تو اس کو سمجھانا نبی کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ انسان جس قدر صحیح فطرت کا مالک ہے، اس صحیح فطرت کی تکمیل کرادینا نبوت کا فرض ہوگا۔ جس قدر زمین زراعت کے قابل ہے اگر وہاں بارش کا پانی پہنچ گیا تو وہ ان کو سیراب کردے گا۔ مگر جو زمین زراعت کے ناقابل ہے وہاں پانی کا پہنچنا نہ پہنچنا برابر ہے۔ **سیذکر من یخشیٰ** اس سے وہ آدمی ضرور فائدہ اٹھائے گا جو عاقبت اندیش ہے۔ عاقبت اندیش اسے کہا جاتا ہے کہ خطرہ پیدا ہونے سے پہلے اس خطرہ کی مدافعت کی تیاری کرلے۔ اور یہ حالت اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ انسان ہر بات اور معاملہ کو صحیح طور پر نہ سوچے، دماغ کی اعلیٰ قابلیت کا یہی معیار ہے کہ جو واقعات پیش آرہے ہیں ان کے مستقبل کے متعلق سوچے اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے وہ صحیح نکلے۔ عاقبت اندیش میں ہمیشہ فقط ڈر کا پہلو ملحوظ نہیں ہوتا بلکہ وہ مفید چیزیں بھی سوچ لیتا ہے مگر حکمت کے قواعد کی ایک اصولی بات ہے کہ انسان کا ضرر سے بچنا بہت بڑا نفع ہے۔ اسکے بعد جو نفع ہوگا وہ دوسرے درجہ کا رہے گا۔ یعنی انسان اب جس قدر نفع حاصل کرے گا وہ ضرر سے بچنے کے بعد (یہ اول درجہ ہے) دوسرے درجہ پر رہے گا۔ اسی قاعدہ کے مطابق عاقبت اندیش اس کو کہا جاتا ہے کہ یہ ڈرنے والا ہے۔ یعنی ضرر سے بچنے کی اس میں پوری قوت موجود ہے اس لفظ کو قرآن مجید عالم کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے قرآن مجید میں ہے **انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء** (نظام قدرت الہیہ) میں عاقبت اندیشی کے ماہر ہی عالم ہیں قرآن مجید عالم کا لفظ کسی

دوسرے پر اطلاق نہیں کرتا۔

* آیت ۱۱ و یتجنبها الاشقیٰ جو لوگ بد نصیب ہیں وہ اس تعلیم سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے اگر نبی کا یہ فیصلہ ہو کہ فلاں آدمی سمجھ نہیں رکھتا اس واسطے نبی کو اس کی طرف مخاطب نہیں ہونا چاہیے تو ممکن ہے کہ نبی کا یہ فیصلہ بشریت کے تقاضے سے ہو اور بعض اوقات اس میں غلطی کر جائے۔ اب اگر وہ آدمی اس علم سے مناسبت رکھتا ہے تو وہ خود اس نبی کو تلاش کر کے اس علم کو سیکھ لے گا۔ اگر نبیؐ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوگا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب اس آدمی کی استعداد بھی مردہ ہو گئی ہے۔ اگر نبی اسے مخاطب کرتا تو اس کے لیے راستہ آسان ہو جاتا اور وہ علم جلدی حاصل کر لیتا مگر اب جبکہ نبی اس کی طرف مخاطب نہیں ہوا اور یہ خود نبی کی تلاش میں ہے تو اسے محنت زیادہ کرنی پڑے گی اور پھر راستہ اس کے لیے آسان ہو جائے گا مطلب یہ ہے کہ نبی کی اس تعلیم سے صرف وہی آدمی پرہیز کرے گا جس میں واقعی استعداد نہیں ہے۔ اور انسانیت پر جو فیض تقسیم ہو رہا ہے اس لحاظ سے یہ بدبخت ہے۔ آیت ۱۲ و ۱۳ یصلی النار الکبریٰ ثم لایموت اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے واسطے آگ اور بے چینی کی زندگی ہوگی۔ آیت ۱۴ قد افلح من تزکیٰ جس آدمی میں عاقبت اندیشی ہے اور نبی نے اس کو علم سکھایا وہ اپنے آپ کو پاک بنا لے گا۔

آیت ۱۵ و ذکر اسم ربه فصلیٰ وہ اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہے اور اس کی محبت میں مستغرق ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کی محبت میں مستغرق ہونا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس آدمی کو حظیرۃ القدس کی طرف توجہ ہو چکی ہے۔ یہ اپنی ضرورت کے مطابق اپنی مخزن (حظیرۃ القدس) سے علوم حاصل کر سکتا ہے۔ یہی آدمی ہے جو کامیاب ہوا۔ (آیت ۱۴) اور نبی کی تعلیم سے ایسے ہی لوگ نکلیں گے اور یہ تعلیم ہمیشہ ایسی جماعتیں پیدا کرتی رہے گی۔ آیت ۱۶ بل توثرون الحیوۃ الدنیا اور جو فیل ہو گئے ان کی حالت یہ ہے کہ وہ معاشی زندگی ہی کو سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں ادنیٰ حیات اور ذلیل ترین حیات کو پسند کرتے ہیں۔

* آیت ۱۷ و الاخرۃ خیر و ابقیٰ حالانکہ اس معاشی (دنیاوی) زندگی کے

بعد جو آنے والی زندگی ہے وہ بہت اچھی ہے اور دیرپا ہے۔ اور یہ اس اخروی زندگی کو بھول جاتے ہیں اور دنیا کی زندگی میں ہی لگے رہتے ہیں اور یہی فیل ہونے کی نشانی ہے۔ حیوانوں کی طرح قریب بات کو سوچ لیتے ہیں اور مستقبل سے بے خبر رہتے ہیں۔ آیت ۱۸ و ۱۹ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی جو تفصیل ہے یہ پہلے انبیاء کے حلقہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے منسوب ہے۔ یعنی رسول کریم ﷺ کے تمام نظریات ابراہیمی ہیں اور عملاً آپ سیدنا موسی علیہ السلام کے زیادہ مشابہ ہیں۔ آیت ۱۸ ان هذا لفی صحف پہلے صحیفوں (ابراہیم اور موسی کے صحیفے) کا خلاصہ یہی ہے جو اس سورت میں بتلایا گیا ہے ہمارے مفسرین نے غلطی سے یہ خیال بنا رکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے گم ہو چکے ہیں یہ ان کی ناواقفیت ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ سابقہ کتب الہی کا انہوں نے مطالعہ ہی نہیں کیا تورات کی سب سے پہلی کتاب کا نام پیدائش ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا صحیفہ ہے اور جس کو سیدنا موسی علیہ السلام نے اول تورات میں رکھا۔ اس کے بعد چار صحیفے کتاب الخروج تک ہیں وہ سیدنا موسی علیہ السلام کے صحیفے ہیں ان پانچوں کتابوں کا نام اصل میں تورات ہے اور بنی اسرائیل کے باقی انبیاء کی کتابیں ان سے مابعد ہیں وہ انہیں پانچ صحیفوں کیساتھ ملادی گئی ہیں۔

* ایک مبصر عالم عیسائی کہتا ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ بائبل کی جو اچھی چیزیں ہیں وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں اور جس کو قرآن مجید نے چھوڑ دیا ہے وہ بائبل کے دوسرے درجہ کی چیزیں ہیں اور انسانی ضرورت کی چیزیں نہیں ہیں اب عمدہ اور اعلی تعلیم قرآن مجید میں اور دوئم درجہ کی تعلیم بائبل میں دکھائی دیتی ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں نے اس کے متعلق بہت غفلت برتی انہیں چاہیے تھا کہ وہ تورات کو سامنے رکھ کر قرآن مجید کا مطالعہ کرتے تو یہ ان کے واسطے بے نظیر ہوتے شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے بعد ان کے مدرسین اپنے مدرسہ میں ہمیشہ بائبل پڑھاتے تھے مگر ان کے بعد مسلمانوں نے غفلت برتی۔ ہندوستانی علماء تھوڑا بہت مطالعہ رکھتے ہیں حاصل کلام یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے گم نہیں ہوئے اب تک موجود ہیں۔

سُوْرَۃُ الْغَاشِیَۃِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ سِتٌّ وَّعِشْرُوْنَ اٰیَۃً

سورۂ غاشیہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھبیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ☆

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ ﴿١﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴿٢﴾

کیا پہنچی تجھ کو بات اس چھپا لینے والی کی ف۱ کتنے منہ اس دن ذلیل ہونے والے ہیں

عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ ﴿٣﴾ تَصْلَىٰ نَارًا حَامِيَةً ﴿٤﴾ تُسْقَىٰ مِنْ

محنت کرنے والے تھکے ہوئے ف۲ گرینگے دہکتی ہوئی آگ میں ف۳ پانی پلایا ایک

عَيْنٍ آنِيَةٍ ﴿٥﴾ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ ﴿٦﴾ لَا يُسْمِنُ

چشمے کھولتے ہوئے کا ف۴ نہیں ان کے پاس کھانا مگر جھاڑ کانٹوں والا ف۵ نہ موٹا کرے

وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ﴿٧﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاعِمَةٌ ﴿٨﴾ لِسَعْيِهَا

اور نہ کام آئے بھوک میں ف۶ کتنے منہ اس دن تروتازہ ہیں اپنی کمائی سے

رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾ لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ﴿١١﴾ فِيهَا

راضی ف۷ اونچے باغ میں نہیں سنتے اس میں بکواس ف۸ اس میں

عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾ فِيهَا سُرُرٌ مَرْفُوعَةٌ ﴿١٣﴾ وَأَكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ ﴿١٤﴾

ایک چشمہ ہے بہتا ف۹ اس میں تخت ہیں اونچے بچھے ہوئے اور آبخورے سامنے چنے ہوئے ف۱۰

وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ﴿١٥﴾ وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ﴿١٦﴾ أَفَلَا يَنْظُرُونَ

اور غالیچے برابر بچھے ہوئے ف۱۱ اور مخمل کے نہالچے جگہ جگہ پھیلے ہوئے ف۱۲ بھلا کیا نظر نہیں کرتے

إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾ وَ

اونٹوں پر کہ کیسے بنائے ہیں ف۱۳ اور آسمان پر کہ کیسا اس کو بلند کیا ہے ف۱۴ اور

إِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾ فَذَكِّرْ

پہاڑوں پر کہ کیسے کھڑے کر دیے ہیں ف۱۵ اور زمین پر کہ کیسی صاف بچھائی گئی ف۱۶ سو تو سمجھاتا

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾	لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾	اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿۲۳﴾	
تیرا کام تو ہی سمجھانا ہے	تو نہیں اُن پر داروغہ ۱۲	مگر جس نے منہ موڑا اور منکر ہوگیا	
فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾	اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾	ثُمَّ	
تو عذاب کریگا اُس پر اللہ وہ بڑا عذاب	بیشک ہمارے پاس ہے انکو پھر آنا	پھر	

اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾

بیشک ہمارا ذمہ ہے اُن کو حساب لینا ۱۳

سورة الغاشیہ مکیہ

* یہ سورت انقلاب کی تصویر پیش کرتی ہے۔ انقلاب ہمیشہ غرباء طبقہ سے شروع ہوتا ہے جیسے عرب میں سرمایہ ان کا اونٹ اور جبال اور زمین کی گھاس۔ اتنے سرمایہ سے انقلاب کیا۔ (آیت ۱ تا ۲۰ آیت ۲۶ کے بعد دیکھو)

* آیت ۲۱ **فذکر انما انت مذکر** اے رسول تو لوگوں کو سمجھا اور پڑھا۔ تیرا کام فقط پڑھانا اور سمجھانا ہے۔ آیت ۲۳ **الا من تولی و کفر** مگر اس کو مت پڑھا جو تیری طرف سے پیٹھ پھیر لے۔ غرض آیت سے رسول کریم کا فرض اور آپ کی ڈیوٹی بالکل واضح ہوگئی۔ آیت ۲۲ **لست علیهم بمصیطر** تو کسی کو اپنی طرف زبردستی کھینچ لانے والا نہیں ہے کہ تو ان کو اس راستہ (سیدھا راستہ) سے باہر

آیت ۳ تا ۷ تصلی نارا حامیة. بالایات ان کے دوزخ میں جانے کی ان آیات میں کیفیت ہے کہ ان کی محنتیں بے کار ہو گئیں۔ آیت ۸ وجوہ یومئذ ناعمة بعض آدمی اس دن نعمت حاصل کریں گے۔ آیت ۹ لسعیها راضیة انہوں نے جو محنت اور مشقت کی ہو گی وہ اس سے راضی ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نبی کی تعلیم کے مطابق کام کیا اس واسطے وہ اب مزے سے ہیں۔ آیت ۱۰ تا ۱۶ فی جنة عالیة ان آیات میں ان کی عافیت کی خوبی کا تذکرہ ہے کہ ان کو جنت میں یہ آرام اور صلہ ملے گا۔

* آیت ۱۷ تا ۲۰ افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ان آیات میں عربی قوم کا ماحول بتلایا گیا ہے انسان جہاں کہیں بھی ہے اگر وہ اپنے ماحول کا اندازہ نہ کرے تو کیا وہ کوئی کامیابی حاصل کر سکتا ہے؟ عقلمند انسان کو جہاں کہیں موقع ملے گا وہ اپنے ماحول پر پوری طرح نظر ڈالے گا، اور اس کے مطابق اپنا پروگرام بنائے گا اس کے بعد ہی وہ کہیں جا کر کامیاب ہو گا۔ اب عربی ماحول یہ ہے کہ اونٹ کیسے پیدا کیے گئے ہیں آسمان کیسے بلند کیا گیا۔ اور پہاڑ کیسے گاڑ دیئے گئے۔ اور زمین کیسے مسطح کر دی گئی؟ مولوی حمید الدین فراہی مرحوم اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ عرب میں بدوی زندگی ہے تو سب سے پہلے انسان کی نظر اونٹ پر پڑتی ہے اگر اونٹ سے ذرا اوپر نظریں کریں تو آسمان دکھائی دیتا ہے اور ذرا نیچے دیکھیں تو پہاڑ کھڑے دکھائی دیتے ہیں اور اگر اس سے نگاہ اور نیچی کریں تو زمین دکھائی دے گی یہ عرب کی کائنات ہے اور یہ سامان ہیں اور یہ ترقی کا مدار ہے غرض ہر قبیلہ کا بڑا افسر اور لیڈر ان چیزوں پر نظر کر کے اپنی قوم کے لیے ایک پروگرام بناتا ہے۔ اس کے پروگرام بنانے میں یہ اساسی نقطے ہیں چنانچہ ان نقطوں کا لحاظ رکھ کر ایک آدمی اپنا پروگرام بناتا ہے اور اپنے قبیلے کے لوگوں کے روبرو اس کا ذکر کرتا ہے۔ لوگ اس پروگرام کو اپنی ضرورت کے مطابق درست پاتے ہیں یعنی موافق پاتے ہیں اور ان کو مان لیتے ہیں (یہ نہیں کہ اس کی کوئی بات ہی نہیں سنتا اور نہ ہر شخص اپنا مختلف پروگرام بناتا ہے) اسی طرح ایک نبی نے ایک انٹر نیشنل زندگی کے لئے پروگرام بنایا۔ اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ پروگرام نبی

نے خود بنایا یا اس نے سمجھ لیا۔ وہ اس پروگرام کو جب سمجھدار لوگوں کے روبرو پیش کرے گا تو کیا اس پر غور نہیں ہونا چاہیے؟ یعنی اس سامان سے یہ دستورالعمل کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے قیصر و کسریٰ جیسے سامان کی ضرورت نہیں ہے۔ جس نے غور نہ کیا اس کا انجام تلخ ہوگا، جس کا آیات ۲ تا ۷ میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ بہت محنت کرے گا مگر اس کا پھل کچھ بھی نہیں نکل سکے گا اور جو آدمی اس پروگرام پر غور کرے گا تو آیات ۵ تا ۱۶ کے موافق اس کا انجام اچھا ہوگا، قرآن مجید کا دستور العمل اس سامان سے کامیاب ہوگیا۔ اور سمجھانے کے لیے کسی جیل خانہ یا لشکر کی ضرورت نہ رہی۔ اقوام عالم اس کو خود بخود قبول کرتے گئے اور اس میں جذب ہوتے گئے۔

سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ — وَهِيَ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً

سورۂ فجر مکہ میں نازل ہوئی — اور اس کی تیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ☆

وَالْفَجْرِ ۝١ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝٢ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝٣ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝٤

قسم ہے فجر کی — اور دس راتوں کی — اور جفت اور طاق کی — اور اس رات کی جب رات کو چلے ف١

هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝٥ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ

کیا ان چیزوں کی قسم پوری — عقلمندوں کے واسطے ف١ — تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے

بِعَادٍ ۝٦ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝٧ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝٨

عاد کے ساتھ وہ جو ارم میں تھے ف٢ بڑے ستونوں والے ف٣ کہ — بنی نہیں — ویسی — سارے شہروں میں

وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝٩ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝١٠

اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے تراشا — پتھروں کو — وادی میں ف٥ — اور فرعون کے ساتھ وہ میخوں والا ف٦

الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝١١ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝١٢ فَصَبَّ

یہ سب تھے جنہوں نے سر اٹھایا ملکوں میں — پھر بہت ڈالی ان میں خرابی — پھر پھینکا (برسایا)

عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝١٣ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝١٤ فَاَمَّا

ان پر — تیرے رب نے کوڑا عذاب کا ف٧ — بیشک تیرا رب لگا ہے گھات میں ف٨ — سو

الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ

آدمی جو ہے — جب جانچے اس کو رب اس کا پھر اس کو عزت دے اور اس کو نعمت دے — تو کہے

رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝١٥ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ

میرے رب نے مجھ کو عزت دی ف٩ — اور وہ جس وقت اس کو جانچے پھر تنگ کرے اس پر روزی کی

فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝١٦ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝١٧ وَ

تو کہے میرے رب نے مجھ کو ذلیل کیا ف١٠ — کوئی نہیں پر تم عزت سے نہیں رکھتے — یتیم کو ف١١ — اور

وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ﴿۱۸﴾ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ

اور نہیں تاکید کرتے آپس میں محتاج کے کھلانے کی ف۱۳ اور کھا جاتے ہو مردے کا مال

اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾ كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ

سمیٹ کر سارا ف۱۴ اور پیار کرتے ہو مال کو جی بھر کر ف۱۵ کوئی نہیں جب پست کر دی جائے

الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ وَ

زمین کوٹ کوٹ کر ف۱۶ اور آئے تیرا رب ف۱۷ اور فرشتے آئیں قطار قطار ف۱۸ اور

جِایْٓءَ یَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ

لائی جائے اس دن دوزخ ف۱۹ اس دن سوچیگا آدمی اور کہاں ملے اسکو

الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ ﴿۲۴﴾ فَیَوْمَئِذٍ

سوچنا ف۲۰ کہے کیا اچھا ہوتا جو میں کچھ آگے بھیجتا اپنی زندگی میں ف۲۱ پھر اس دن

لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾ وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾ یٰٓاَیَّتُهَا

عذاب نہ دے اس کا سا کوئی اور نہ باندھ کر رکھے اس کا سا باندھنا کوئی ف۲۲ اے وہ

النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾

جی جس نے چین پکڑ لیا پھر چل اپنے رب کی طرف تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾

پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں ف۵

سورۃ الفجر مکیہ

* آیت ۱ والفجر صبح۔ آیت ۲ ولیال عشر دس راتیں۔ آیت ۳ والشفع والوتر جفت اور طاق۔ آیت ۴ و اللیل اذا یسر اور رات جب چل پڑے۔ یہ چار چیزیں گواہ ہیں۔ یہ چار قسمیں ہیں۔ حظیرۃ القدس میں انسان کے لیے جو ترقی کے مدارج ہیں ان کو بیان کرنے کے لیے ان شہادتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرعون صبح کو مصر سے نکلا اور عاد و ثمود پر فجر کے وقت عذاب آیا۔ رمضان کے عشرہ آخر میں قرآن اترا۔ اس نے عالمگیر انقلاب کیا، جس سے بادشاہ اور بادشاہ پرست اور سرمایہ پرست تباہ ہوئے۔ اور یوم عرفہ میں یہ نعمت الٰہی بدرجۂ اتم تکمیل پر پہنچی جس سے انسان کو حظیرۃ القدس تک پہنچنے کا راستہ کھلا (۱) آیت ۵ ھل فی ذلک قسم لذی حجر عقلمند کے لیے ان چار مثالوں (آیت ۱ تا ۴) میں کوئی شہادت موجود ہے کہ وہ ان مثالوں میں سوچ کر فائدہ اٹھائیں؟ ہمارے ہاں غلطی سے عقلمندی کا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو کر اس کے بعد انسان قرآن مجید کو سوچے۔ مگر اس کے خلاف ہم یوں سمجھتے ہیں کہ جس چیز سے ہمارا تعلق ناگزیر ہے، اسے پہلے اپنے پیش نظر رکھے مثلاً آنکھ پر غور کرنے لگے تو روشنی کو روبرو رکھے۔ اس لیے کہ آنکھ کے متعلق وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ روشنی کو سامنے نہ رکھے۔ اسی طرح عقل کے متعلق اگر انسان سوچے تو اس نور کو سامنے رکھے جس کے بغیر عقل کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔ اگر اس طرح سوچنے بیٹھے گا تو نتائج بخوبی نکلتے چلے آئیں گے۔ اس نور کو سمجھنے کے لیے نوع انسانی میں جو واقعات فوق العادت پیدا ہوتے ہیں فطرت انسانی کے اندر رہ کر ان کے اسباب پر غور کرنا چاہیے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی حظیرۃ القدس کے ذریعہ جو حکومت الٰہی ہے وہ سمجھ میں آنے لگ جائے گی۔ پھر انسان اپنی ترقی کا راستہ یا تو خود

(۱) ایک بزرگ نقشبندی کا مقولہ ہے کہ آنحضرت ﷺ معراج کو راستہ بنانے کے لیے گئے تھے، اور اب تو طالب الٰہی بذریعہ مراقبہ پہنچتے رہیں گے۔

معین کر لے گا یا کسی بڑے استاد کے بتلانے پر اسے یقین آجائے گا۔ اب پہلے قسم کی طرف (آیت ا) توجہ کرتے ہیں۔ یعنی صبح، ہر صبح کے بعد وہی واقعات پیدا ہوتے ہیں جس کی علتیں رات کو تیار ہو چکی ہیں۔ عربی میں ایک مثال ہے کہ راتیں حاملہ عورت کی طرح ہیں۔ سعدی نے کہا ہے:

شب آبستن است اے برادر بروز

صبح معلوم ہوگا کہ کون سا بچہ پیدا ہوا۔ یعنی معمولی واقعات کو چھوڑ دیجئے۔ ذرا عام فطرت سے اونچے واقعات جن کی طرف انسانی فطرت متوجہ ہوتی ہے اس کی مثالیں آتی ہیں۔ (دیکھو آیت ۱۴) حظیرۃ القدس عالم غیب میں ہے جیسے رات، اور عالم شہادت صبح کی مانند ہے۔ جو کچھ فیصلہ حظیرۃ القدس میں ہوتا ہے اس کا نتیجہ عالم شہادت میں دکھائی دیتا ہے۔ آیت ۶ الم تر کیف عرب کا قبیلہ عاد شرارت میں بڑھ گیا اللہ تعالی نے اسے ہلاک کر دیا۔ آیت ۷و۸ ارم ذات العماد عرب کے دوسرے قبیلوں کے قد متوسط تھے اور عاد طاقتور اور مضبوط تھے۔ ایک زمین کی رہنے والی قوموں کو عام طور پر ایک نسل والا بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور یہ بالکل غلط بات ہے کہ مدت ہوئی قومیں نقل و حرکت کر کے آپس میں مخلوط ہو چکی ہیں۔ قبائل تو اپنا نسب ایک ثابت کر سکتے ہیں مگر کسی ملک کی تمام قوم کو ایک ہی آباء و اجداد کی اولاد بتانا زبردستی اور ہٹ دھرمی ہے۔ غرض عاد ایسی قوم تھی کہ عربی قوموں میں ان کی مثل دوسری کوئی قوم ممتاز نہیں تھی۔ اب یہ کہنا کہ دنیا بھر میں عاد جیسی طاقتور اور مضبوط قوم ہی نہ تھی یہ غلط ہے۔ اس سے مراد ہے کہ ان کے اپنے ملک کی کیفیت یعنی اس ملک عرب میں عاد سے زیادہ تنومند عربی قوم کوئی نہیں تھی۔ اور اس قسم کے محاورے ہر زبان میں ملتے ہیں عاد یمن میں رہتے تھے۔ ذات العماد سے مراد ہے بڑے بڑے منارے بناتے تھے اور اپنی دولت اس پر رائگان خرچ کرتے اور بڑے بڑے قلعے اور مصنوعات بناتے تھے۔ اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ رفاہ عامہ پر خرچ نہیں کرتے تھے بڑے بڑے محلات بناتے تھے۔ ہر امپیریلسٹ کے لیے عالیشان عمارت اور باغ ضروری تھا۔ جب خزانہ ختم ہو گیا تو رعایا پر زیادہ محصولات لگائے۔ آخر اس ظلم کے باعث انقلاب

آ گیا اور وہ تباہ ہو گئے۔ دیکھو سورۃ الشعراء۔ آیت۹ **و ثمود الذین جابوا الصخر** حجاز کے شمال میں جو قوم ثمود تھی اب اس کا ذکر آتا ہے۔

* آیت۱۰ **و فرعون ذی الاوتاد** میخوں سے سزا دینے والا فرعون ہے یا خیمہ خرگاہ والے۔ آیت۱۱ **الذین طغوا** تجھے معلوم ہے کہ یہ تمام (آیت ۷ تا ۱۰) اپنی حد سے زیادہ نکل گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ لوگ انسانیت کی فطری حدود کے اندر نہیں رہ سکے۔ آیت۱۲ **فاکثروا فیھا الفساد** ملکوں میں فساد کر کے انہوں نے اندھیر مچادیا۔ اور غرباء پر طرح طرح کے ظلم ایجاد کیے اور ترقی کے نام پر محصولات بڑھا کر ان کو مفلس بنادیا۔ آیت۱۳ **فصب علیھم. الایہ** تم نے دیکھا کہ وہ حد سے نکلے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑا۔ اور ان پر عذاب کیا۔ یہ کوئی مقامی قانون نہیں ہے کہ کسی خاص ملک میں کسی خاص قوم کو سزا دی۔ بلکہ ایک یمن میں ہے اور دوسرا حجاز کے شمال میں اور تیسرا مصر میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ انسانیت کا عام قانون ہے۔ آیت۱۴ **ان ربک لبالمرصاد** اب اس کا نتیجہ بتلایا کہ تیرا رب ہر قوم کو غائبانہ دیکھ رہا ہے۔ جیسے شکاری گھات میں بیٹھا ہو کہ جہاں جانور نے ذرا سی غلطی کی اور تساہل سے کام لیا اور غفلت برتی، شکاری نے فوراً وہیں نشانہ لگادیا۔ اس نتیجہ پر عقل کا پہنچنا آسان ہے۔ انسان بخوبی سمجھ لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نگرانی کر رہا ہے اور وہ ضرور سزا دے گا۔ جہاں سے اللہ تعالیٰ نگرانی کر رہا ہے اس کو حظیرۃ القدس کہتے ہیں ایک انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی عقل کو استعمال کرنے میں اس بات کو ہمیشہ سامنے رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی قوموں پر کس طرح ہو رہی ہے۔ (اسی واسطے عاد، ثمود اور فرعون کی مثال سمجھائی) دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہنا چاہیے کہ انسان کو تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے ظاہر ہے کہ اگر عقل انسانی تاریخ سے قطع تعلق کرلے تو وہ کوئی کام نہیں کرسکتی۔ جب انسانیت کی تاریخ سے اسی طرح ایک صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی عادت ہوجائے گی تو ہر نئی صبح میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق انسانی عقل ایک اندازہ کرسکے گی۔ اب اگر ایک شخص کے اندازے عموماً ٹھیک نکلتے ہیں تو معلوم ہوا کہ وہ عقل کو ٹھیک طرح پر استعمال کرنا سیکھ گیا۔ اور یہی فجر سے

مراد ہے جو آیت ۱ میں شاہد و گواہ لایا گیا ہے۔ (اب دوسری فصل ہے دس راتوں کی قسم آیت ۲)

* اکثر اہل علم کی رائے دیکھ کر ہمیں یہی بات نظر آئی کہ اس سے مراد رمضان کی آخری دس راتیں ہیں۔ انہی دس راتوں کی ایک رات میں قرآن مجید(۱) نازل ہونا شروع ہوا تھا۔ مقدمہ کے طور پر اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایک چھوٹی سی بات عقل کے طور پر رکھ لیں تاکہ آگے چل کر آسانی ہو۔ عقل کے بعد انسان میں حب کے جذبات ہوتے ہیں۔ یہ حب دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک حب ہے عقلی، کہ جو بات عقل سے صحیح سمجھ میں آئے اس سے طبیعت میں محبت پیدا کر دی جائے۔ اور دوسری محبت ہے جس کو طبعی کشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ خواہ انسان سوچے یا نہ سوچے طبیعت میں ایک کشش ہے کہ وہ انسان کو اپنی طرف لے جا رہی ہے۔ اس کے بعد وہ جب اس کشش کے متعلق سوچتا ہے تو وہ اسے اپنے واسطے مفید پاتا ہے۔ اور اس کی عقل اس سے مطمئن ہو جاتی ہے۔ اگر مفید نہیں پاتا تو اپنی طبع پر زور ڈالتا ہے کہ اس کی طرف رغبت نہ کرے۔ آیت ۱۵ **فاما الانسان اذا ماابتلاہ** انسان کی عادت ہے کہ جب اللہ تعالی اس کا امتحان لینے کے لیے اسے عزت اور عظمت دے تو وہ بھول جاتا ہے کہ اللہ تعالی نے اسے بزرگی دی۔ حالانکہ یہ بزرگی اسے صرف امتحان کے طور پر دی گئی تھی کہ دیکھیں یہ اس سے کیا فائدہ اٹھاتا ہے۔ مگر یہ ایسے ہی میں مست

---

(۱) جو سرمایہ پرستی کی بیخ کنی کے لیے نازل ہوا ہے **و فی اموالھم حق للسائل و المحروم** اب آگے سرمایہ پرست کی مثال آتی ہے کہ اس کی عادت ہے کہ وہ یتیموں کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اور اپنی بیٹی بیٹے کو عزت کے نگاہ سے دیکھتا ہے اور مساکین کی روزی کا بندوبست نہیں کرتا، الٹا ان کے مال کو کھاتا ہے اور دوسروں کے میراث کو بھی ہضم کر جاتا ہے۔ غرض کہ مال اس کے نزدیک محبوب ہے نہ انسانی ذات، یہ ایسا خبیث طبیعت ہے کہ اگر اس کی حالت دولتمندی کی ہے تو اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ میں محبوب الہی ہوں اور اگر اس پر تھوڑی سی تنگی رزق کی آجاتی ہے تو خدا پر غصہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایسے سرمایہ پرستوں کے استیصال کے لیے یہ قرآن مجید نازل ہوا ہے اور غربا کی ہمت کو بڑھاتا ہے اور سرمایہ داروں کو ڈراتا دھمکاتا ہے۔ (دیکھو والقلم کو)

ہو گیا کہ میں بڑا بزرگ ہو گیا ہوں۔ اس بزرگی پر جو فرائض عائد ہوتے تھے وہ ان کو بھول گیا۔ اور اس کو خیال ہو گیا کہ یہ بزرگی میری ہی قابلیت سے مجھے ملی ہے۔ اور وہ مساکین و غرباء کا کوئی انتظام نہیں کرتا۔ الٹا ان کو لوٹ کھسوٹ کر مال جمع کرتا ہے۔ مال جمع کرنا اس کا نصب العین ہے۔ آیت ۱۶ و اما اذا ماابتلاہ فقدر علیہ. الآیہ اور جب اللہ تعالی اس کا امتحان لیتا ہے اور اس پر رزق تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالی نے میری اہانت کر دی (۱) اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ اس کی اہانت نہیں ہوتی بلکہ اس کی عقل کا امتحان ہوتا ہے غرض جو لوگ پہلی حالت کو (آیت ۱۵) عزت سمجھتے ہیں او دوسری کو (آیت ۱۶) اہانت۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں انسان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر کوئی کام کرے اور پھر نتیجہ کے طور پر اسے عزت نصیب ہو۔ اور اہانت یہ ہے کہ جن چیزوں کو وہ اچھا سمجھتا ہے ان کو غفلت سے چھوڑ دے اور اس غفلت کے نتیجہ میں اس کی بری حالت ہو جائے یہ ہے حقیقی اہانت۔ اگر بغیر محنت کے نعمت مل گئی یا بغیر غفلت کے رزق میں تنگی آگئی تو یہ دونوں حالتیں عارضی ہیں جو امتحان کے طور پر پیش آتی ہیں۔

* آیت ۱۷ کلا ایسا نہیں ہے کہ اتفاقی طور سے کام مل جائے اسے عزت کا ذریعہ بنایا جائے جو کام عزت پیدا کرنے والے ہیں وہ تو تم کرتے نہیں اور جو کام ذلیل بنانے والے ہیں وہ تم کرتے ہو۔ اب تم کیسے توقع کر سکتے ہو کہ تم کو عزت ملے۔ بل لاتکرمون الیتیم انسانی عقل کے مطابق عزت حاصل کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ تم محتاجوں کی خبر گیری کرو۔ تمہاری عزت ہوگی۔ یہ عادت سرمایہ پرست کی ہے۔ آیت ۱۸ و لاتحٰضون اور مساکین کو مدد دو۔ ان احکام کی عدم تعمیل سے ان پر تباہی آئی۔ عاد و ثمود اور فرعون بادشاہ پرستوں کی مثال تھی اور اما الانسان سے سرمایہ پرست کی مثال ہے۔ آیت ۱۹ و ۲۰ و تاکلون التراث تم میراث کو کھاتے ہو

---

(۱) یعنی جب اس کا دیوالہ نکل گیا تو پھر وہ بیٹھ کر اپنی بزرگی یاد کر کے اس حالت کو اہانت سمجھتا ہے اور اس کو خدا پر غصہ آتا ہے اور خدا کا منکر بن جاتا ہے حالانکہ یہ ساری تباہی اس کے عدم ادائے فرض سے ہوئی۔

یعنی دوسرے کی جائداد کے خود مالک بننا چاہتے ہو۔ اور مال محبت سے جمع کرتے ہو اگر کبھی مال مل گیا تو اسے سمیٹ کر رکھتے ہو۔ یہ دونوں چیزیں اہانت کا ذریعہ ہیں۔ ان سے انسان بے عزت ہو جاتا ہے تمہاری الٹی عقل ہے کہ تم اس کو عزت کا ذریعہ سمجھ رہے ہو۔ سرمایہ پرستی اس سے پیدا ہوتی ہے جو ملعون اور مغضوب ہے۔ تمہیں چاہیے تھا کہ یتیم اور مساکین اور دوسرے کے مال و جائداد کی حفاظت کرتے اس لیے کہ اللہ تعالی نے تمہیں کھانے پینے کے لئے بہت کچھ دیا ہے۔ تو اس کے شکرانے میں نظام عالم میں کام کرو۔ مگر تم دوسروں کی تباہی کر رہے ہو۔

(دوسری فصل ختم ہوئی اب تیسری فصل شروع ہوتی ہے)

* (آیت ۲۱ تا ۲۶ جو جنت اور طاق ہے) عام اہل علم کے مطابق ہماری سمجھ بھی یہی ہے کہ آیت ۳ سے عرفہ (ذوالحج کی ۹ تاریخ) اور حج کا دن (۱۰ تاریخ) مراد ہے۔ قرآن مجید عقلیت سے ترقی کر کے اللہ تعالی کی محبت پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ انہی دس راتوں (رمضان)میں نازل ہوا تھا غرض یہ دس راتیں قرآن کے نزول کا زمانہ تھا اور اسی طرح ۹ اور ۱۰ ذی الحج کی تاریخیں اللہ تعالی کے دوستوں کو جذب کرنے کی یادگار ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے فرزند اسمعیل علیہ السلام محبت الٰہی سے کھنچ کر قربانی دینے کے لیے تیار ہوئے اور اس قربانی کو وہ اپنی عقل کے مطابق اطمینان سے ٹھیک مانتے ہیں۔ انسانی ترقی کا اس عقلی حب کے درجے پیدا کرنے کے بعد کا زمانہ ہے۔ جو لوگ عقل کے مطابق اللہ تعالی کی محبت حاصل کرنے کے طریقہ پر عمل کرتے رہتے ہیں اور ان کے دل میں اللہ تعالی کی محبت راسخ ہو گئی اس سے یہ اونچا درجہ ہے۔ اس کے بعد انسانی ترقی یہ ہے کہ جن چیزوں میں انسانی عقل خود نہیں پہنچ سکتی اور وہ اللہ تعالی کی محبت حاصل کرنے کا اعلی ذریعہ ہیں تو اللہ تعالی وہ کشش انسان کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ عقل بھی اس کی موافقت کرنے لگ جاتی ہے تو یہ حج اسی قسم کی محبت کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اور اسی طرح حجۃ الوداع میں الیوم اکملت نازل ہوئی یعنی قرآنی تعلیم اس میں پوری ہوئی۔ آیت ۲۱ تا ۲۶ میں اس تیسری فصل کا ذکر ہے۔ آیت ۲۱ و ۲۲ کلا اذا دکت الارض دکاً دکاً قیامت کے دن اللہ تعالی کی تجلی کا نزول

ہوگا۔ انجیل میں اس کا تفصیل سے ذکر ہے۔ قیامت کی یاددہانی کے لیے قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی آسمانی کتاب نہیں ملتی۔ جو لوگ اس محبت کے درجہ کو طے کر چکے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑی عزت سے جگہ ملے گی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کہتے ہیں کہ "میں دائیں طرف بیٹھوں گا" اور یہی طرف ہے تمام انبیاء کرام کی اور ان بزرگوں کی جو اس محبت میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ مسیح علیہ السلام اپنی قوم کو اپنی مثال درحقیقت سبق کے طور پر بتلاتے ہیں مگر نصاریٰ نے غلطی سے اسے مسیح علیہ السلام کے لیے مخصوص کر دیا کہ وہاں صرف مسیح علیہ السلام ہی بیٹھیں گے۔ اگر انسان نے اس دنیا میں یہ درجہ حاصل نہیں کیا تو پھر اس کے لیے اس دنیا میں کوئی موقع نہیں ہے۔

* آیت ۲۳ و جیٓئ یومئذ بجھنم اس میدان میں جہنم سامنے لایا جائے گا۔ یومئذ یتذکر الانسان اور وہ جہنم اپنی کشش سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچے گا اب انسان کو ہوش آئے گا۔ کہ کاش میں ایسی حالت میں ہوتا کہ جہنم کی جو کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اس کے بجائے میں اس کشش کو پاتا (حاصل کرتا) جو اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانے والی ہے۔ و انا لہ الذکریٰ مگر اس نعمت کو یاد کرنے سے کیا فائدہ؟ اب تو موقع ہی نہیں رہا۔ انسانوں کا ایک طبقہ ایسا ہے کہ وہ غیر فطری کاموں کے لیے اپنے اندر ایک جذب (کشش) پاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی عقل کو بھی ان غیر فطری کاموں پر مطمئن کر لیتا ہے۔ یہ لوگ ہوں گے جن کو جہنم اپنی طرف زور سے کھینچ کر لے جائے گا۔ انہیں اس وقت تنبہ پیدا ہوگا کہ ہم کو جس طرح یہ کشش اب پیدا ہوئی ہے کاش یہ پہلے ہی ٹھیک طریقہ پر ہوتی۔ انسان کو یہ ترقی ہمیشہ اچھی سوسائٹی حاصل ہونے سے نصیب ہوتی ہے۔ اور بری سوسائٹی میں رہ کر انسان جہنم کا اہل بن جاتا ہے۔ آیت ۲۴ یقول یلیتنی. الایہ انسان کو جب تنبہ ہوتا ہے تو کہتا ہے اے کاش میں اس زندگی کے لئے کچھ کرتا۔ آیت ۲۵ و ۲۶ فیومئذ لایعذب. الایات اس دن ایسی گرفت ہوگی جو کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ اس طبقے کا ذکر ہے جس نے غیر فطری کاموں کی کشش اپنے اندر پیدا کر لی ہے۔ ان کو ایسی گرفت ہوگی کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔

(تیسری فصل ختم ہوئی۔ اب چوتھی فصل شروع ہوتی ہے)

* آیت ۴ میں کہا گیا ہے کہ و اللیل اذا یسر یعنی رات جب چل پڑی اس سے مراد لیلۃ المعراج "سبحان الذی اسری بعبده لیلاً من المسجد الحرام" سورۃ بنی اسرائیل تو وہ رات ہے یسر والی۔ ترقی کا یہ آخری درجہ ہے کہ انسان حظیرۃ القدس میں پہنچ جائے۔ تیسری فصل میں بیان کیا گیا ہے کہ جب اللہ تعالی دربار لگائے گا تو اس میں انسان کو عزت سے بٹھائے گا اور اس چوتھی فصل میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ انسان اپنے آخری درجۂ ترقی (حظیرۃ القدس) میں پہنچ کر اسے حاصل کر لے۔ اسے معراج یعنی عروج کا حصہ کہتے ہیں جس طرح آنحضرت ﷺ کو معراج میں سیر کرائی گئی اور یہ ترقی کا آخری درجہ تھا۔ آیت ۲۷، ۲۸ یا ایتها النفس المطمئنة. الایات نظام عالم کی درستی کے لیے کام کرنے والا، نہ اس کو سرمایہ پرست بننے کا شوق ہوتا ہے اور نہ بادشاہ، نہ بادشاہ پرستی کا خیال ہے۔ اسے انسان خدا کا بندہ ہو جا۔ یہ انتہائی ترقی ہے کہ انسان اللہ تعالی سے راضی ہو اور اللہ تعالی انسان سے راضی ہو۔ آیت ۲۹ فادخلی فی عبادی میرے بندوں کی جماعت میں بیٹھ جا یہ حظیرۃ القدس ہے۔ جو اپنے آپ کو ایک اللہ کا غلام سمجھتا ہے ایسے آدمی کو حکم ہوتا ہے کہ تم میرے غلاموں میں داخل ہو جاؤ پھر تو دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔

آیت ۳۰ و ادخلی جنتی اور میرے باغ میں داخل ہو جا۔ باغ میں داخل ہونا دوسرے درجہ کی چیز ہے۔ اگر انسان حظیرۃ القدس میں پہنچ گیا (یہ انتہائی ترقی ہے) اور اس سے دوسرے درجہ پر یہ ترقی ہے کہ جس قدر باغ وغیرہ ہیں ان کی یہ بخوبی سیر کرے۔ هل فی ذالک قسم الذی حجر حاصل مطلب یہ نکلا قرآن مجید کی تعلیم ہے ان ربک لبالمرصاد بادشاہوں نے خدا کے احکام کی برخلافی کی اور مساکین پر ظلم کیے تو فنا ہو گئے اور سرمایہ پرست جو سلطنت کے دست و بازو ہوتے ہیں ان کو بھی تباہ کرنا ہے۔ ان کے اخلاق بالکل ردی ہیں۔ اس کے بعد قیامت کی تصویر ہے کہ پھر دولت پرست انسانوں کو معلوم ہو گا کہ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" اور انہوں نے اپنی روحانی ترقی کو بھلایا جس کے باعث وہ جہنم میں پڑے۔ اور اللہ کے

بندے جنہوں نے نظام عالم میں ایک پرزہ بن کر کام کیا اور اللہ تعالی کی طرف متوجہ رہے وہی دنیا و آخرت میں کامیاب ہیں اس میں بالکل مسلسل مضمون ہیں۔ انسان چار قسم کے ہیں۔ ایک ایمپرر، دوسرا امپیریلسٹ، تیسرا سرمایہ دار، چوتھا غمخوار نوع انسانی۔

سُوْرَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ عِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۂ بلد مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ☆

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝١ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝٢ وَوَالِدٍ

قسم کھاتا ہوں میں اس شہر کی ف١ اور تجھ پر قید نہیں رہے گی اس شہر میں ف٢ اور قسم جنتے کی

وَّمَا وَلَدَ ۝٣ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۝٤ اَيَحْسَبُ

اور جو اس سے جنا ف٣ تحقیق ہم نے بنایا آدمی کو محنت میں ف٤ کیا خیال رکھتا ہے وہ

اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝٥ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝٦

کہ اس پر بس نہ چلے گا کسی کا ف٥ کہتا ہے میں نے خرچ کر ڈالا مال ڈھیروں ف٦

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ۝٧ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝٨ وَ

کیا خیال رکھتا ہے کہ دیکھا نہیں اس کو کسی نے ف٧ بھلا ہم نے نہیں دیں اسکو دو آنکھیں ف٨ اور

لِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝٩ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝١٠ فَلَا اقْتَحَمَ

زبان اور دو ہونٹ ف٩ اور دکھلا دیں اسکو دو گھاٹیاں ف١٠ سو نہ دھمک سکا

الْعَقَبَةَ ۝١١ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝١٢ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝١٣ اَوْ اِطْعٰمٌ

گھاٹی پر ف١١ اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی چھڑانا گردن کا ف١٢ یا کھلانا

فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝١٤ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝١٥ اَوْ مِسْكِيْنًا

بھوک کے دن میں ف١٣ یتیم کو جو قرابت والا ہے ف١٤ یا محتاج کو جو

ذَا مَتْرَبَةٍ ۝١٦ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ

خاک میں رل رہا ہے ف١٥ پھر ہووے ایمان والوں میں ف١٦ جو تاکید کرتے ہیں آپس میں تحمل کی

تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝١٧ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝١٨ وَالَّذِيْنَ

اور تاکید کرتے ہیں رحم کھانے کی ف١٧ وہ لوگ ہیں بڑے نصیب والے ف١٨ اور جو

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝١٩ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝٢٠

منکر ہوئے ہماری آیتوں سے وہ ہیں کمبختی والے ف١٩ انہی کو آگ میں موند دیا ہے ف٢٠

سورۃ البلد مکیہ

* اس سورت میں انسانی فطرت کا ایک خاص مظاہرہ ہے انسانی فطرت چاہتی ہے کہ اس کو مکلف بنایا جائے اس صورت میں مذہبی علماء اور رہبان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ ان میں سرمایہ پرستی کا سخت مرض ہے۔ تقریریں بہت کرتے ہیں مگر نظام عالم میں کام نہیں کرتے۔ تقریریں کرنے سے ان کی غرض و غایت سرمایہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑی بداخلاقی ہے۔ سرمایہ پرستی بڑی لعنت ہے۔ اس مرض کے ازالہ کا اس سورت میں علاج بتایا گیا ہے۔ آیت ۴ لقد خلقنا الانسان فی کبد انسان کسی حالت میں مشقت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کی فطرت کا اہم جزو ہے۔ اس نقطۂ نظر سے انسانی فطرت پر ایک قسم کا تذکرہ ہے۔ آیت ۱ و ۲ لا اقسم بھذا البلد و انت حل بھذا البلد جب تو اس شہر مکہ میں رہتا ہے اس حالت میں ہم اسے گواہ بناتے ہیں(۱) اس گواہی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے انسان کو ہمیشہ مشقت میں پیدا کیا۔ انسانی کمالات میں ترقی کرنے کے بعد اگر کوئی آدمی مشقت سے بچ سکتا تو وہ رسول کریم ﷺ ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی خدمت کے لیے رسول کریم ﷺ کی محنت بے انتہا مفید ثابت ہوئی اور آپ کی حالت جب آپ مکہ میں موجود تھے تو کس قدر مصیبت میں گذر رہی تھی یہ عیاں ہے۔ غرض انسان کمالات پر پہنچ کر اپنے آپ کو مشقت سے نہیں بچا سکتا۔ اور رسول کریم ﷺ کی زندگی اس کی گواہ ہے۔ ہمارا یہ اصول ہے کہ رسول کریم ﷺ کی مدنی زندگی آپ کی مکی زندگی کا تتمہ ہے۔ آپ کے تمام کمالات اس ابتدائی زندگی (مکی زندگی) میں طے ہو چکے تھے۔ انبیاء کے سلسلے میں رسول کریم ﷺ جیسا باکمال انسان کوئی نہیں دکھائی دیتا۔ آپ مکہ میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ مگر آپ کا کوئی وقت مشقت سے خالی نہیں گزرا غرض کہ یہ نتیجہ

---

(۱) اگر دو گواہ سمجھے جائیں تو بھی صحیح ہے۔ یہ کہ مکرمہ جو عرب میں ام القری ہے کیسی مشقت سے بنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل و بی بی ام المومنین ہاجرہ کا قصہ مشہور ہے۔

نکالنا صحیح ہے کہ انسان کے باکمال ہوجانے سے اس سے مشقت نہیں ٹل سکتی۔ یہ انسان کا انتہائی درجہ کمال تھا۔ اس میں مشقت ہی مشقت ہے۔ یہ پہلی شہادت ہے اور دوسری شہادت آیت ۳ میں آتی ہے۔ آیت ۳ و والد و ماولد کہ جننے والی کس قدر مصیبت سے بچہ پیدا کرتی ہے اور اس طرح کس قدر مصیبت سے ماں کے پیٹ سے بچہ نکلتا ہے یہ ہے انسان کی ابتدائی حالت کہ اس جگہ بھی انسان کے لیے مشقت ہی مشقت ہے۔ تو پہلی اور دوسری گواہی (آیت ۱ و ۳) کو ملا کر یہ نتیجہ نکلا کہ انسان کی زندگی مشقت میں گتھی ہوئی ہے۔ (آیت ۴)

* آیت ۵ ایحسب ان لن یقدر علیه احد اس پر تنگی کی جائے گی۔ شرائع کا مکلف ضرور بنایا جائے گا۔ یہ اس کی فطرت کے تقاضے کی تکمیل ہے۔ جو لوگ آرام طلبی کو اپنا مقصد زندگی بناتے ہیں وہ ایک محال چیز کے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بادشاہ بنیں یا بادشاہ کے نوکر یعنی بادشاہ پرست یا سرمایہ پرست بن کر آرام کرنا چاہتے ہیں۔ انسان اپنے دل میں ایسے بہت سے خیالات بنالیتا ہے کہ میں آرام حاصل کرلوں۔ کیا اس کا خیال ہے کہ وہ اس قدر خود مختار پیدا کیا گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے واسطے آرام بنالے اور اس کے سر پر کوئی طاقت نہیں؟ جب انسان ایک بڑے نظام کے ماتحت جکڑا ہوا ہے تو اسے یہ کبھی خیال نہیں کرنا چاہیے۔ آیت ۶ یقول اهلکت مالا لبدا وہ شرائع سے آزاد رہ کر اپنے طور پر خرچ کرتا ہے مگر بے سود۔ پھر مایوس ہو کر کہتا ہے کہ میں نے (آرام طلبی) کے لیے بے انداز مال خرچ کیا (مگر آرام نہ پایا) آیت ۷ ایحسب ان لم یره احد اس نے خلاف تقاضائے فطرت اور خلاف شرائع کام کیا۔ اس نے جو بے اندازہ مال لٹادیا تو اس سے کبھی آرام حاصل نہیں ہوا۔ انسان اگر شراب و کباب سے عارضی آرام حاصل کرلے تو کیا ہوا۔ ان باتوں سے دائمی سرور کبھی پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اگر اس کو آرام کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے بڑی رقم خرچ کرکے آرام حاصل کیا ہے۔ اے انسان! سرمایہ پرست، بے عقل تو نہیں جانتا کہ تیرے دیکھنے والے موجود ہیں۔ تو نے کتنے غرباء کو قلاش کیا۔ تو نے کتنے یتیموں اور مسکینوں کا مال کھایا۔ تو نے اپنے

پیٹ میں آگ کو جمع کیا۔ کیا کبھی تجھ کو آرام ملے گا؟ ہر گز نہیں۔ آیت ۸ الم نجعل له عينين انسان کو غور کرکے اور دیکھ بھال کر روپیہ خرچ کرنا چاہیے تھا۔ کہ پہلے لوگوں نے جو اس طرح روپیہ برباد کیا کیا ان کو اس طرح آرام حاصل ہوا؟ اس کے واسطے ہم نے اس کو دو آنکھیں عطا کیں تاکہ وہ دیکھ بھال کر چلے۔ آیت ۹ و لسانا و شفتين اس کے ساتھ ہم نے انسان کو زبان عطا کی کہ اگر اسے نظر نہیں آتا تو کسی دوسرے ہی سے دریافت کر لے۔ آیت ۱۰ و هديناه النجدين اور ہم نے اسے دو بڑے اونچے راستے دکھلائے اگر وہ فطرت پر غور کرے تو اس کو سمجھنے کے لیے ایک اونچا راستہ خود بخود سامنے آجائے گا۔ اور وہ دو راستوں میں سے ایک ہوگا۔ ایک ہے اصلاح عالم اور دوسرا ہے ترقی روحانی۔ نوع انسانی کے لیے کام کرنا پہلا راستہ ہے اس میں فیل ہونے سے دوسرا راستہ ہاتھ نہیں آتا جیسا سورۃ ماعون میں ہے۔ آیت ۱۱ فلا اقتحم العقبة وہ شرائع الہیہ کے منشاء کے مطابق صرف کیوں نہیں کرتا یہ ہے گھاٹی۔ صبر سے عبور کرنا کامیابی ہے۔ مگر اس کے لیے شرط ہے کہ انسان پہلی گھاٹی پر چڑھے۔ جب تک انسان اس بڑی گھاٹی پر نہیں چڑھے گا اس کو وہ دونوں راستے نظر ہی نہیں آئیں گے۔ آیت ۱۲ و ما ادراک ما العقبة وہ مشکل گھاٹی کیا ہے؟ ایک کام ہے فک رقبہ یہ کام بڑا ہے۔ اس میں جنگ اور مشقت ہے۔

* آیت ۱۳ فک رقبة پھنسے ہوئے آدمی کو آزادی دلوانا۔ اگر تم اس جگہ روپیہ صرف کرتے تو تم بے شک آرام اور سکون قلبی حاصل کرتے۔ بھلا شراب و کباب میں روپیہ برباد کرنے سے کیا آرام مل سکتا ہے؟ زبردست آدمی اگر بے گناہ اور مظلوم کی گردن میں پھندا ڈال دے تو اس کو آزاد کراؤ یا کسی مقروض کو اس کے قرض خواہ سے آزادی دلواؤ۔ اگر کسی آدمی یا قوم کو غلام بنا رکھا ہے یا کسی سرمایہ دار نے اسے غلام بنا رکھا ہے تو اس کو آزاد کراؤ تب بھی تم کو دونوں ہدایت کے راستے معلوم ہو جاتے۔ اگر انسان پہلا کام نہ کر سکتا تو یہ کرتا کہ گھر میں بیٹھ کر مساکین اور یتیموں کے کھانے کا بندوبست کرتا یعنی سوشل اصلاح کرتا۔ آیت ۱۴ تا ۱۶ او اطعام في يوم. الايات دوسرا کام ہے کھانا کھلانا۔ بڑا کام تو یہ تھا کہ غلام کو آزاد کراؤ۔ اگر تم میں اتنی

توفیق نہیں تو مساکین کو کھانا کھلاؤ غرض یہ دو بڑے راستے ہیں اور ان دونوں کاموں کو اونچی گھاٹی سے تعبیر کیا ہے کہ جب تک بلندی کے اوپر چڑھ کر نہیں دیکھو گے ان کو نہیں پاسکو گے۔ تم کو اونچی ذہنیت رکھنی چاہیے تاکہ تم انسانی زمرہ میں آسکو۔ ورنہ اپنے کھانے کے لیے اور دوسروں کو شکار کرنے کے لیے ایسے حیوانوں کی جماعت میں داخل ہوجاؤ گے جو انسانیت کے بہت بڑے دشمن ہیں۔ پھر تو تمام انسانوں کی لعنت ایسے سرمایہ داروں پر پڑے گی۔ آیت ۱۷ ثم کان من الذین آمنوا. الایہ(۱)

دوسرا یہ ہے کہ ترقی روحانی۔ اس کا درجہ دوم ہے سرمایہ پرست کے لیے۔ جب انسان نے یہ درجہ طے کرلیا اور روپیہ خرچ کرنے کے بعد راحت حاصل ہوگئی تو اب اس کی تکمیل یہ ہے کہ وہ اس انٹر نیشنل مرکزی جماعت کا ممبر بن سکتا ہے جو صحیح پروگرام پر عمل کر رہی ہے اور اس پر مشقت کی ڈیوٹی عائد ہے۔ یہ بھی اس میں شامل ہوجائے۔ یعنی جب تک انسان، انسان نہ بنے تب تک اس کو ایماندار سوسائٹی میں شامل ہونے کی دعوت بھی نہ دی جائے۔ پہلے دو کام انسان بننے کے لیے ضروری ہیں۔ جب انسان بن گیا تو پھر ایماندار جماعت میں شامل ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ایماندار جماعت کے پروگرام کا جز ہے انسانیت۔ انسانیت کی تکمیل کا درجہ ہے ایمان باللہ۔ اور جو مشقت انسانوں کے فائدے کے لیے ہیں ان کو برداشت کرنا اور پیچھے نہ ہٹنا اور انسانوں پر ماں باپ کی طرح شفقت کرنا۔ جس شخص کے دل میں انسانوں پر رحم کرنا اور ان کے راحت کے سامان تیار کرنے کا خیال بھی نہیں ان کو ایماندر جماعت سے کیا تعلق؟ انسان تو ہمیشہ ایسی جماعت تلاش کرتا ہے جو اس کے ہم خیال ہوں۔ جب اس انسان کو فقط اپنی راحت طلبی مطلوب ہے تو ایسی جماعت جو اپنی راحت کے لیے کام کرتی ہے اور وہ جماعت جو انسانیت کے لیے اپنے آرام پر لات مارتی ہے اس سے اس کا کیا تعلق؟

---

(۱) ترقی روحانی اکثر جگہ قرآن میں دوم نمبر پر آتی ہے اور اکثر جگہ اول تو اس کا مطلب ہے اختلاف طبائع۔ سرمایہ پرست کو اولاً سوشلزم کی دعوت ہے پھر ایمان اور اور صلوۃ کی۔ ع گر الحمد بخوانی صد می خوانند الخ۔ اور غرباء کو اولاً دعوت ہے ایمان اور صلوۃ کی۔ سرمایہ پرست گرگ ہے۔ اس کو انسانیت سکھانا ضروری ہے ورنہ اس کی عبادت کسی کام کی نہیں جیسے طوطی کو قرآن خوانی اور بندر کو نماز خوانی فائدہ نہیں دیتی۔

آیت۱۸ اولئک اصحاب المیمنۃ یہ ہیں یمن (برکت) اور جنت والے لوگ۔ ان کو دائمی راحت اور سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ آیت۱۹ والذین کفروا اور جو ہمارے ان طریقوں کو چھوڑتے ہیں وہ بدنصیب ہیں۔ آیت۲۰ علیہم نار مؤصدۃ ان کو آگ جلاتی رہے گی جیسے دنیا میں بے آرام رہے (کہ اصلی سرور میسر نہ ہوا) ویسے ہی آخرت میں بھی بے آرام رہے۔

سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۂ شمس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پندرہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝۱ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝۲ وَالنَّهَارِ اِذَا
قسم سورج کی اور اس کی دھوپ چڑھنے کی اور چاند کی جب آئے سورج کے پیچھے اور دن کی جب
جَلّٰهَا ۝۳ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝۴ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۝۵ وَ
اسکو روشن کرے اور رات کی جب اس کو ڈھانک لیوے اور آسمان کی اور جیسا کہ اسکو بنایا اور
الْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝۶ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا
زمین کی اور جیسا کہ اسکو پھیلایا اور جی کی اور جیسا کہ اسکو ٹھیک بنایا پھر سمجھ دی اس کو
فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ
ڈھٹائی کی اور بچ کر چلنے کی تحقیق مراد کو پہنچا جس نے اس کو سنوار لیا اور نامراد ہوا
مَنْ دَسّٰهَا ۝۱۰ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝۱۱ اِذِ انْۢبَعَثَ
جس نے اس کو خاک میں ملا چھوڑا جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے جب اٹھ کھڑا ہوا ان میں
اَشْقٰىهَا ۝۱۲ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝۱۳
کا بڑا بدبخت پھر کہا ان کو اللہ کے رسول نے خبردار رہو اللہ کی اونٹنی سے اور اسکی پانی پینے کی باری
فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ۬ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ
پھر انہوں نے اسکو جھٹلایا پھر پاؤں کاٹ ڈالے اسکے پھر الٹ مارا ان پر انکے رب نے بسبب انکے گناہوں کے
فَسَوّٰىهَا ۝۱۴ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝۱۵
پھر برابر کر دیا سب کو اور وہ نہیں ڈرتا اس کے پیچھا کرنے سے

سورۃ الشمس مکیہ

* انسانیت کا خلاصہ ہے انسان کا ارادہ۔ اس سے انسان کی قیمت معلوم ہوتی ہے ارادہ پیدا کرنے والے سامان کا ایک حصہ ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے دل میں چھوٹے چھوٹے خطرات پیدا ہوں ایک ہلکا سا خیال جو پانی کی بوند کی طرح انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اسے خطرہ کہا جاتا ہے۔ پانی کی بوندوں سے دریا بن جاتے ہیں اور پھر ہر ایک چیز کو بہا لے جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے دل میں خطرات پیدا ہوتے ہیں اور وہ جمع ہو کر ارادہ پیدا کر دیتے ہیں۔ اگر اچھا ارادہ پیدا کر دیا تو وہ اچھا آدمی ہے۔ اور اگر برا ارادہ پیدا کر دیا تو وہ برا بر آدمی ہے۔ اس درجہ (بھلے اور برے) میں یہی انسان کی تمیز ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کے دل میں اچھے اور برے خطرات کیوں پیدا ہوتے ہیں اور کہاں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا تفصیل سے جواب دینا ناممکن ہے۔ زمین و آسمان کے خالق کے سوائے کوئی شخص خطرات پیدا ہونے کے اسباب معین نہیں کرسکتا۔ مجمل طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس کائنات کا جو نظام ہے انسان اسکا ایک جزء ہے۔ اور وہ اس مجموعی نظام سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس نظام کے مختلف (۱) اثرات سے مختلف خطرات انسانی کی طبیعت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اب اگر وہ خطرات اچھے سمجھے جاتے ہیں تو سمجھیے کہ یہ انسان اس نظام میں بہت اونچے درجے والا ہے۔ یعنی اس نظام میں اس کا بہت بلند درجہ ہے۔ اور اگر خطرات ایسے ہیں کہ اس سے برا ارادہ پیدا ہوا تو سمجھیے کہ اس انسان کا درجہ اس نظام سے نیچے ہے۔ خطرات کی نوعیت کو معین کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے (یعنی اس کی قدرت سے باہر ہے) اس لیے انسان کے بس میں تو وہ چیز ہوتی ہے جو اس کے ارادہ کے اندر ہو۔ اور یہ خطرات ایسے ہیں کہ وہ خود ارادہ کو پیدا کرتے ہیں۔ جس اصول پر یہ نظام مختلف چیزیں پیدا

---

(۱) سوسائٹی، ملک، آب و ہوا، ضروریات معاشرہ، وسائل اور جسمانی طاقت اور عقل کے مد نظر پیدا ہوتے ہیں۔

کرتا ہے (جیسے سورج ہے کہ روشنی دینے میں اس کے مختلف درجے ہیں) اسی طرح یہ نظام مختلف قسم کے انسان پیدا کرتا ہے تو یہ حصہ کہ یہ مختلف کیوں بنتے ہیں انسانیت کے علوم سے خارج چیز ہے۔ اولاً خطرات پیدا ہوتے ہیں پھر جن خطرات کو عقل مستحسن سمجھتی ہے اس کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے اگر مضبوطی سے انہوں نے جگہ کرلی تو عقیدہ پیدا ہوتا ہے اور عقیدہ سے ارادہ پیدا ہوتا ہے اور ارادہ سے عمل۔ یہ درجات ہیں عمل کے اگر ان خطرات کو عقل نے جگہ نہ دی تو وسوسہ کہلاتا ہے۔ اور قدرے جگہ دی تو ظن ہوا اور اگر اس سے بڑھا تو شک ہوا۔ اور مضبوط ہوا تو عقیدہ ہے انسانی علوم میں پہلا درجہ یہ ہے کہ اس میں یہ تمیز پیدا ہوا کہ کون سا ارادہ اچھا ہے اور کون سا ارادہ برا ہے۔ یعنی انسان اپنے ارادہ کی صحیح قیمت سمجھ لے۔ اچھے برے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نمبر اول، دوم اور سوم ہے۔ اس سے زیادہ کوئی مطلب نہیں ہے۔

* اس سورت کے شروع میں خطرات کے اسباب گنا دیے گئے ہیں ان سے انسان خود اندازہ کرسکتا ہے کہ تمام انسان ایک قسم کا ارادہ پیدا ہی نہیں کرسکتے۔ آیت ۱ **والشمس وضحها** (۱) سورج اور اس کی روشنی گواہ ہے۔ سورج اور اس کی روشنی انسان کے دل میں خطرات پیدا کرتی ہے انسان کے علم کو روشن کردیتی ہے۔ اور اس کی گرمی اور روشنی سے متاثر ہوکر انسان کے دل میں خطرات پیدا ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ تو سورج اور اس کی روشنی کا اثر تمام انسانوں پر یکساں کبھی نہیں ہوتا اس لیے یہ توقع رکھنا کہ تمام انسان ایک ہی قسم کے خطرات کیوں پیدا نہیں کرتے یہ عبث ہے۔ آیت ۲ **والقمر اذا تلها** اور چاند جب کہ اس سے پیچھے آتا ہے تو یہ بھی اسی طرح خطرات پیدا کرنے کا مستقل سبب ہے۔ آیت ۳ **و النهار اذا جلّها** اور دن جب کہ اسے سورج چمکادے۔ یعنی سورج کے چمکنے سے دن پیدا ہوتا ہے۔ تو دن بہت روشنی والا مراد ہے۔ اب اس تیز روشنی سے مختلف قسم کی روشنیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ نباتات، حیوانات اور انسان کے مختلف نظام دن کو سمجھ میں آجاتے ہیں ان کی حرکتیں اور ان کا نظام وغیرہ بہت سی چیزیں سمجھ میں آنے لگ جاتی ہیں۔

---

(۱) اول روشنی طلوع کے وقت۔

آیت۴ و اللیل اذا یغشاھا اس طرح جب رات سورج کو ڈھانپ لے تو مختلف ستارے اور زمین کی مختلف چیزیں ایسی پیدا ہوتی ہیں کہ ان سے آگے مختلف قسم کی چیزیں اور پیدا ہوتی ہیں اور اس سے مختلف قسم کے خطرات پیدا ہوتے ہیں۔ آیت۵ و السماء و ما بناھا (۱) اور آسمان جس حکمت سے بنایا گیا ہے اور اس میں جو نظام قائم ہے اگر انسان اس کی حکمت غور کرنے لگے تو اس کے دل میں مختلف قسم کے خطرات آئیں گے یعنی اگر وہ سلسلۂ علل پر غور کرے گا تو کسی نظام میں پریشان ہوگا اور کسی میں یقین کرے گا وغیرہ۔ آیت۶ و الارض و ماطحٰھا (۲) اور زمین اور وہ حکمت جس نے اس کو پھیلادیا ہے زمین کے پھیلنے کے بعد علل یعنی معلومات کا سلسلہ سامنے آجاتا ہے کہ نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے انسان بنے۔

* آیت۷ و نفس و ماسوّاھا (۳) اور انسانی نفس۔ نفس سے مراد ہے انسان کی انانیت جسے انسان انا (یعنی میں) سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس حکمت کو دیکھے جس نے اسے برابر بنایا یعنی انسانی نفس کو درست کیا ہے، تو اس کو ایک شیشہ کے مانند سمجھے کہ بعض میں اثر دیر سے ہوتا ہے او بعض میں کم۔ خطرات تو باہر سے آتے ہیں مگر ان کا اثر مختلف ہوتا ہے۔ آیت۸ فالھمھا فجورھا و تقواھا نفوس انسانی میں فرق ہے انسان کے دل میں جو خطرات باہر سے یا الہام کے ذریعہ جمع ہوتے ہیں انکے متعلق جو انسان میں قوت فیصلہ ہے وہ فیصلہ کرتی ہے یعنی وہ بعض خطرات کو اچھا سمجھتی ہے اور بعض کو برا پہلے کسی چیز کو انسان کی طبیعت اچھا سمجھتی ہے مگر بعد میں وہ سمجھتی ہے کہ اس نے غلطی کی تو ان نفوس میں بھی انسان مختلف درجے کے ہیں اور ایک درجہ پر نہیں ہیں۔ آیت۹و۱۰ قد افلح من زکھا یہ تمام چیزیں (۱ تا ۸) اس بات پر گواہ ہیں کہ جس شخص نے اچھا ارادہ کیا وہ کامیاب ہوگیا یعنی جس نے اپنے

---

(۱) الہیات کے عالموں کے لیے ہے کہ ان تینوں آیات (فقط سماء، ارض، نفس) کو نہ دیکھو بلکہ اس حکیم قادر کو بھی دھیان میں رکھو۔ اسی طرف اشارہ ہے۔

(۲) طبقات الارض کے ماہروں کے لیے۔

(۳) سائیکلوجی کے علماء کے لیے۔

نفس کو پاک بنایا وہ کامیاب ہوگیا اور اس شخص نے نقصان اٹھایا جس نے اپنے نفس کو نیچے گرایا۔ یہ انسانیت کے اصول میں سے ایک چیز ہے جس کی انسان کبھی خلاف ورزی نہیں کرسکتا اور یہ کہ انسان نے جو خطرات اپنی طبیعت میں جمع کیے ہیں یعنی ان اسباب کی علتیں نظام قدرت ہیں۔ وہ اگر نفس کو ترقی دینے والے ہیں تو انہیں انسان اچھا سمجھتا ہے اور اگر وہ انسان کو پیچھے ہٹانے والے ہیں تو وہ ان کو برا سمجھتا ہے۔ یہ نوع انسانی کا فطری تقاضا ہے، اس کا پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ ایک فرد کے لیے خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے نوعی خواص کا زیادہ جامع ہو۔ فرد کے اچھے ہونے کا فقط یہی مطلب ہے۔ اب ہر بڑھنے والے انسان کے لیے جس کے پاس اس قدر خطرات جمع ہیں کہ وہ اس کو آگے بڑھاتے ہیں اور ترقی دیتے ہیں تو انسانی نوع کا فیصلہ ہے کہ آگے بڑھیں اور ترقی کریں اسی طرح نوع انسانی کا فیصلہ ہے کہ ہر پیچھے ہٹنے والے انسان کی ترقی روک دی جائے۔ اب نوع انسانی کی ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ برے خیالات کا جو مجموعہ پیدا ہوچکا ہے اس کی ترقی کو روک دیا جائے۔ اور جو علتیں خطرات پیدا کرنے والی ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ خطرات کی رفتار قائم رہے اور اسے ختم نہ کیا جائے اب اس جگہ دو متعارض (مخالف) علتیں اکٹھی ہوگئیں۔ ایک ان کو پیچھے لے جانا چاہتی ہے اور ایک چیز ان کے پیچھے جانے کو روکنا چاہتی ہے۔ اس انسانی نفس کے گردا گرد جس قدر مصلحتیں جمع ہیں ان کا عام تقاضا جب تک خطرات کے اسباب کے موافق ہوگا انسانی نوع کا تقاضا مغلوب رہے گا اور ظاہر نہیں ہوگا۔ اور جہاں مصالح عامہ کی تائید خطرات کے اسباب کے لیے جو حاصل تھی ختم ہوگئی تو اسی وقت انسان کا نوعی تقاضا اپنا کام کرجائے گا اور اس کی ترقی بند کردی جائے گی۔

* آیت ۱۱ **كذبت ثمود بطغواها** اب اس قاعدہ کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال ہے کہ ثمود نے حدود انسانیت سے باہر قدم رکھ کر اپنے نبی کی تعلیم کا انکار کردیا (جھٹلایا)۔ آیت ۱۲ **اذ انبعث اشقاها** ثمود کے قبیلہ کا بدترین انسان کھڑا ہوا۔ یہ امیر تھا سرمایہ اور مویشی اس کے پاس بہت تھے۔ آیت ۱۳ **فقال لهم رسول الله۔ الآیہ** یہ اونٹنی اور اس کے پانی پینے کا قانون الٰہی قانون ہے۔ اس نظام

کے ذریعے سے اس زبردست قوم میں جو غریب لوگ رہتے تھے ان کے اونٹوں کو پانی کا سامان ملتا تھا۔ اور اس طرح ظالموں کی قوت کو کم کرنے کے لیے یہ اونٹنی ایک میزان تھی۔ آیت ۱۴ **فکذبوہ فعقروھا** انہوں نے اونٹنی کو ذبح کردیا۔ یہ لوگ غرباء کو چوپایہ مال رکھنے نہیں دیتے تھے۔ اگر کسی کے پاس ہوتا تو پانی پر قیود ڈالتے اور بہت دنوں کے بعد ان کی باری آتی۔ **فدمدم علیھم ربھم** تو اللہ تعالی نے ان کو برابر یعنی ختم کردیا۔ یہ نوع انسانی کا تقاضا تھا کہ ایسی قوم کو زیادہ تنزل کی طرف نہیں جانے دینا چاہتی۔ بظاہر یہ پوری قوم ایک اونٹنی کے ہلاک ہونے کی وجہ سے ہلاک کی گئی۔ آیت ۱۵ و **لایخاف عقباھا** مگر اس نظام قدرت پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ ایک چھوٹی سی مصلحت پر بڑی مصلحت قربان کردی گئی۔ اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالی کو اس واقعہ کی عاقبت سے کوئی ڈر نہیں ہے۔ عام طبیعتوں میں جو اس واقعہ سے نظام قدرت میں اعتراض پیدا ہوسکتا ہے وہ اعتراض اس جگہ نہیں پیدا ہوسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام نوع انسانی کا جو نظام تھا اس کو توڑنے کی پاداش میں یہ لوگ ہلاک کیے گئے۔ اونٹنی تو صرف ایک مجسمہ یعنی مثال ہے۔ اس لیے عقلمند آدمی اس پر کبھی اعتراض نہیں کرسکتے۔ یہ خدائی اونٹنی جو صالح علیہ السلام کی دعا سے تھی اس سے ان کو یقین آگیا تھا کہ صالح علیہ السلام اللہ کے فرستادہ ہیں اور جو کچھ وہ ہم کو بتاتے ہیں راست ہے۔ اس سے ان کو بصیرت آگئی تھی۔ مگر سرمایہ پرستی نے ان کو اندھا کردیا تھا۔ وہ مساکین سے مال چھین لیتے تھے۔ چونکہ اس ناقہ کی باری میں وہ طبقۂ غرباء کا پانی پیتا تھا اور دولتمندوں کا چوپایہ پانی کے قریب نہیں پھٹکتا تھا یہ معجزہ حسب حال ان کے تھا۔ مگر سرمایہ پرستی کے خطرات ان میں بہت جمع ہوگئے تھے اس لیے انہوں نے اس ناقۃ اللہ کو ذبح کرڈالا اور اپنے غصہ کو اس طرح فرو کردیا تو عذاب قدرتی نے ان کو تباہ کیا۔

سُورَةُ اللَّيْلِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ إِحْدَى وَعِشْرُونَ آيَةً

سورۃ الليل مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی اکیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ﴿١﴾ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ﴿٢﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ

قسم رات کی جب چھا جائے اور دن کی جب روشن ہو اور اسکی جو اس نے پیدا کیے نر

وَالْأُنثَىٰ ﴿٣﴾ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ﴿٤﴾ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ﴿٥﴾

اور مادہ تمہاری کمائی طرح طرح پر ہے ف۹ سو جس نے دیا اور ڈرتا رہا

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ﴿٦﴾ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ﴿٧﴾ وَأَمَّا مَنْ

اور سچ جانا بھلی بات کو تو اسکو ہم سہج سہج پہنچا دینگے آسانی میں ف۱ اور جس نے

بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ﴿٨﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ﴿٩﴾ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ﴿١٠﴾

نہ دیا اور بے پروا رہا اور جھوٹ جانا بھلی بات کو سو اسکو ہم سہج سہج پہنچا دینگے سختی میں ف۱۱

وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ﴿١١﴾ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ﴿١٢﴾

اور کام نہ آئیگا اسکے مال اس کا جب گڑھے میں گرے گا ف۱۲ ہمارا ذمہ ہے راہ سمجھا دینا

وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ﴿١٣﴾ فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ﴿١٤﴾

اور ہمارے ہاتھ میں ہے آخرت اور دنیا ف سو میں نے سنا دی تم کو خبر ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی ف

لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ﴿١٥﴾ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٦﴾ وَ

اس میں وہی گریگا جو بڑا بدبخت ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا ف۱۳ اور

سَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ﴿١٨﴾ وَ

بچا دینگے اس سے بڑے ڈرنے والے کو ف۱۴ جو دیتا ہے اپنا مال دل پاک کرنے کو ف۵ اور

مَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ ﴿١٩﴾ إِلَّا ابْتِغَاءَ

نہیں کسی کا اس پر احسان جس کا بدلا دے مگر واسطے چاہنے

وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ﴿٢٠﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ﴿٢١﴾

مرضی اپنے رب کی جو سب سے برتر ہے۔ اور آگے وہ راضی ہوگا ف۶

سورۃ اللیل مکیہ

* انسان کی قوت ارادیہ پر جو مضمون پچھلی سورت میں تھا۔ یہ سورت اس کا تتمہ ہے۔ پہلے فقط ارادہ پر بحث کر چکے ہیں۔ اب جب ارادہ جاننے کے بعد انسان کام کرتا ہے تو کام کی تفاصیل پر بھی نظام قدرت اسی طرح مؤثر ہوتا ہے جس طرح اس نے خطرات ڈالنے میں کام کیا تھا۔ مثال کے طور پر دو آدمی لیجیئے کہ وہ ایک ہی ارادہ لے کر کام کرنا چاہتے ہیں مگر دونوں کا ماحول مختلف ہے یعنی ایک سرد اور دوسرا گرم ملک میں ہے۔ یا وہ کسی اور مختلف قسم کے ماحول میں رہتے ہیں تو ان مخالف ماحولوں کے اثرات سے انسان کے کام کے نتائج بھی مختلف قسم کے ہوجائیں گے خلاصہ یہ نکلا کہ ہم جب دو انسانوں کے مختلف کام دیکھتے ہیں تو اس اختلاف کی علتیں دو علیحدہ علیحدہ درجوں میں نظر آتی ہیں۔ چونکہ ارادے مختلف تھے۔ اس واسطے کام کے نتائج بھی مختلف ہوں گے اور یہ ارادوں کے اندرونی نظام سے تعلق رکھتا ہے اس لیے کہ خطرات مختلف تھے دوسرا درجہ یہ ہے کہ عمل کے ماحول کے مختلف ہونے سے عمل میں بھی اختلاف پیدا ہوجائے گا۔ آیت ۱و۲ **و اللیل اذا یغشیٰ و النھار اذا تجلیٰ** یہ ہے عمل کے ماحول کے اختلاف سے پیدا ہونا ایک کام اگر رات کو کیا جائے یا دن کو کیا جائے وہ اگرچہ ایک ہی چیز ہے مگر اس میں اختلاف ہونا ضروری ہے۔ دن والا کام بنسبت رات کے زیادہ مکمل ہوگا۔ آیت ۳ **و ماخلق الذکر و الانثیٰ** اور جس حکمت سے نر اور مادہ پیدا کیا نر اور مادہ کی داخلی قوتوں میں اختلاف ہے ارادہ کے اندر جو خطرات ہیں یہ ان کی مثال ہے۔ آیت ۴ **ان سعیکم لشتیٰ** یہ دونوں چیزیں گواہ ہیں کہ تمہاری کوشش اور اعمال مختلف ہیں اور یہ ایک ہو ہی نہیں سکتے۔ ارادے کے جوہر اختلافات سے اور عمل کے ماحول کے مختلف ہونے سے کھل جائیں گے۔

اب ان اعمال سے جو نتائج نکلیں گے ان کا سلسلہ آخر تک نکلتا جائے گا۔ اب آگے چل کر انبیاء کی تعلیم سے انسان دو قسم کے بن گئے اور آگے جنت اور دوزخ میں

مختلف ہوں گے، تو یہ سارے ماحول سے اختلافات کے باعث ہیں۔ اور نہ تمام اختلافات انسانی فطرت کے ذاتی تقاضے ہیں۔ مختلف اعمال سے جو مختلف نتائج نکلتے ہیں ان پر بحث کی جارہی ہے۔

* آیت۵ فاما من اعطیٰ جس نے اچھے کام کیے مثلاً محتاجوں کی رفع ضرورت کے لیے روپیہ دیا۔ واتقی اور انصاف قائم کرنے میں مؤید ہوا۔ آیت۶ و صدق بالحسنیٰ اور اس نے اچھی بات کی تصدیق کی یعنی ایک شخص کے دماغ میں جو خطرات جمع ہوئے اور عمل کے لیے جو ماحول میسر ہوا اس نے یہ نتیجے پیدا کردیے۔ اچھے اخلاق پیدا کرنا اور اچھے اعمال کرنا انسانی فرائض سے سمجھتا ہے اور عملاً اس کی تصدیق کرتا ہے۔ آیت۷ فسنیسره للعسریٰ جب یہ عمل ہوا تو اس کا نتیجہ بھی چاہیے تو ہم اس کے لیے آسان موقع بھی پیدا کردیں گے۔ روحانی اور اخلاقی ترقی تدبیر منزل وغیرہ۔ آیت۸ و اما من بخل و استغنیٰ اور اس کے خلاف جس شخص کے خطرات اور ماحول نے ایسے عمل پیدا کرائے جن کا اس آیت میں ذکر ہے کہ یہ شخص روپیہ کماتا ہے مگر محتاجوں کی ضرورت میں خرچ نہیں کرتا (بخل) اور چونکہ اس کے ساتھ ظلم نہیں ہوتا س واسطے وہ انصاف کا خواہشمند نہیں ہے۔ (استغنیٰ) آیت۹ و کذب بالحسنیٰ اور اچھی بات کی قدر نہیں کرتا۔ غریبوں سے مال حاصل کرتا ہے اور [illegible] ن سے [illegible] نے کا بندوبست نہیں رکھتا۔ یہ شخص کسان سے کمتر عقل رکھتا ہے کسان بیلوں کے ذریعہ اناج پیدا کرتا ہے مگر ان کو موٹا تازہ رکھتا ہے کہ پھر بھی ان سے کمائی کرنی ہے۔ آیت۱۰ فسنیسره للعسریٰ تو اب ایسے آدمی کے لیے اس کے عمل کا نتیجہ ہونا ضروری ہے۔ اس واسطے ہم اس کے آسان راستہ کو بھی مشکل کردیتے ہیں یہ عام انسانی نوع کا تقاضا ہے۔ اس کا اس پر اثر ہونا ضروری ہے۔ چ[illegible] ستہ سے اس کا راستہ مساوی نہیں ہوسکتا۔ انسانیت کبھی اس کا تقاضا نہیں کرسکتی اس سرمایہ پرست کے سب انسان دشمن بن جائیں گے اور اس کو قتل کرنے اور تنگ کرنے سے اس کا قافیہ تنگ کریں گے۔ آیت۱۱ و مایغنی عنه ماله اذا تردیٰ اب غلط روی کی مصیبت اسے اس واسطے آئی کہ اس نے مال

کو ٹھیک جگہ پر صرف کرنے کا ارادہ نہیں کیا اس واسطے جب وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔ آیت ۱۲ ان علینا للھدیٰ اسی طرح انسانی اعمال سے جب مختلف نتیجے پیدا ہوتے ہیں تو لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری ہدایت کے عنوان بدل جاتے ہیں انسانی نوع پر جو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اس کا تقاضا ہے کہ انسان کی رہبری کی جائے چنانچہ جو ہدایت کرنی ہے وہ ہم نے انبیاء کے ذریعہ کردی ہے۔ آیت ۱۳ و ان لنا للاخرۃ و الاولیٰ اور ہمارے ہی لیے ہیں دوسرے اور پہلے نتائج۔ دونوں کا انتظام ہم نے کردیا۔ ایک چیز کا پہلے ایک نتیجہ نکلے گا پھر دوسرا اور پھر تیسرا اسی طرح یہ تمام ہمارا بنایا ہوا نظام ہے۔ اور سب کا رجوع ہماری طرف ہے۔

* آیت ۱۴ فانذرتکم نارا تلظیٰ اب ہماری رہبری کا عنوان بدل گیا کہ ہم ان لوگوں کو ان کی غلط روی سے ڈراتے ہیں۔ آیت ۱۵ لا یصلھا الا الاشقیٰ وہ جھٹلاتا ہے۔ غرض ڈرانے اور دھمکانے سے آگے چل کر لڑائی ہوجائے گی۔ تو یہاں فقط انسان کی ہدایت کا عنوان بدل گیا ہے یعنی ہم ڈراتے ہیں کہ دوزخ میں وہ بدبخت گرے گا، جس نے جھٹلایا اور پھر مقابلہ کرنے پر تیار ہوگیا۔ دیکھو غلط راستے پر چلنے والے کو ڈرانے سے ہدایت دیتے ہیں تاکہ یہ سمجھ جائے یہ دھمکی ریا کشنری طاقت کو روکتی ہے۔ اور اگر دھمکی سے نہ رکے گی تو پھر لڑائی شروع ہوجائے گی۔ آیت ۱۷ تا ۲۰ و سیجنبھا الاتقیٰ الذی مال حاصل کرنے میں بعض اوقات فروگذاشت ہوجاتی ہے۔ معاملات میں حقوق کا پورا حساب نہیں ہوسکتا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو مال کی ضرورت ہے ان کو کسی معاوضہ کے بغیر وہ روپیہ دیا جائے۔ اس کا کسی پر احسان نہیں ہے کیوں کہ وہ اس کا کفارہ دے رہا ہے۔ آیت ۲۰ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ اعلیٰ رضا یہ ہے کہ فقط اعلیٰ اوصاف پیدا کیے جائیں وہ فقط انصاف کے قائم رکھنے کے لیے اپنے نفس پر جرمانہ کرتا ہے۔ آیت ۲۱ و لسوف یرضیٰ جب اللہ تعالیٰ کے اس قانون کو قائم رکھے گا تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی رہے گا اس کے کام چونکہ انسانی نوع کی ترقی کے مطابق ہیں اس لیے

ضروری ہے کہ ان کو ترقی دی جائے مفسرین نے اس جگہ یہ غلطی کی ہے کہ ان آیات کو خاص خاص صحابہ کے حالات پر منطبق کردیا ہے۔ اور حالت یہ ہے کہ یہاں کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ایک قاعدہ بتایا جارہا ہے مگر ان مثالوں سے شیعہ اور سنی کے جھگڑے برپا کرنے کا سامان بہم پہنچ گیا ہے۔

سُوْرَةُ الضُّحٰی مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۃ الضحیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالضُّحٰى ۝۱ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا

قسم دھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھا جائے ۔ رخصت کر دیا تجھ کو تیرے رب نے اور نہ

قَلٰى ۝۳ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴ وَلَسَوْفَ

بیزار ہوا ف اور البتہ پچھلی بہتر ہے تجھ کو پہلی سے ف اور آگے

يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝۵ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا

دیگا تجھ کو تیرا رب پھر تو راضی ہوگا ف بھلا نہیں پایا تجھ کو یتیم

فَاٰوٰى ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَوَجَدَكَ

پھر جگہ دی ف اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سمجھائی ف اور پایا تجھ کو

عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹ وَاَمَّا السَّآئِلَ

مفلس پھر غنی کر دیا ف سو جو یتیم ہو اس کو مت دبا ف اور جو مانگتا ہو

فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱

اس کو مت جھڑک ف اور جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر ف

سورۃ الضحیٰ مکیہ

* پچھلی دونوں سورتیں قرآن مجید کی حکمت کے اصول میں نہایت اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں اس مشکل مسئلہ کو اس وضاحت سے نہ تو کسی حکمت کی کتاب نے اور نہ کسی کتاب الٰہی نے حل کیا ہے۔ مگر ان موٹی عقل والوں کا برا ہو کہ وہ فلسفے اور حکمت کے نام سے قرآن مجید کی آیات کو حل کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اور عام مفسرین کی یہ حالت ہے کہ وہ لے دے کر یہ کہتے ہیں کہ یہ سورتیں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فضیلت میں آئی ہیں وریہی ان کا آخری تیر ہے۔ مانا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ان آیات سے مناسبت تھی مگر ان آیتوں کو کسی خاص شخص کے فعل سے کیا تعلق؟ اور جو جھگڑے اسلام میں پچاس برس بعد پیدا ہوئے بلکہ کوئی سو یا ڈیڑھ سو برس بعد پیدا ہوئے، وہ تمام جھگڑے قرآن مجید میں لاکر رکھ دیے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو آدمی قرآن مجید کو پڑھنا چاہے وہ پہلے ان جھگڑوں سے نمٹ لے اور اس کے بعد قرآن مجید پڑھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اختلاف اصل میں سیدنا عثمانؓ سے ہوا تھا۔ مگر شیعوں (حضرت علیؓ کے طرفدار لوگوں) نے سو برس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ پر بھی اعتراض کرنے شروع کردیے۔ ان آیات کو جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان میں خاص کردیا جائے تو جو لوگ صحابہ کرام کے مخالف ہیں (یعنی شیعہ) وہ اس جھگڑے میں گویا قرآن مجید پڑھنے سے محروم ہوگئے۔ نبی اپنے زمانے میں انسانیت کا مجسمہ ہوتا ہے اس کے حالات سے عام انسانی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ اور حکمت انسانی شروع کرنے والے لوگوں کے لیے پہلے انہی مثالوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اب انسانیت کا ایک عام مسئلہ ہے کہ انسانیت ہمیشہ علم کی روشنی میں ترقی کرتی ہے۔ اور انسانیت پر جو تنزل کے دور آتے ہیں وہ عارضی ہوتے ہیں اس کے طبعی ارتقاء کو روکا نہیں جاسکتا۔ یہ مسئلہ اس سورت میں بتلایا گیا ہے مگر رسول کریم ﷺ کی مثال میں۔

* شروع نبوت میں اتفاقی واقعہ ہوا کہ وحی چند روز آکر رک گئی مکہ کے مخالف لوگوں

نے استہزا شروع کر دیا اور آپ کی طبیعت پر بھی اسکا بہت برا اثر ہوا یہاں تک کہ آپ کا جی چاہتا تھا کہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر اپنے آپ کو نیچے گرادیں اس حالت میں روح القدس آپ کو تسلی دیتے ہیں اور آپ یہ خیال چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ پریشانی آپ کو تقریباً چالیس دن تک رہی۔ اور اس پریشانی کے ختم ہونے پر یہ سورت نازل ہوئی۔ آیت ۱ **والضحیٰ** جس طرح دوپہر کے وقت دن تیز ہوتا ہے اس کی قسم ہے۔ آیت ۲ **واللیل اذا سجیٰ** اور رات جب وہ اندھیرا کر دے وہ گواہ ہے کہ آیت ۳ **ما ودعک ربک و ما قلیٰ** تیرے پروردگار نے نہ تو تجھے چھوڑا ہے اور نہ تجھ سے ناراض ہوا۔ یعنی جس طرح دوپہر کے بعد رات آتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے بعد دوسرا دن ہی نہیں آئے گا۔ دن کے بعد رات کا نہ آنا بذات خود نظام کی بربادی ہونے کی دلیل ہے۔ تو اس سے یہ نتیجہ کبھی نہ نکالنا چاہیے کہ ترقی کے بعد اگر چند روز حالت اس کے برخلاف ہو جائے تو یہ سمجھ لیا جائے کہ بس اب ترقی بند ہو گئی۔ جیسے رات کے بعد دوسرا دن اس کی تکمیل کر دیتا ہے ایسے ہی اس بندش وحی کے بعد جو وحی آئے گی وہ اس بندش کی تکمیل کر دے گی۔ اور آئندہ تیری تعلیم کی ترقی کے دور بھی اسی طرح ہوں گے جس سے انسانیت ترقی کرے گی۔ آیت ۴ **و للاخرۃ خیر لک من الاولیٰ** پہلی حالت کی بنسبت تیرے لیے پچھلی حالت بہتر ہے۔ یہی ارتقا ہے کہ ہر پچھلی حالت پہلی حالت سے اچھی ہو۔ عام مفسرین نے اس کو دنیا اور آخرت پر محمول کر کے اس کے مضمون کو ذرا کمزور کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر پچھلی حالت پہلی حالت سے اچھی ہوتی رہے گی۔ یہاں تک کہ جو کچھ تیرا مقصد ہے وہ پورا ہو جائے۔

* آیت ۵ **و لسوف یعطیک ربک فترضیٰ** تجھے تیرا پروردگار دے گا، اور تو راضی ہو جائے گا۔ اب اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول نبوت کے زمانے میں رسول کریم ﷺ کے دل میں کوئی مقصد تھا وہ مقصد یہ تھا کہ ہماری قوم کی جو بری حالت ہے وہ دور ہو جائے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی جو دعا ہے وہ میرے حق میں پوری اترے اور وہ کام میں کروں۔ اس لیے کہ یہ لوگ (عرب) اس دعائے ابراہیمی کو نسل در

نسل نقل کرتے چلے آئے ہیں بعینہ اسی طرح جس طرح آج کل مسلمان حضرت مہدی کا انتظار کر رہے ہیں۔ غرض اس میں وعدہ دیا گیا ہے کہ اے رسول! تیری حالت میں ارتقا ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ تیرا مطلب پورا ہو جائے۔ دوسری قوموں سے مباحثہ کرنے والے مسلمانوں نے نبوت کے یہ معنی مقرر کیے ہیں کہ نبی کے دل میں کوئی خیال نہیں ہوتا۔ اور خدائے تعالیٰ اپنی طرف سے نبی کے دل میں زبردستی ایک بات ڈال دیتا ہے۔ ان مباحثہ کرنے والے مسلمانوں کے اس قاعدہ کا لحاظ رکھ کر ان کے مقلد یہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا اب اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کے سامنے ایک اعلیٰ مقصد تھا۔ اس واسطے وہ اب اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ مقصد یہ تھا کہ آپ قیامت کے دن اپنی امت کو بخشوا لیں گے۔ مناظرہ کرنے والے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ جو آدمی کوئی کام کرے اس میں پہلے اس کام کرنے کی استعداد ہونی چاہیے۔ اسی طرح نبی جو نبوت کا کام سرانجام دے گا اس کے لیے نبوت کی استعداد ضروری چیز ہے۔ تو رسول کریم ﷺ کی طبیعت میں طبعی طور پر یہ بات آئے گی۔ کہ ان کی قوم ذلت سے بچے۔ اور ان کی قوم میں جو تاریخی فخر رکھا گیا ہے وہ قوم کو حاصل ہو۔ امت کے بخشوانے کا مسئلہ زیادہ تر مسیح علیہ السلام کے کفارہ کی نقل ہے اور یہ دوسری صدی کے بعد ہوا، جب مسلمان عیسائی قوموں سے ملے۔

* آیت ۶ **الم یجدک یتیماً فاوی** آپ کی زندگی کا ابتدائی واقعہ ہے کہ آپ کے لیے بچپن ہی میں مصیبت پڑ گئی۔ آپ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے ایسا سامان پیدا کر دیا کہ آپ کے خاندان کا سب سے بڑا آدمی (عبدالمطلب) آپ کی تربیت پر لگ گیا۔ لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب نبوت کی تعلیم ختم ہو جائے گی۔ یعنی آپ چونکہ خاتم الانبیاء ہیں اور نبوت کے خاتمے کی طرح اب نبوت کی تعلیم بھی پوری ہو جائے گی۔ اس واسطے اب یہاں سمجھایا جا رہا ہے کہ لوگوں کو ایسا خیال نہیں کرنا چاہیے ان کو رسول کریم ﷺ کی ابتدائی زندگی پر غور کرنا چاہیے کہ آپ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے اور آپ کا یتیم ہونا ایک قدرتی واقعہ تھا۔ اللہ

تعالی نے آپ کی پرورش کا خیال پہلے آپ کے دادا کے اور ان کے بعد آپ کے چچا کے دل میں زیادہ شدت سے ڈال دیا اب آپ کے لیے کوئی ایسا موقع نہیں تھا جس میں آپ کو ترقی نہ ہوئی ہو۔ آیت ۷ و وجدک ضالا فھدی رسول کریم ﷺ کے سامنے ایک مقصد تھا آپ اس مقصد تک پہنچنے کے لیے دماغ پر پورا زور لگاتے ہیں مگر اس کے متعلق کوئی راستہ نہیں پاتے۔ آپ کے دل میں یہ حیرانی اور گمراہی تھی۔ فھدی اللہ تعالی نے راستہ کھول دیا اور وحی کا آنا شروع ہو گیا۔ اقوام عالم کی آزادی کا نسخہ مل گیا اس کے دو جز تھے۔ ایک اقرء یعنی تعلیم اور دوسرا اللہ تعالی کی غلامی یعنی لا الہ الا اللہ کسی کی بادشاہی کا اقرار نہ کیا جائے بلکہ سلطنت اللہ تعالی کی ہے اس کی ہدایت کی۔

* عیسائی اور یہودی وغیرہ اپنے انبیاء کو بشریت کے اوپر فوق العادت ہستی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ان کی نقل میں مسلمان بھی انبیاء کی نسبت بشری احکام کا کھلے طور پر آج کل اقرار نہیں کرتے۔ عیسائی مسیح علیہ السلام کو خدا کہتے ہیں یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کہتے ہیں اور ہنود رامچندر اور کرشن کو خدا کہتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کا بھی جی چاہتا ہے کہ رسول کریم ﷺ میں بھی وہی شان الہی آ جائے۔ مسلمانوں میں اگر رسول کریم ﷺ کے متعلق بشریت کی باتیں ذکر کی جائیں (یعنی کہا جائے کہ آپ بشر تھے) تو وہ اسے پسند نہیں کرتے۔ آج کل مسلمانوں پر گمراہی کا لفظ بہت گراں گزرتا ہے اور اب اس کی تاویل بناتے ہیں کہ ایک رات ایسا اتفاق ہوا کہ رسول کریم ﷺ مکہ کے پہاڑوں میں کہیں راستہ بھول گئے اور گھر نہیں پہنچ سکے۔ تمام خاندان پریشان رہا اور آپ کی تلاش کرتا رہا مگر آپ نہ مل سکے۔ آخر میں اللہ تعالی نے خود ہی راستہ بتا دیا۔ اور آپ گھر پہنچ گئے یہ بچپن کا واقعہ ہے اور لوگ اس کو اس آیت کا مصداق بناتے ہیں۔ قرآن مجید میں واضح کر دیا گیا ہے ماکنت تدری بالکتاب و الا الایمان تو کتاب (پروگرام) اور قانون و ایمان یعنی نظریات صحیحہ (جس پر پروگرام کی بنیاد رکھی جاتی ہے) نہیں جانتا تھا اور ہم نے وہ تجھ کو بتلائے یہ اس آیت کی صحیح تفسیر ہے۔ آیت ۸ و وجدک عائلا عیال دار آدمی جسے خرچ کے لیے ضرورت ہو۔ رسول

کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ غنا اصل میں نفس کی غنا ہے۔ یعنی انسان کا نفس غنی ہونا چاہیے "تونگری بدل ست نہ بمال" اس میں شک نہیں کہ رسول کریم ﷺ کو بہت سی مالی ضرورتیں تھیں مگر اللہ تعالی نے آپ کو ایک غنی دل دیا تھا اور اس کا اثر آپ کے اہل بیت پر پڑا (اہل بیت بھی آپ کی طرح غنی دل رکھتے تھے) رسول کریم ﷺ تو ایک بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے مگر آپ کے اہل بیت کی بھی یہ حالت تھی کہ وہ تنگی کے موقع پر شکایت لب پر نہیں لاتے تھے۔ بڑے کام کرنے والوں کے لیے اس قسم کی اخلاقی قوت ایک بہت بڑی نعمت الہی ہے مفسرین اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ آپ کو ایک دفعہ کہیں سے تھوڑا سا مال حاصل ہوا اور وہ آپ نے خرچ کر، ا تو اس آیت کی تفسیر میں اس تھوڑے مال کا ذکر کرنا ایک بہت بھاری غلطی ہے اس لیے کہ وہ مال رسول کریم ﷺ کی تمام زندگی کے لیے کبھی کافی نہیں ہوسکتا تھا تو چند روز، استغناء کا قرآن مجید کی تمام زندگی کے لیے کبھی کافی نہیں ہوسکتا تھا تو چند روزہ استغناء کا قرآن مجید میں کیسے ذکر ہوسکتا ہے۔ جبلی قوموں میں یہ عادت ہے کہ جب ان کا رئیس سخی اور مطعم ہوتا ہے تو اس کی قوم اپنے مال میں سے کچھ حصہ خود بخود ہے دیتی ہے تا کہ وہ خرچ کریں اور ہماری قوم کی ناموری ہو۔ اسی طرح اکثر بنی ہاشم اپنا مال آنحضرت ﷺ کو دیتے تھے مفسر کو چاہیے کہ ہمیشہ حالات پر نظر رکھے۔

* آیت۹ **فاما الیتیم فلاتقھر** رسول کریم ﷺ کے طبعی حالات اور اگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ عنایت الہی آپ کو ترقی کے راستے پر چلا رہی ہے اس لیے چند روزہ وحی کی بندش کو کیسے نقصان سمجھ لیا گیا ہے۔ یتیم کی صفت لازمی ہے بے کسی اور محتاجی، یعنی بے کسوں کی ہمت بڑھاؤ ان کے پشتیبان بنو، اگر آپ نے ان کی ہمت نہ بڑھائی تو ان کی کمر ٹوٹ جائے گی:

چہ غم دیوار امت را چو باشد نوح پشتیباں

چالیس دن کے قریب قریب آپ پر وحی نہیں آئی تو اس کی حکمت یہ تھی کہ اس وحی کی بندش کے زمانے میں اپنے لیے پیرو کار جمع کیے جائیں اور ان کو اپنے پروگرام کی تعلیم دی جائے اور یہ کام ساتھ ساتھ ہوتا چلا جائے۔ جس قدر قرآن مجید نازل ہوا ہے

سمجھنے والی اور سوچنے والی جماعت آپ کے پاس ہمیشہ موجود رہے۔ اب جو پیرو کار تلاش کرنے ہیں اس کے دو درجہ ہیں ایک تو یتیموں کے بچے کہ ان پر سختی کرنی چھوڑ دی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود بخود جمع ہوتے جائیں گے اور دوسرے سائل، یتیم کا لازمی وصف بے کسی ہے۔ بے کس و مظلوم جماعت کی مدد کرو۔ آیت ۱۰ و **اما السائل فلاتنهر** (۱) جو محتاج ہے اور لوگوں سے اپنی حالت بیان کر کے مانگ رہا ہے، اسے مت دھمکاؤ یعنی اس سے اخلاق سے پیش آؤ تو وہ بھی تمہارے پاس جمع ہوتے جائیں گے۔ محتاج کے ساتھ اگر اچھی بات کی جائے تو اس بات سے بھی اس کو سکون ملتا ہے۔ اور طالب علم کو نرمی سے سمجھاؤ۔ آیت ۱۱ و **اما بنعمت ربک فحدث** اپنے اللہ تعالی کی نعمت یعنی ان کو قرآن مجید سکھاؤ۔ غرض فرصت کا وقت جو دیا گیا ہے وہ اس کام کے لیے ہے کہ اس عرصہ میں اپنے پیروکار تلاش کیے جائیں گے جو آگے چل کر جماعتی طور پر مدد دے سکیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اگر چند روز تک وحی نازل نہیں ہوئی تو اس سے آپ کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ڈالی گئی۔ اسی طرح اگر نوع انسانی کے متعلق قیاس کیا جائے تو اس میں بعض واقعات ایسے نظر آتے ہیں کہ جن سے ان کی ترقی رک جاتی ہے۔ مگر جب گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ رکاوٹیں بھی ترقی کی بعض ضرورتیں پوری کرنے والی ثابت ہوں گی۔ رسول کریم ﷺ کو اپنی جماعت کو قرآن مجید سکھانے کی تاکید کی گئی ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ انسانی نوع علم سے ترقی کرتی ہے۔ آیت ۱۲ و **لسوف یعطیک ربک فترضیٰ** آنحضرت ﷺ اعقل اہل الارض و اعلم اہل الارض ہیں۔ آپ میں سب صفات و اخلاق اعلیٰ سے اعلیٰ موجود تھے اور آپ نہایت رحیم اور نرم دل تھے۔ کسی پر ظلم ہوتا ہوا دیکھ نہیں سکتے تھے اس لیے حلف الفضول بھی آپ کی سعی سے قائم ہوئی اور آپ اس کے ممبر تھے۔ ایک موقع پر جب ابوجہل نے ایک آدمی کا حق نہ دیا تو اس

---

(۱) سائل سے مراد طالب علم ہے یعنی طالب علموں پر رحم کرو۔ اکثر استادوں اور معلموں کو دیکھا جاتا ہے کہ طالب علم اگر کوئی بات پوچھے تو غصہ میں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نوکر نہیں ہیں، فی سبیل اللہ پڑھاتے ہیں۔

مظلوم شخص نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر شکایت کی۔ آپ ابوجہل کے گھر تشریف لے گئے اور دستک دی اور اس سے کہا کہ اس شخص کا حق دو۔ تو اس نے دے دیا۔ کیونکہ ابوجہل کو معلوم تھا کہ اگر آپ کے آنے پر بھی اس کو حق نہ دیا گیا تو تمام ممبر حلف الفضول جمع ہو کر مقابلہ کریں گے۔

* آپ نے عرب کی حالت بری دیکھی شام گئے وہاں کے آباد کاروں اور رعایا کی تباہ حالت دیکھی۔ یمن کی حالت معلوم تھی۔ ایک روایت ضعیف میں آتا ہے کہ آپ نے عراق کی حالت دیکھی۔ ان کی تباہ حالی تو حیوانوں سے بھی بدتر تھی (دیکھو حجۃ اللہ البالغہ) آپ کا یہ مقصد تھا کہ نوع انسانی کو ابتر حالت سے نکال کر اور غلامی سے نکال کر آزادی کے میدان میں لایا جائے یہ ایک ایسا نسخہ عطا ہوا ہے جو انسانیت کے لیے ابدالاباد تک مفید ہے۔ ایک یہ کہ **یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم و الذین من قبلکم، الی قولہ و انتم تعلمون** یعنی انسان کو تمدن کی حالت میں دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک آزادی رائے یعنی ان کی رائے بھی سنی جائے اور دوسرا پیٹ کا مسئلہ حل ہو جائے۔ تو اللہ تعالی نے فرمایا کہ لا الہ الا اللہ یعنی اللہ تعالی کی غلامی کرو، تمہارا خالق اور رب وہی ہے۔ اور جو تم میں رتبتاً یا زماناً بزرگ ہیں ان کا رب اور خالق وہی ہے۔ لعلکم تتقون تب تم جا کر عدالت قائم کرو گے (۱) یہ معنی ہے تقوی کا جس سے آزادی رائے پیدا ہوتی ہے۔ باقی رہا پیٹ کا مسئلہ زمین کو تمہارے لیے آزاد بنا دیا، اور سورج اور چاند کی روشنی مفت ہے اور برسات بھی آزادی سے برستی ہے اور میوے تمہارا رزق ہیں۔ اس زمین پر کسی کو مالکانہ قبضہ کرنے مت دو۔ اور اس پر خدا کی حکومت کے مقابلہ میں دوسری کوئی حکومت مت قائم کرنے دو۔ ورنہ وہ ٹیکس پر ٹیکس اور محصولات لگا کر تم کو غلام بنا لیں گے۔ و انتم تعلمون تمہاری کانشنس یہ قبول نہیں کرتی یعنی انسانوں کے دل سے اپیل ہے۔

* دوسری تعلیم اقرأ آپ کو یہ پسند تھا اور مرغوب تھا کہ انسانیت اس نسخہ کو قبول کر لے تو کہا گیا کہ ولسوف یعطیک جیسے ایک طالب علم کو کہا جائے کہ جتنے نمبر تم چاہتے

---

(۱) دیکھو غنیۃ الطالبین فصل فی التقوی۔

ہو لکھ دو۔ ہم اتنے ہی دے دیں گے یعنی اقوام عالم اس کو قبول کر لے گی۔ آپ کو عرب اور قیصر و کسریٰ کی رعایا کو ظلم سے چھڑانا تھا یہ پہلا مقصد تھا۔ نیز اقوام عالم یعنی تمام انسانیت کو بادشاہوں رہبان و احبار اور سرمایہ پرست کے ظلموں سے نجات دلوانی تھی تو آپ کو تسلی دی گئی کہ یہ سب کچھ آپ کو مل جائے گا۔

* حضرت مولانا مولوی نجم الدین صاحب مرحوم (پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور) فرماتے تھے کہ میرے خیال میں یوں آتا ہے کہ والفجر سے مراد ثمود کی قوم کی ہلاکت ہے اور ولیال عشر یعنی عشرہ محرم جس میں موسیٰؑ نے خروج کی تیاری کی اور والشفع والوتر سے مراد عاد ارم کی ہلاکت ہے۔ سبع لیال و ثمانیۃ ایام واللیل اذا یسر سے آنحضرت ﷺ کی مکہ مکرمہ کی ہجرت کی رات ہے جس سے بڑا انقلاب رونما ہوا۔ اس انقلاب کا پروگرام کلا بل لا تکرمون الیتیم الایہ سے شروع ہوتا ہے۔

سُورَةُ الْاِنْشِرَاحِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ اٰيَاتٍ

سورۃ الانشراح مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝١ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝٢ الَّذِيْٓ

کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ ف اور اتار رکھا ہم نے تجھ پر سے بوجھ تیرا جس نے

اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝٣ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝٤ فَاِنَّ مَعَ

جھکا دی تھی پیٹھ تیری ف اور بلند کیا ہم نے مذکور تیرا ف سو البتہ

الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٥ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦ فَاِذَا فَرَغْتَ

مشکل کے ساتھ آسانی ہے البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے ف پھر جب تو فارغ ہو

فَانْصَبْ ۝٧ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝٨

تو محنت کر اور اپنے رب کی طرف دل لگا ف

سورۃ الانشراح مکیہ

* یہ سورت مکیہ ہے۔ آپ کا دستور العمل یہ رہا کہ آپ نے مکہ میں جماعت تیار کی اور مدینہ میں حکومت استوار کی اور حدیبیہ کے بعد فاذا فرغت فانصب پر عمل کیا اور بڑی جنگ چھیڑ دی تاکہ جماعت کو تن آسانی کا موقع نہ ملے اور اخیر عمر تک و الی ربک فارغب پر عمل کیا۔ اللہ تعالی کو ہی اپنا پروردگار سمجھا، نہ حکومت کو۔ اور پیٹ پر پتھر باندھ کر حیات مستعار کو اختتام تک پہنچایا۔ رسول کریم ﷺ کی ترقی کے جس قدر سامان تھے ان کا پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ آپ کو وہ تمام سامان دے دیے گئے۔ آیت ا الم نشرح لک صدرک جو کام کرنا ہو اس کے متعلق جو علمی نظریے دیے جائیں وہ ایسے ہوں کہ طبیعت میں ذرا بھر بھی شبہ نہ رہے۔ اس کو عربی میں شرح الصدر کہتے ہیں۔ وہ ایسی حالت ہوتی ہے کہ جس سے کام کا مصمم ارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ طبیعت چاہتی ہے کہ یہ کام میں کرلوں گا۔ اس درجہ پر جب ایک نظریہ پہنچ جائے کہ انسان اسے اپنے بس کی چیز سمجھے اسے شرح الصدر کہا جاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کو بتلایا گیا کہ کیا ہم نے تیرے لیے شرح الصدر نہیں دیا۔ یعنی تو اس ارادہ کو پورا کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ اس قسم کی دعا حضرت موسی علیہ السلام کی قرآن مجید میں آتی ہے۔ رب اشرح لی صدری اسے سینے کے چیرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح رسول کریم ﷺ کے سینہ مبارک کو چیرنے کا اس جگہ کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی زندگی میں آپ کے سینہ چیرنے کا ایک واقعہ ہے مگر اس کو اس آیت کی تفسیر میں لانا زیادتی ہے۔ ہر معلم اور لیڈر کو معلوم ہے کہ جب تک اس کے دل سے تمام شکوک نہ رفع ہو جائیں اور دل میں کوئی شبہ اس کام یا علم میں نہ رہے اور اس کام کی سرانجامی کی تمام تجویزیں سمجھ میں آجائیں اور اس کے موانع کے رفع کرنے کے طریقے سوچ لیے جائیں اس وقت تک انسان کو اس کام کے کرنے کی ہمت ہوتی ہے اور یہ ہے شرح الصدر۔ یعنی تمام ترقی کی راہیں آپ کے دل میں آگئیں، اور پوری سمجھ سے بات آپ کے دل میں جاگزیں ہوئی تو بات کو آخر تک

سوچ لیا اور پھر کبھی تردد اور شک کا موقع پیش نہیں آیا اور تمام اطمینان سے کام آپ اور آپ کی جماعت لگ گئی اور سرانجام ہوگیا۔ یہ شرح الصدر جس کا ذکر ہے۔ آیت ۲ و وضعنا عنک وزرک الذی انقض ظھرک جب انسان ایک بڑا کام کرنے کے لئے کھڑا ہوا اور وہ اس کام کے کرنے کا مصمم ارادہ کر لے تو اس کو اپنے ہم خیال سچے رفیقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک ضرورت کے مطابق رفیق جمع نہ ہوجائیں اس وقت تک کام اسے خود کرنے پڑتے ہیں، چھوٹے سے چھوٹا کام اور بڑے سے کام اسے خود کرنا پڑتا ہے۔ اور اس سے طبیعت پر اس قدر بوجھ پڑتا ہے کہ یہ بوجھ کمر توڑ ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ اپنی زندگی کے ابتدائی سال میں تمام کام خود کرتے تھے۔ جس سے مقصد یہ تھا کہ آپ کے فیصلے کی پختگی ظاہر ہوجائے۔ جب یہ درجہ طے ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ آپ کسی چیز سے ٹلنے والے نہیں ہیں تو اللہ تعالی نے آپ کو ویسے ہی رفیق دیے جس قسم کے رفیقوں کی آپ کو ضرورت تھی۔ اس طرح آپ کی کمر پر جس قدر بوجھ تھا وہ بٹ گیا۔

* غرض جب رفیق جمع ہوگئے اور آپ کی پارٹی بن گئی تو اس کے بعد اس کام کی تکمیل کے لیے صحیح اور عالمگیر پروپیگنڈے میں اس جھوٹ کی مطلقاً اجازت نہیں ہے۔ اور اسے لوگوں نے خوامخواہ غلطی سے مشہور کردیا ہے کہ اس میں جھوٹ کی اجازت ہے۔ اس سورت کے نزول سے اول مکہ مکرمہ میں ایسی جماعت آپ نے تیار کرلی تھی جو آپ کے کام کی ذمہ دار بن گئی۔ وہ عشرہ مبشرہ اور دوسرے صحابی تھے انھوں نے تبلیغ اور اشاعت کے کام کو اپنے سر لے لیا اور قوت اور سمجھ سے کام میں لگ گئے۔ اور آئندہ یہی جماعت سلطنت اسلامیہ کی بنانے والی ہوئی۔ اس جماعت کے ہم خیال آدمی اس کام کو سب کاموں سے مقدم جانتے تھے اور اس پر مال اور جان دینے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ کام کرنے کے لئے جماعت کا ہونا ضروری ہے امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر تین ہوں تو نصاب جماعت کا پورا ہوگیا جیسے آنحضرت ﷺ اور ابوبکر صدیقؓ اور خدیجۃ الکبریٰؓ یا علیؓ یا زید جس کو بھی تیسرا سمجھا جائے۔ جب تین ہوگئے تو اب کام کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کام شروع کردو۔ اور امام شافعی کہتے ہیں کہ چالیس

ہوں۔ جب مدینہ منورہ میں اول جمعہ پڑھا گیا تو چالیس تھے۔ چالیس اگر جمع ہوجائیں تو تمام سیاسی کام شروع کردینے چاہئیں۔ بعض . . . کا قول ہے کہ سیاست کے لیے

دس اور اشاعت مقصد کے لیے بیس اور حکومت قائم کرنے کے لیے چالیس کافی ہیں۔

* آیت ۴ و رفعنا لک ذکرک سمجھدار آدمی جب آپ کے کام کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس آدمی کو دیکھنا چاہیئے جو اس قدر کام کررہا ہے اور مخالف خواہ مخواہ اس پر اتہام لگارہے ہیں۔ آپ کا کام سمجھدار لوگوں کی نظروں میں کھب جاتا ہے اور دل میں جاگزیں ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے ڈیپوٹیشن آپ کے پاس روانہ کرتے ہیں اور خود ملنے کے لیے آتے ہیں۔ اور جب ان کا اطمینان ہوجاتا ہے تو وہ خود ہی اشاعت شروع کردیتے ہیں۔

* قبل از نبوت آپ برابر قوم کو ابھارنے اور ان میں جو بداخلاقیاں آگئی تھیں ان کو دور کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور نہایت سرجوشی سے کام کرتے تھے۔ حلف الفضول جو عبداللہ ابن جدعان کے گھر میں منعقد ہوئی تھی اس میں آپ اور ابو بکر صدیقؓ دونوں سرگرم تھے۔ اگرچہ اس حلف الفضول کے مقاصد ظاہر میں مختصر نظر آتے ہیں مگر ان کے معانی بہت اعلیٰ ہیں کہ اس شہر مکہ میں اگر کوئی ظلم ہو تو جب تک مظلوم کو حق نہ دلایا جائے تب تک ہم برابر کوشش کرتے رہیں گے خواہ اس میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے تو یہ اصل مقصد بعثت نبوت کا ہے۔ یعنی تمام جہان سے ظلم دور کیا جائے اور باقی چیز سب اس کی شرائط اور معدات میں سے ہیں۔ مگر آپ کو صحیح راستہ کی خبر نہیں تھی کہ یہ کام کس طرح ہوگا تو الہام کے ذریعہ وہ راستہ اللہ تعالیٰ نے بتادیا۔ اور رفعنا لک ذکرک کے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرے ذکر یعنی قرآن مجید کو بلند کردیا۔ یعنی قرآن کو اقوام عالم نے قبول کرلیا اور اس پر عملدرآمد شروع کردیا۔ یہ آخری معنی سورت سے بہت چسپاں ہے۔ اب یوں دیکھنا چاہیے کہ یہ حلف الفضول اگرچہ چند نوجوانوں نے قائم کی ہے مگر حکیم جانتا ہے کہ قوم میں ایسا ماحول پیدا ہوگیا ہے اور ایسے افراد اس قوم میں پیدا ہوگئے ہیں تو یہ قوم کی استعداد کا مظاہرہ ہے کہ یہ

قوم نبوت کو بلا رہی ہے۔ اب جب اس میں نبی آتا ہے تو مخالفین آپ کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں اور لوگوں میں آپ کے کام کی اشاعت ہوتی ہے اور عرب کا سمجھدار طبقہ جانتا تھا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے ظلم کے برخلاف ایک تحریک جاری کر رکھی تھی، اب یہ لوگ کیوں اس کی مذمت کرتے ہیں تو حقیقت حال جاننے کے لیے مرکز میں آتے ہیں آپ سے ملتے ہیں اور بات کو سمجھ جاتے ہیں۔ یہ ہے ورفعنالک ذکرک کا مطلب پروپیگنڈا خواہ مخالفت میں ہو یا موافقت میں اس تحریک سے انسان روشناس ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ آپ کا نام تمام عرب میں شائع ہوگیا کہ یہ شخص ظلم دور کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک سمجھدار جماعت بھی موجود ہے تو کمزور طبقہ جس کو مساکین کہا جاتا ہے وہ مساکین آپ کو اپنا سرپرست سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اور محبت کا دم بھرنے لگ جاتے ہیں اور اچھے ناموں سے آپ کو یاد کرتے ہیں اور اللہ تعالی سے دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ تو آپ کو نصرت و مدد دے تاکہ ہم کو ظلم سے نجات دلائیں۔

* آیت ۵، ۶ **فان مع العسر یسرا. ان مع العسر یسرا** تنگی کے بعد آسانی آجاتی ہے۔ آئندہ بھی بڑا سخت کام کرو تو آسانی آجائے گی۔ آنحضرت ﷺ کو اب آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں مگر اس سے پہلے آپ کو بہت سی مصیبتیں تھیں۔ آپ نے نہایت عالی حوصلگی اور فراخ دلی سے ان کو برداشت کیا اس واسطے اللہ تعالی نے آپ کے واسطے آسانی پیدا کردی اب کام کو لگاتار کرنا چاہیے یعنی آسانی، تنگی کے بعد آتی ہے اب اس کی قدر معلوم ہوئی اب بھی آئندہ آپ کو تنگی آئے گی تو آسانی اس کے بعد آجائے گی کیوں کہ یسر تو ہے ہی عسر کے بعد۔

آیت ۷ **فاذا فرغت فانصب(۱)** آپ جب ایک کام کے ایک حصہ سے فارغ ہوگئے تو اس کام کو جو زیادہ مشکل تھا اب شروع کرو۔ آپ نے مکہ مکرمہ میں بہت تکلیف اٹھائی تو ایک سمجھدار طبقہ نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا یہ گویا ان مع العسر

---

(۱) بڑی جنگ قائم کردو۔ عرب کہتا ہے انصب الحرب۔ بعد فراغت حج ہ جنگ شروع کردی جائے۔

یسرا تھا۔ اور دوسری تکلیف آپ نے مدینہ منورہ میں صلح حدیبیہ کے وقت اٹھائی۔ اس میں یہ شرط تھی کہ ہمارے قافلوں کے نگہبان تم ہو (دیکھو قصیدۂ عظمیٰ) اور قریش کے معاہدے میں بنوبکر آئے۔ اس کے سوائے تمام عرب کو قریش نے آپ کے سپرد کردیا۔ یسر کی لذت بھی عسر کے بعد ہوتی ہے۔ محنت کرنے کے بعد اجرت کاملہ ملے تو مزدور ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ محنت کروں۔ فانصب۔ تکلیف برداشت کر۔ جس قدر مشکل حصہ ہوا سے شروع کرو۔ اس میں تجھے مشکلات بھی درپیش آئیں گی مگر تو ان کی پرواہ نہ کر کیوں کہ اس مشکل کام کے بعد تمام آسانیاں شروع ہوجائیں گی۔ عرب انصب الحرب اسے کہتے ہیں جب شعلہ مارنے والی جنگ قائم ہوجائے۔ آنحضرت ﷺ کا مطمح، مظالم کو دو کرنا تھا جو سرمایہ داروں نے کاشت کاروں اور غریب صناعوں پر قائم کر رکھے تھے۔ اور رفتہ رفتہ یہ مظالم طبعی صورت اختیار کرگئے تھے۔ بڑی دو سلطنتیں ایران اور روم بڑی مدت تک سلطنت کرنے کے باعث ظلم کی خوگر ہوگئی تھیں اور غرباء کی حالت حیوانوں کے مانند تھی۔ چھوٹے بڑے لوگ ان سے یہ عادات سیکھ کر زیردستوں پر ظلم کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس ظلم کو جہان سے نابود کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا تاکہ انقلاب کردیں اور تمام طاقت غرباء کے ہاتھ میں آجائے، تو اس کام کی سرانجامی کے لیے عرب کی سرزمین سے جماعت تیار کرنی تھی اور ان کو اپنے پروگرام کا پابند بنانا تھا۔ یہ کام بڑا مشکل تھا۔ جب صلح حدیبیہ ہوئی تو یہ کام سرانجام ہوگیا۔ پھر آپ نے مدینہ میں آکر بڑے کام کو شروع کردیا یعنی قومی کام کے بعد انٹرنیشنل کام کی ابتدا کردی۔ کسریٰ اور قیصر اور تمام بادشاہان گردو نواح کو اطلاع کردی کہ اس پروگرام پر عمل کرو ورنہ ہماری تلوار سے بچ نہیں سکتے۔ یہ بڑی دھمکی تھی اس طرح بڑے شہنشاہوں کو دھمکی دے کر کام شروع کردیا گیا۔ معنی ہیں اس آیت کے، اور ہر انقلابی کے لیے یہی ضروری ہوتا ہے، ورنہ اس نے جتنا اول کام کیا ہے سارے کا سارا برباد ہوجاتا ہے۔ سستی کرنے سے کام تباہ ہوجاتا ہے۔ آیت ۸

و الیٰ ربک فارغب اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کر۔ جب انسان کے سرپر مشکل آجاتی ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے اور اس حالت میں

اس کو مناجات میں بڑی لذت آتی ہے۔ یعنی کام کی تکمیل کے لیے ارادہ میں سستی نہ آئے۔ اور اس کی تکمیل کے لیے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنا چاہیے جو لوگ انسانیت کا مکمل خاکہ ہیں ان کی زندگی کا اس سورت میں خاکہ کھینچا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا نہایت آسان ہے کہ تمام نوع انسانی اپنی پوری جامعیت میں اس طریقہ سے ترقی کر رہی ہے۔ اس خیال کو سامنے رکھنا کہ نوع انسانی اپنی فطرت میں ہمیشہ ترقی کرتی ہے، اگر یہ خیال دماغ میں راسخ ہوجائے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر اچھا آدمی ہمیشہ ترقی کی دھن میں لگا رہے گا۔ اس واسطے کہ فرد کا کمال یہ ہے کہ اپنی نوعی خوبیوں کو زیادہ حاصل کرے۔ تو ان دو سورتوں میں فرد کامل کے حالات پیش کیے گئے ہیں تاکہ اس نمونہ پر اچھے آدمی ترقی کرتے رہیں۔

* ہر ایک مصلح کا پہلا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ ہم غریبوں اور مسکینوں پر سے ظلم دور کرنے کے لیے محنت کر رہے ہیں۔ جب غرباء ان کی یہ آواز سن کر ان کی امداد کرتے ہیں تو ان کی حکومت قائم ہوجاتی ہے۔ پھر وہ مدعی اصلاح پہلی حکومت سے زیادہ ظلم کرنے لگ جاتے ہیں تو اس لیے کہا گیا کہ الی ربک فارغب یعنی خدا کے لیے کام کرو۔ آخر حیات تک آنحضرت ﷺ اور شیخین رضی اللہ عنہما نے حکومت کے ثمرات سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ حالت مزدور جیسی رکھی اور جس طرح ہمارے ملک میں آبادکار اور مزارعین روٹی کھانے کے وقت بیٹھتے ہیں ویسے ہی آپ نے ہیئت اختیار کی۔ اور واسجد واقترب کا معنی بھی یہی ہے۔ عرب کے بہادر اور رومی بہادر لڑائی کے وقت اپنی اپنی معشوقہ حاضر کرتے اور خوب بہادری دکھاتے تو اس جگہ بھی کہا گیا کہ خدائی وصال کے لیے محنت کرکے مشقتیں برداشت کرو۔

سُورَةُ التِّينِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ اٰيَاتٍ

سورۃ التین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ① وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ② وَهٰذَا الْبَلَدِ
قسم انجیر کی اور زیتون کی ف اور طور سینین کی اور اس شہر
الْاَمِيْنِ ③ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ④
امن والے کی ف۲ ہم نے بنایا آدمی خوب سے انداز پر ف۳
ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ⑤ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
پھر پھینک دیا اس کو نیچوں سے نیچے ف۳ مگر جو یقین لائے اور
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ⑥ فَمَا يُكَذِّبُكَ
عمل کیے اچھے سو ان کے لیے ثواب ہے بے انتہا ف پھر تو اس کے پیچھے کیوں جھٹلاتا
بَعْدُ بِالدِّيْنِ ⑦ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ⑧
بدلا ملنے کو ف۵ کیا نہیں ہے اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم ف۶

سورة التین مکیہ

* قرآن مجید اساسی طور پر انسان میں دو نظریے پیدا کرنا چاہتا ہے: (۱) ایمان باللہ تعالی (۲) ایمان بالیوم الاخرۃ (یعنی دوسری زندگی کا یقین) جس انسان میں یہ دونوں چیزیں فطرۃً موجود ہوں، اس کی تعلیم کو مکمل کرنے کا ذمہ قرآن مجید لیتا ہے۔ جیسے اقلیدس کے لیے چند اصول ہیں کہ جب تک انسان کو ان پر دسترس نہ ہو وہ اس فن کو مکمل نہیں کرسکتا۔ اسے پہلے ہر قسم کے فارمولے سیکھنے پڑیں گے تب وہ کہیں اقلیدس سیکھے گا یعنی اقلیدس میں جتنے علوم متعارفہ اور اصول موضوعہ ہیں جب تک انسان وہ یاد نہ کرلے آگے نہیں چل سکتا۔ اسی طرح یہ دونوں علوم (ایمان باللہ وایمان بالیوم الاخر) صحیح المزاج عقلمندوں کے لیے علوم متعارفہ کا درجہ رکھتے ہیں اور عام انسانیت کے لیے اصول موضوعہ کی کیفیت رکھتے ہیں (جیسے اقلیدس میں خط کا کھینچنا اور دائرہ کا بنانا)۔

* یہ سورت اس بات کو سمجھا دیتی ہے کہ یہ چیزیں انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ اب انسان کی فطرت پر ذرا سا تفصیلی اشارہ کرنا ضروری ہوگا۔ ہم نے شاہ ولی اللہ صاحب کا جو فلسفہ پڑھا ہے اس میں انسانیت کی تحلیل کو چار حصوں میں پایا (۱) بدن انسان (۲) وہ قوت جو اس بدن کو چلاتی ہے اور موت کے وقت بدن اس قوت سے خالی ہوجاتا ہے (۳) وہ علمی نور جس کو ملکیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور (۴) وہ محبت الٰہی کا جذبہ جو ایک موتی کی شکل میں انسانی طبیعت میں موجود ہے۔ اب اس سورت کی شرح میں چار قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

* آیت ۱ **و التین و الزیتون** تین اور زیتون ایک قسم کے پھل ہیں یعنی میوے ہیں۔ بعض اہل علم اس سے مسجدیں مراد لیتے ہیں مگر ہماری رائے اس کے موافق نہیں۔ تین سے تو ہم جسم انسانی کی طرف اشارہ سمجھ رہے ہیں اور زیتون سے وہ روح ہوائی مراد لیتے ہیں جو اس بدن کو چلاتی ہے۔ جیسے زیتون کے ہر ذرہ کے اندر تیل ملا ہوا ہے اسی طرح وہ روح انسان کے ذرہ ذرہ میں پیوستہ ہے۔ آیت ۲ **و طور سینین** طور سینا پر تجلی الٰہی ظاہر ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے دیکھا۔ اس سے انسانیت میں

وہ ملکی شان مراد لیتے ہیں جس سے انسان حکومتیں بناتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اسے عام حیوانات سے ممتاز کر دیتی ہے اسے ہم ملکی روح سمجھتے ہیں۔ آیت ۳ **و ھذا البلد الامین** اور امانت والے شہر مکہ کی قسم۔ یہ شہر ہمیشہ خدادوست لوگوں کا مرکز رہا ہے۔ ایسا کہنا چاہیے کہ یہ عاشقان الٰہی کی بستی ہے اس سے ہم اس روحانی جوہر کی طرف اشارہ مراد لیتے ہیں جو اللہ کی طرف کشش کرتی ہے اور جس کا نام روح الٰہی رکھا جاتا ہے۔ آیت ۴ **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم** غرض یہ چاروں چیزیں گواہ ہیں کہ ہم نے انسان کو بہترین ترکیب میں پیدا کیا۔ ایک مرکب کی خوبی پر اس کے اجزاء کی خوبی سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ انسان کے یہ چار اجزاء بہت قیمتی ہیں تو ان کی ترکیب سے جو انسان پیدا ہوا وہ اعلیٰ، عمدہ اور احسن پیدا ہوگا۔ آیت ۵ **ثم رددناہ اسفل سافلین** پھر ہم نے اس کو زیادہ محتاج بنادیا۔ بدن کی وجہ سے زمین پر جس قدر چیزیں ہیں انسان ان کا محتاج ہے۔ یعنی انسان کو سب سے زیادہ محتاج بنادیا۔ روح ہوائی کی وجہ سے انسان تمام چیزوں کا محتاج ہے۔ اسی طرح اعلیٰ درجہ کی جو ملکی قوتیں ہیں اپنی مملکت کے لیے ان کا بھی انسان محتاج ہے۔ آخر اس جوہر (روح الٰہی) کی حفاظت کے لیے انسان اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت کا محتاج ہے تو جیسا کہ کہا گیا ہے کہ:

آناں کہ غنی ترند محتاج ترند

یہ جس قدر بہتر صفات کا مالک تھا، اتنا ہی زیادہ نیچے اترتا گیا۔ یعنی چونکہ اس کو سب چیزوں کی احتیاج تھی اس لیے سب کائنات سے زیادہ محتاج ہوتا گیا۔ اور بہت لوگ فقط بدن کی احتیاج رفع کرنے میں لگ کر اور چیزوں کو بھول بیٹھے اور نفس کے گڑھے میں گر گئے۔ تو اب اس کی عزت برقرار رکھنے کے لیے ہم نے قانون اتارا۔

* آیت ۶ **الا الذین آمنوا و عملوا الصالحات فلھم اجر غیر ممنون** یعنی اب اگر یہ اپنی عزت قائم رکھنا چاہتا ہے جیسا کہ خود بہترین اجزاء سے مرکب ہو کر ایک اعلیٰ درجہ کا انسان بنا۔ اگر اس عزت کو سمجھنا چاہتا ہے (جو اس کا فطری تقاضا ہے) اور اپنی ضرورتیں بھی پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اعلیٰ درجہ کے فرشتوں سے خاص تعلق پیدا کر لے۔ اس واسطے فرمایا کہ ان کے واسطے اجر بے انداز

ہے۔ یعنی وہ فرشتوں کے مانند ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے تعلق خاص پیدا کر لے۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے تعلق ٹھیک کر لیا۔ ان کی تمام ضرورتیں ہمیشہ پوری ہوتی رہیں گی اور وہ اپنی شان قائم رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ جب انہوں نے تمام اجزاء کی نگہداشت کی تو پہلا جو نظریہ تھا (ایمان باللہ) وہ تو اس کی فطرت کے لوازم سے ہو گیا۔ اس میں روح الٰہی کا جزء موجود تھا اور اس کی طبعی کشش اللہ تعالیٰ کی طرف تھی تو ایمان باللہ اس کے لوازم فطریہ میں سے ہو گیا۔ آیت ۷ **فمایکذبک بعد بالدین** خدا کو تو مان لیا۔ اب یوم الدین سے انکار کرنے کی کون سی چیز باعث بنتی ہے؟ آیت ۸ **الیس اللہ باحکم الحاکمین** کیا اللہ تعالیٰ تمام حاکموں کا بڑا حاکم نہیں ہے کہ اس کے پاس اپیل نہیں ہونی چاہیے؟ اب دوسری بات (ایمان بالیوم الآخر) رہی، تو یوں سمجھنا چاہیے کہ چھوٹے حاکم کے فیصلے میں اگر غلطی ہو جائے تو بڑے حاکم کے ہاں اپیل ہو سکتی ہے اور بڑا حاکم اس غلطی کو درست کر دیتا ہے اور جو فیصلہ ٹھیک ہوتا ہے اسے بدستور قائم رہنے دیتا ہے۔ تو اس سلسلے میں انسان اگر غور کرے تو دنیا میں جس قدر آخری فیصلہ کن طاقت پیدا ہو سکتی ہے اس کے (آخری فیصلہ) میں بھی غلطیاں باقی رہیں گی۔ ان کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین مان لینا انسانی فطرت کا طبعی تقاضا ہو گا کہ وہ سب حاکموں کا حاکم ہے۔ اس واسطے کہا کہ کیا اس کے پاس اپیل کرنے کے لیے دماغ میں گنجائش پیدا نہیں کی جائے گی؟ ضرور ہونی چاہیے۔ اس کا نام یوم الدین ہے۔ یہ بھی انسان کے فطری علوم میں داخل ہے۔ اور دنیا کے جبار حاکموں کے خلاف اپیل وہاں ہو گی۔ جب ایسے قیمتی اجزاء سے انسان کو مرکب کیا اور اس میں اتنی اعلیٰ قوتیں رکھیں تو اب اگر کوئی شخص ایسے احکم الحاکمین کی امانت اور ودیعت کو ضائع کرے یا اس کو بے جا خرچ کرے، یا اس کی قدر و قیمت نہ پہچانے تو کیا اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین نہیں ہے؟ ادنیٰ حاکم کی کوئی شخص خیانت کرے تو وہ اس کو اپنی حکومت کی حیثیت سے سزا دیتا ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے۔ پھر تو سزا بھی سخت ہو گی۔ جو چیزیں ہم میں اس نے ودیعت رکھی تھیں ضرور ایک دن ایسا آنا چاہیے کہ وہ اس ودیعت کو دیکھے اور جس نے اس کو اعلیٰ طریقہ سے استعمال کیا اس کو اچھا بدلہ دے اور جس نے اس کو خراب کیا اس کو سخت سزا دے۔

سُورَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعَ عَشْرَةَ آيَةً

سورہ علق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۱۹ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ﴿١﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ

پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا ہے بنایا آدمی کو جمے ہوئے

عَلَقٍ ﴿٢﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴿٣﴾ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿٤﴾

لہو سے ہے پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے ہے

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿٥﴾ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ﴿٦﴾

سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا ہے کوئی نہیں آدمی سر چڑھتا ہے اس سے کہ

اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ﴿٧﴾ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ﴿٨﴾ اَرَءَيْتَ

کر دیکھے اپنے آپ کو بے پرواہ ہے بیشک تیرے رب کی طرف پھر جانا ہے ہے تو نے دیکھا اس کو

الَّذِىْ يَنْهٰى ﴿٩﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ﴿١٠﴾ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ

جو منع کرتا ہے ایک بندہ کو جب وہ نماز پڑھے ہے بھلا دیکھ تو اگر ہوتا

عَلَى الْهُدٰىٓ ﴿١١﴾ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ﴿١٢﴾ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ

نیک راہ پر یا سکھلاتا ڈر کے کام بھلا دیکھ تو اگر جھٹلایا

وَتَوَلّٰى ﴿١٣﴾ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿١٤﴾ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ

اور منہ موڑا ہے یہ نہ جانا کہ اللہ دیکھتا ہے ہے کوئی نہیں اگر نہ

يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾

باز آئیگا ہم گھسیٹیں گے چوٹی پکڑ کر ہے کیسی چوٹی جھوٹی گنہگار ہے

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ﴿١٧﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾ كَلَّا ؕ

اب بلا لیوے اپنی مجلس والوں کو ہم بھی بلاتے ہیں پیادے سیاست کرنے کو ہے کوئی نہیں

لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿١٩﴾ ۩ السجدة

مت مان اس کا کہا اور سجدہ کر اور نزدیک ہو ہے

سورۃ العلق مکیہ

(یہ سورۃ آزادی عالم کا نسخہ ہے)

* قرآن مجید کے نظریات بیان کیے گئے ہیں۔ اور اب فقط نتیجہ نکالنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ اب اس فصل میں نتیجہ نکالا جائے گا۔ یعنی اب اس فصل میں قرآن مجید کے تمام خلاصہ کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں یہ سورت العلق سب سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اس سورت سے پہلے جس قدر قرآن ہے اور اس میں جس قدر تعلیم دی گئی ہے اس تمام تعلیم کو اب کتاب کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ بطور نتیجہ کے دعوی کا اعادہ ہے۔ قرآن مجید انسانیت سے بحث کرتا ہے تو انسانیت کو اس علم کا موضوع کہا جائے گا موضوع کا مقرر کرنا اور اس کی جنس و فصل بیان کر کے اس کی تعریف کرنی ضروری ہے اور دوسری بحث ہے قرآن مجید میں الہام کی۔ تو الہام کی تعریف، اس کے فوائد اور اس کی طرف انسانیت کا احتیاج بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ اس پہلی سورت میں دونوں باتیں نہایت واضح طریقہ سے بیان کی گئی ہیں آیت ۱تا۵ اقرء باسم ربک الذی خلق. خلق الانسان من علق. الایات اس سورت کی پہلی پانچ آیات اکٹھی نازل ہوئیں۔ یہ پانچوں آیات، انسانیت اور الہام کی تفسیر ہیں۔ شریعت الٰہی میں انسانیت کے احوال سے بحث کی جاتی ہے اور جس چیز کے احوال سے علم میں بحث ہو اس چیز کو علمی اصطلاح میں موضوع علم کہا جاتا ہے۔ آیت ۱ اقرء باسم ربک الذی خلق (۱) جس اللہ نے پیدا کیا ہے اس کا نام لے کر پڑھنا شروع کر۔ جو چیز کائنات میں سے ہے اس کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اس بارے میں تمام انسانیت متفق ہے اور اس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ (۱) انسانیت کا وہ حصہ جو کسی نہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہے وہ تو ظاہر

---

(۱) تربیت کا مادہ تعلیم سے پیدا ہوتا ہے ایک شے سے دوسری شے تیار کرنے کی قوت بھی تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ خوبی تعلیم کی ہے۔

ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عام مخلوقات کا پیدا کرنے والا مانتا ہے۔ (۲) ترقی یافتہ انسانیت کا جو حصہ مذہب سے تعلق نہیں رکھتا اور عقلی فلسفے کا قائل ہے وہ بھی بالاتفاق اس تمام کائنات کا ایک مرکز متعین کرتے ہیں کہ جس سے تمام وجود ظاہر ہوا۔ اور اس کو تمام چیزوں کا خالق کہتے ہیں۔ اس سے آگے اگر تفصیل سے یہ بیان کیا جائے کہ خلق کس طرح پیدا ہوئی تو اس میں (۱) اور (۲) میں کچھ اختلافات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفیوں کے مختلف مسلک ہیں کہ روح اور مادہ کس طرح بڑھے وغیرہ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تمام انسانیت کا مرکز ایک ہے اور یہ تمام چیزیں اس مرکز سے پیدا ہوئی ہیں اس میں کسی کو اختلاف نہیں اور مذکورہ بالا دونوں جماعتیں اس پر متفق ہیں۔

* بعض لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ وہ لوگوں میں اختلاف دکھلائیں کہ انسانیت میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ وہ جہاں دیکھتے ہیں کہ کسی حکیم نے مادہ سے مخلوقات کو پھیلانے کی صورت اختیار کی ہے اور یہ کہ اس باب میں وہ حکیم اپنے پیدا کرنے والے (اللہ) کا نام نہیں لیتا تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ فلاں حکیم اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتا۔ یہ ان لوگوں کی کوتاہ نظری ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ان فلسفیوں کے مذہب کا اچھی طرح سے مطالعہ نہیں کیا۔ بہرحال تمام انسانیت اسی بات پر متفق ہے کہ تمام کائنات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ تو اس واسطے اے رسول ﷺ تو بھی اسی کا نام لے کر پڑھ۔ آیت ۲ خلق الانسان من علق (۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ (اب انسانیت کی بحث شروع ہو گئی) انسان جب تک انسانیت کو نہ سمجھے وہ شرائع الٰہیہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ انسان کا ایک حصہ ہے بدن اور گوشت کے ٹکڑے سے انسان کو پیدا کیا۔ اب وہ گوشت کا ٹکڑا کب پیدا ہوا۔ اس پر اس جگہ بحث نہیں ہے۔ مادیات کے خلاصہ میں سے خلاصہ نکلتا ہوا گوشت کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اس میں سے انسان پیدا کیا جاتا ہے۔ تو انسان بھی عام مخلوقات میں شریک ہوا اور یہ بھی اس جنس کا ایک نوعی فرد ہے۔ تو جیسے تمام مخلوقات کا تعلق اپنے خالق سے ہے ویسے ان کا تعلق بھی ثابت ہوا اور اگر خلق میں عام مخلوقات کا بیان کر کے پھر انسان کی خلقت بیان کرنے سے یہ بات

(۱) تعلیم کے بغیر تو انسان ایک علق ہے۔

ثابت ہے کہ تمام مخلوقات کا خلاصہ در خلاصہ انسان ہے تو یہ اشرف المخلوقات ہوا۔ اور اس کی ذمہ داری بڑھ گئی۔

* آیت۳تا۵ **اقرء و ربک الاکرم. الذی علم بالقلم. علم الانسان مالم یعلم**(۱) انسان کو پیدا کرنا یہ کرم تھا۔ اور اس کو عالم بنانا اور تمام انواع کے علم کا اس میں جمع کردینا یہ اس کے کرم میں ایک اضافہ ہے۔ انسان اجتماعیت سے ترقی کرتا ہے اور اجتماعی علم قلم سے محفوظ رہتا ہے۔ پہلے لوگوں نے جو کچھ کیا اپنے تجربات اور اپنی تاریخ قلم بند کردی۔ اس کے بعد جو دوسری قوم آئی اس نے پہلی تحقیقات اور تاریخی باتوں سے فائدہ اٹھایا اور اس طرح اپنی تاریخ بھی قلم بند کردی تو انسان میں قلم (نوشت و خواند) سے علمی اجتماع پیدا ہوتا ہے۔ آیت۵ و **علم الانسان مالم یعلم** اب آئندہ کے واسطے جن چیزوں کو انسان نہیں جانتا تھا ان کے متعلق اللہ تعالی نے انسان کو علم دیا۔ قلم کا استعمال نہ تو رسول کریم ﷺ ہی جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم ہی کچھ زیادہ جانتی تھی تو اب انسانیت کا تمام علم جو ترقی پر پہنچ چکا ہے۔ اگر رسول کریم ﷺ کو سکھانا منظور ہو تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالی کے سوائے کوئی نہیں سکھلاسکے گا۔ اللہ تعالی کے کرم کا ایک تو یہ اثر ہے کہ جس قوم میں قلم کا استعمال محفوظ ہے وہ لوگ کتابیں پڑھ کر عالم ہوجاتے ہیں اور جس قوم میں یہ بات نہیں ہے اس کو اللہ تعالی اور طریقہ سے تعلیم دیتا ہے اب یہ واقعہ ہے کہ اور طریقہ (قلم کے سوائے) جس سے علم دیا جاتا ہے وہ حظیرۃ القدس سے اتصال ہے۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ جس فرشتہ کے ذریعہ سے انسان کو حظیرۃ القدس میں سے علم ملتا ہے اس فرشتہ کو قلم اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ اب قلم کو ہم یہاں عام طور پر لے لیتے ہیں کہ وہ زمین کا قلم ہو یا حظیرۃ القدس کا قلم ہو۔

---

(۱) پہلے اقرء میں پرائمری تعلیم تھی۔ اب اعلیٰ تعلیم کے لیے کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم سے بڑی عزت اور سخاوت انسان کے اندر پیدا ہوجاتی ہے۔ لوگوں کو تربیت دینے والے کی لوگ عزت کرتے ہیں اور علم کا خاصہ سخاوت، جواں مردی اور ہمت عالی ہے۔ **علم بالقلم** اب علم کی تقسیم کی جاتی ہے ایک پرانا نوشتہ اور دوسرا علم الہامی جو نبوت کے ذریعہ نازل ہوتا ہے۔

* ان آیات کا خلاصہ یہ نکلا کہ انسان ایک حیوان ہے اور وہ علم اجتماعی رکھتا ہے اور وہ علم میں ترقی کر سکتا ہے اور آلات کا استعمال کرتا ہے۔ منطق میں انسان کی دو تعریف بیان کرتے ہیں ایک تو حیوان ناطق اور دوسری تعریف ہے حیوان یستعمل آلات یعنی اپنے تمام کاموں میں آلات کا استعمال کرتا ہے ایک علم تو اس نے قلم کے ذریعہ حاصل کیا جس کو زمین کا قلم کہا جاتا ہے اور دوسرا علم اس کا قلم اعلیٰ سے حاصل ہوا۔ پھر اس کو قلم کے ذریعہ جہاں میں پھیلایا۔ خود بھی مستفید ہوا اور دوسرے کے افادہ کے لیے اس کو عام کر دیا۔ یہ خاصیت انسان کی ہے قلم سے جو علوم اور تاریخ لکھی جاتی ہے اس میں بہت غلط باتیں لکھی جاتی ہیں۔ اس کے باعث ان علوم سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا اور بہت مشکلات درپیش آجاتی ہیں اور غلط در غلط تاویل سے انسان کا دماغ چکرا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے وہ تمام عقدے انسانیت کے لیے وحی کے ذریعے دور کرتا ہے اور ترقی کے راستہ میں جتنے غلط نظریے یا نتائج اعمال رکاوٹ ڈال رہے تھے الہام کے ذریعے وہ رکاوٹیں دور کر دی جاتی ہیں۔ آئندہ پروگرام اس کو غیر مبدل دیا جاتا ہے جس کو انسانی فطرت اپنا سمجھ کر قبول کر لیتی ہے اور ایسی نعمت الٰہی کا کوئی شخص منکر نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ایسی باتیں انسانی عقل سے بالا تھیں تو اس کو ایسا علم حظیرۃ القدس سے دیا گیا جس سے اس کی تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ الہام کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ قلم کے لکھے ہوئے علم میں خلط ملط سے جو عقدہ پڑ جاتا ہے اس کے حل کرنے کے لیے ہی الہام کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ وہ مشکلات ایسی تھیں کہ عقل انسانی اس کے حل کرنے سے قاصر تھی الا بعد بہت تجربہ کے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم اور عنایت سے انسان کو سہل راستہ دکھایا (الہام سے)۔ اب یہ آخری الہام جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہونا شروع ہوتا ہے ایسا محفوظ کر دیا جائے گا کہ اس میں غلط بات کا خلط ہرگز نہ ہوگا اس لیے آئندہ کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس کے سمجھنے کے لیے عقل کفایت کرتی رہے گی۔ اب جب الہامی علم کی اتنی ضرورت محسوس ہوئی اور مطلق علم بھی انسانی ترقی کے لیے مفید اور سخت ضروری ہوا تو علم کی دشمنی کرنا کسی کے ذہن میں نہیں آتی اور مفید شے کے لیے ہر ایک سخت

کوشش کرتا ہے۔ مگر سرمایہ دار ہمیشہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی کا اجتماع میرا محتاج رہے اور ان کو میری خفیہ تدبیروں کا علم نہ ہو اس لیے علم کی اشاعت سے وہ لوگوں کو روکتا ہے۔ کبھی کوئی سرمایہ دار اپنے زیردستوں کو علم سے مانوس نہیں ہونے دیتا۔ اب آئندہ آیات میں یہ بیان کیا جاتا ہے۔

* آیت ۶ تا ۱۴ اب دوسری فصل شروع ہوتی ہے۔ اس میں انسانیت کی تقسیم دو حصوں میں کردی جاتی ہے (تعریف کے بعد تقسیم ہوتی ہے) ایک انسان ہے کہ وہ انسانیت کے حدود چھوڑ دیتا ہے۔ اور دوسرا انسان ہے کہ انسانیت کے حدود پر اور اس کے مقتضا پر پوری پوری طرح کاربند ہے۔ اور وہ علم جو مقتضی انسانیت میں سے تھا اس کی اشاعت کرتا ہے اور دوسرا اس کو روکتا ہے۔ چنانچہ اس کا سبب بتلایا جاتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے اور صحیح علم جو صحیح تمدن کے لیے نہایت ضروری ہے، اس کی مخالفت کیوں کرتا ہے۔ اس کا سبب بتایا جاتا ہے۔ آیت ۶ و ۷ **كلا ان الانسان ليطغى (۱) ان رآه استغنى** اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے پاس جب روپیہ جمع ہوتا ہے وہ انسانیت کی حد سے نکلنے لگتا ہے۔ اور اپنی جماعت سے مستغنی ہوجاتا ہے اور اپنی حدود چھوڑنے لگ جاتا ہے۔ اس سے یہ اشارہ سمجھ میں آتا ہے کہ انسان جماعت کے اندر رہے تو اس کی انسانیت ٹھیک رہتی ہے بعض چیزوں میں وہ دوسروں کا محتاج ہے اور بعض میں دوسرے لوگ اس کے محتاج ہیں۔ اسی طرح سوسائٹی میں برابری کا خیال محفوظ وملحوظ رہتا ہے کہ لوگ اس کے محتاج ہیں اور یہ لوگوں کا محتاج ہے۔ اور جب اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ میں انسانی سوسائٹی میں لوگوں کا محتاج نہیں ہوں تو وہ اپنی حد سے بڑھنے لگا۔ غرض اللہ تعالی نے اپنا قانون ایسا بنایا ہے

---

(۱) تعلیم سے روکنے والا طاغی انسان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ غرباء غلامی کی زنجیر میں جکڑے رہیں۔ دوسروں کو اپنا محتاج بناتا ہے۔ یہ سرمایہ پرستوں کی عادت قبیحہ ہے۔ وہ جبری تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں۔ اقرء امر ہے۔ فرض عینی ہے۔ یہ تعلیم ہی ایسا نسخہ ہے جس سے غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں اور انسان ترقی کے راستے دیکھنے لگتا ہے۔ سرمایہ پرست انسان پڑھنے لکھنے سے لوگوں کو روکتا ہے تا کہ وہ غلامی میں رہیں۔

کہ کوئی فرد اپنی نوع سے باہر جا ہی نہیں سکتا۔ کلا ہرگز نہیں یعنی یہ خیال کرنا کہ تمام انسان اعلیٰ علوم کی اشاعت اور انسانیت اور تمدن کے لیے علم کے برکات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ بعض انسان طاغی ہوتے ہیں اور لوگوں پر ظلم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے انسانوں میں فہم اور علم پیدا ہونے نہیں دیتے اور اس کا سبب فقط استغنا ہے یعنی سرمایہ داری ہے سرمایہ دار طبقہ مساکین پر ظلم جاری رکھنے کے لیے ان کو علم سے آشنا نہیں ہونے دیتے۔

* آیت۸ ان الی ربک الرجعی 'تیرے رب کی طرف رجوع ہونا ہے یعنی ہر ایک محتاج ہے اور اس کا رخ حظیرۃ القدس کی طرف ہے۔ جہاں شخص اکبر موجود ہے۔ اور تجلی الٰہی بھی موجود ہے یعنی ہر ایک انسان کو ہم نے اپنا محتاج بنادیا ہے تو اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے اور یہ احتیاج اس کی صورت نوعیہ کا تقاضا ہے اور ہر ایک کو دوسرے کا مساوی احتیاج ہے اور مستغنی فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ اس سے سب مانگ رہے ہیں تو انسان پر واجب تھا کہ وہ اپنی حقیقت پر غور کرتا اور جانتا کہ

آناں کہ غنی تراند محتاج تراند
و اللہ ہو الغنی و انتم الفقراء

آیت۹و۱۰ ارئیت الذی ینھا عبداً اذا صلی 'اب اس سلسلہ میں انسانیت کے دوسرے فریق (طاغی) کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ حد سے گذرنے والے انسان کی مثال دی جاتی ہے اور اسی ضمن میں انسانیت کے دوسرے طبقہ کا ذکر آجاتا ہے۔ ایک بندہ جب اللہ تعالیٰ کا نام لینا (نماز پڑھنا) شروع کرے تو اسے منع کرتا ہے وہ جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو اس کا اتصال اپنے رب سے ہوا اس لیے وہ ضرور اس کے بندوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھے گا اور یقیناً مظلوم کی دادرسی کرنے میں سعی کرے گا۔ لوگ اس کے پاس جمع ہوجاتے ہیں کیوں کہ وہ محتاجوں اور مسکینوں کا مددگار ثابت ہوتا ہے اور ان محتاجوں، مسکینوں اور مظلوموں کو یقین ہے کہ یہ شخص ہم کو ظلم سے نجات دلائے گا اور وہ بندہ نمازی ان کو تسلی دیتا اور بشارت دیتا ہے۔ مگر جو

آدمی انسانیت کی حدود سے بڑھ جائے (ظالم ہوجائے) وہ اس بات کو برداشت نہیں کرسکتا، کیوں کہ اسے خطرہ ہے کہ اس طرح پر وہ کسی پر ظلم نہیں کرسکے گا۔ وہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس نمازی کے پاس چار آدمی جمع ہوں۔ لہذا وہ نمازی آدمی کو نماز پڑھنے سے بھی منع کرتا ہے کہ اس نماز کی باعث لوگ ایسے ظالموں سے متنفر ہوجائیں گے۔ یعنی نماز میں قرآن شریف پڑھاجاتا ہے جس میں عدالت قائم کرنا اور عدالت کی فضیلت اور ظالموں، فاسقوں پر لعنت ملامت ہے اور اعمال صالحہ یعنی عدالت قائم کرنے والے مسکینوں اور محتاجوں کو اور انصاف کرنے والوں اور محتاجوں کے کھانے کا انتظام کرنے والوں کے لیے بشارت اور ہمت افزائی ہے۔ تو دراصل وہ قرآن مجید پڑھنے سے منع کر رہا ہے اور قرآن مجید کی تعلیم کو روکتا ہے۔ کیوں کہ اس کو خوف ہے کہ اس سے لوگوں میں بیداری پیدا ہوجائے گی تو پھر وہ کسی پر ظلم نہیں کرسکے گا۔ قرآن مجید کی تلاوت اور دور کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ نماز میں پڑھا جائے صلوۃ اور قرآن مجید کی تلاوت آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ کبھی آپس میں جدا نہیں ہوتے۔

* آیت ۱۱ و ۱۲ ارئیت ان کان علی الھدی او امر بالتقوی

اس آیت میں اللہ تعالی کے خاص بندے کا ذکر ہے ترجمہ آیت ۱۱ اگر وہ آدمی سیدھے راستہ پر ہو تو کسی کو کیا حق ہے کہ اسے منع کرے؟ اس کو روکنا درحقیقت صریح ظلم ہے۔ آیت ۱۲ وہ لوگوں کو انصاف کا حکم دیتا ہے تو کیا اس کو کوئی روک سکتا ہے؟ ہرگز کوئی نہیں روک سکتا اس کو روکنے کا مطلب تو یہی ہوگا کہ انسانیت پر ظلم ہوتا ہے۔ ان آیات ۹ تا ۱۲ میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کوئی طاغی اور ظالم اس کا مقابلہ کرے تو اولاً اس کو چاہیے کہ اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہو اور اپنے آپ کو اللہ تعالی کا ایک ذلیل بندہ سمجھے اور جو صحیح تعلیم ہے اس پر کاربند رہے اور انصاف قائم کرنے میں کوشش کرے پھر انسانیت کے اچھے افراد اس کی جماعت میں شامل ہو کر اس ظالم اور اس کے ظلم کی بیخ کنی کردیں گے اور اللہ تعالی اس کو خوب دیکھتا ہے اور وہ اس کو ترقی دیتا رہے گا ہر بات میں آگے بڑھنا چاہیے یعنی جو صحیح تعلیم اس نے شروع کی ہے اس کی تکمیل کے لیے آگے بڑھنا چاہیے اور اس سبقت سے وہ میدان جیت لے گا۔ عام

مفسرین نے یہ خیال بنا رکھا ہے کہ وہ طاغی، خدا کو یاد کرنے سے روکتا ہے اس لیے یہ ظلم ہے حالانکہ اس طرح نہیں ہے۔ اصل میں نمازی اپنی نماز میں قرآن شریف پڑھتا ہے اور قرآن مجید کی تعلیم کی اشاعت کرتا ہے اور قرآن مجید کا وعظ کرتا ہے جس میں انصاف کرنا انسانیت کے لیے ضروری بتایا جاتا ہے۔ اسی لیے مسکین، محتاج اور مظلوم اس کے پاس جمع ہوجاتے ہیں اور ظلم دور کرنے کے لیے اس کی جماعت میں شامل ہوجاتے ہیں تو سرمایہ دار سے جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح ظالم برباد ہوتا ہے اور اس کی سلطنت اور سرمایہ تمام ہاتھ سے جاتے ہیں۔ اس سے اس پر زد پڑتی ہے۔ کیوں کہ جب انصاف قائم ہوگیا تو اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہے گی۔ انصاف قائم کرنا اور لوگوں پر سے ظلم دور کرنا قرآن مجید کی تعلیم کی روح رواں ہے۔ اور خدا کو یاد کرنے والا آدمی لوگوں کو کہتا ہے کہ انسانیت سوائے انصاف قائم کرنے کے کبھی ترقی کر ہی نہیں سکتی۔ آیت ۱۳ ارئیت ان کذب و تولی اور یہ ظالم اس کو جھٹلاتا ہے اور انسانیت کو ترقی دینے سے روکتا ہے۔ یعنی ترقی کی طرف پشت کر رہا ہے اور رجعت پسندی اختیار کر رہا ہے اور لوگوں کو بھی پیچھے لے جارہا ہے۔ رات دن اس کی یہی کوشش ہے کہ اس دعوی کو (کہ انسانیت انصاف کے سوائے ترقی نہیں کرسکتی اور مظلوموں سے ظلم دور کرنا انسانیت کا فرض ہے) جھوٹا ثابت کرے۔ یہ معنی ہے کذب کا۔ اور جب اس کے پاس کوئی برہان اور دلیل نہیں رہتی اور وہ عاجز ہوجاتا ہے تو لڑنے کی تیاری کرتا ہے یہ معنی ہے و تولیٰ کا۔ آیت ۱۴ الم یعلم بان اللہ یری اس طاغی کو اتنی بھی سمجھ نہیں کہ اس کے کام کو اور اس بندہ نمازی کے کام کو خدا دیکھ رہا ہے۔ اور کیا یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اللہ تعالی اس انصاف قائم کرنے والے بندے کو کامیاب کر رہا ہے۔ کیا یہ طاغی اس کو نہیں سمجھتا۔ شروع سورۃ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انسان کو اللہ تعالی نے بنایا اور اسے فطرت دی اب اگر کوئی آدمی اس فطرت کے خلاف کام کرے گا تو اللہ تعالی اسے توڑ کر رکھ دے گا کیا یہ اس کو نہیں جانتا؟ غرض اس سورۃ میں یہ بات معین کردی گئی کہ انسانیت دو جماعتیں ہو کر کام کرتی ہے۔ آگے جنگ شروع ہوتی ہے۔

* اب تیسری فصل شروع ہوتی ہے کہ اب جب کہ یہ نزاع شروع ہوگیا کہ وہ بات کو نہیں سننے والے تو ان میں ہاتھا پائی ہونی ضروری ہے۔

* آیت ۱۵ و ۱۶ کلا لئن لم ینته. لنسفعاً بالناصیة. ناصیة کاذبة خاطئة اگر یہ آدمی اپنی حرکت سے باز نہ آیا تو ہم اسے بالوں سے پکڑیں گے کلا یعنی یہ خیال کرنا کہ یہ ایسا کرتا رہے گا اور یہ چونکہ سرمایہ دار ہے اس کو کوئی اپنے کام سے روک نہیں سکتا، یہ غلط ہے۔ بلکہ اگر یہ شخص اپنی غلط روی پر قائم رہا اور عدالت اور انصاف کرنے سے روکتا رہا تو اس کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر اٹھا زمین پر مار دیا جائے گا یعنی ان کو نہایت ذلیل کردیا جائے گا وہ پیشانی کے بال تو پاکیزہ لوگوں کی طرح رکھتا ہے مگر باطن میں بڑا شیطان جھوٹا اور خطاکار ہے کہ وہ حق کا مقابلہ کرتا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں پیشانی کے بال مقدس سمجھے جاتے تھے جیسے سکھوں کے بال کیس اور ہندوؤں کے ہاں بودی رکھنی۔ اہل عرب بال رکھتے اور نہایت عزت سے ان کی پرورش کرتے اور پھر انکو حج کے ایام میں مقام منیٰ میں منڈواتے تھے اور یہ منڈوانا سر کٹانے کے برابر سمجھا جاتا تھا قریش مکہ یعنی مخالفین اسلام کے بہت سے آدمی بدر کی جنگ میں مارے گئے اور انہیں انکی پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر کنویں میں ڈال دیا گیا۔ آیت ۱۷ فلیدع نادیة (۱) وہ اپنی مجلس کے ہم نشینوں کو اپنی مدد کے لیے بلاتے جو اس کے شریک کار ہیں۔ آیت ۱۸ سندع الزبانیة (۲) اور اگر اس کے ہم مجلس آدمی کسی نیک آدمی کو کسی اچھے کام سے روک دیں تو ان کے واسطے ہم جہنم کے پیادے بھیج دیں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ تمام قوت خرچ کرکے رسول کریم ﷺ کے مقابلہ میں آجائیں تو بھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ رسول کریم ﷺ کو اکیلا نہیں سمجھنا چاہیے حق کی اطاعت کرنے والی روحیں ان کے ساتھ ہیں۔ اب اگر وہ

---

(۱) شراب کی مجلس میں بیٹھنے والا۔

(۲) یہ اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے زبانیہ انصار و مہاجر کی ایسی جماعت تھی (جیسے بلال رضی اللہ عنہ وغیرہ) جس کو قریش سے نہ کوئی تعلق رحمی تھا اور نہ تعلق احسانی تھا۔ وہ اپنے معبود برحق اور محبوب الٰہی کی محبت میں سرشار تھے۔ جنگ میں کفار کو بے تحاشا مار کر ڈھیر کردیا اور طاغی کے معاونین سب بھاگ گئے۔ وللہ الحمد۔

ہاتھا پائی (جنگ دست بدستی) کریں گے تو شکست کھائیں گے۔ اب تیسری فصل شروع ہوتی ہے جس میں یہ ہے کہ تو طاغی کی اطاعت نہ کر دہ تیری اطاعت کرے اور تیرے آگے ذلیل ہو کر تابع ہوجائے ایسی کوشش کرو اور ایسی تعلیم عام کرو کہ مجبوراً اس طاغی کو تیری اطاعت کرنی پڑے۔ آیت ۱۹ **کلا لاتطع** اطاعت نہ کر۔ یعنی ان لوگوں سے صلح نہ کر۔ کفار صرف یہ چاہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کفار کے ظلم کرنے اور ان کی بت پرستی کو برا کہنا چھوڑ دیں کسی خاص کا نام لے کر ذکر نہیں کیا جاتا بلکہ عام طور سے مخاطب کیا جارہا ہے۔ اور اس میں قریش مکہ اور ان کے آباء و اجداد تمام شریک تھے۔ اس واسطے وہ اس کو برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ آنحضرت ﷺ ظلم اور شرک کو برا کہیں۔ صلح کے معنی یہ ہیں کہ ایک فریق اپنے دعوی کا کچھ حصہ چھوڑ دے تو اگر آنحضرت ﷺ اپنے دعوی کا کچھ حصہ چھوڑ دیتے تو تمام تعلیم برباد ہوجاتی لیکن آپ اپنے دعوی پر بڑی پختگی سے قائم رہے۔ اسی سبب سے کامیابی ہوئی۔

* **واسجد و اقترب** اور سجدہ کر اور قرب حاصل کر۔ سجدہ کے معنی ہیں خدا کی پوری اطاعت اور قرب سے مطلب ہے کہ حظیرۃ القدس کے جو مقدس درجے ہیں ان میں پہنچنا۔ مثلاً حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کی اطاعت نہ کرو اور ان سے صلح نہ کرو تو اسکا مطلب یہ ہے کہ جو حکم دیا جاتا ہے اس کی پوری اطاعت کرو۔ یہ نہیں کہ کسی معاملہ میں کفار سے صلح کرلی اور کسی میں چپکے ہو رہے، بلکہ ان سے صلح کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے اور سجدہ کے معنی ہیں کہ اس حکم کی پوری اطاعت کرو اور اس حکم کے آگے سر بسجود ہوجاؤ۔ جیسے کہ بادشاہ حکم دیتا ہے اور اس حکم کی اطاعت کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اسی دم بادشاہ کو سجدہ کیا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے ظالموں سے کسی قسم کی مصالحت نہیں کی حتی کہ قیصر و کسری جو ظالم حکومتیں تھیں ان کو بھی دھمکایا۔ ان کے ساتھ برسرپرخاش ہوئے۔ اور آپ کے ہاتھ سے اللہ تعالی نے انقلاب کامیاب بنادیا۔ آنحضرت ﷺ کے قرب کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ آپ نے اللہ تعالی کی طرف سے جو کلام کیا ہے وہ کلام الٰہی مانا جاتا ہے۔ حتی کہ جو کام آپ نے کیا ہے اس کو بھی لوگ فرشتوں کے کام کی طرح مانتے ہیں اور یہ نتیجہ محض اس امر کا ہے کہ آپ نے اللہ تعالی

کے حکم کی پوری اطاعت کی۔ غرض سورۂ فاتحہ دعوی ہے اور یہ سورۃ اس کا نتیجہ ہے
اس میں بین الاقوامیت زیادہ ہے اور اس میں قومیت زیادہ ہے۔ اس دعوی کے موقع پر
وہ سورۃ پیش کی گئی ہے جو بین الاقوامیت کے مساوی ہو رسول کریم ﷺ نے اپنی
زندگی میں قومی انقلاب مکمل کردیا اور اس کے نتیجہ میں یہ سورت منتہی کردی گئی ہے۔
و اسجد واقترب ایک ضروری خطرہ دور کرنا ہے وہ یہ کہ ظالم طاغی کہیں گے
کہ یہ جو اپنے آپ کو خیر خواہ اور مصلح اور خیر خواہ خلق بتارہا ہے اور لوگوں کو عام تعلیم
دے رہا ہے اور لوگوں کو ہم سے متنفر کر رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خود امیر بننے
کا ارادہ رکھتا ہے اور جب لوگ اس کے پاس جمع ہوجائیں گے تو یہ بھی لوگوں پر ظلم
کرے گا۔ کیوں کہ جب بہت لشکر اس کے پاس جمع ہوجائے گا تو اس کے اخراجات
کے واسطے وہ مسکین لوگوں پر ظلم کرے گا۔ تو یہ ہم سے حکومت وریاست چھین کر اپنے
ہاتھ رکھنا چاہتا ہے اور یہ بات تاریخ میں عام طور پر ثابت ہے کہ ایک شخص مظلوموں
سے ہمدردی کرنے کے واسطے کھڑا ہوتا ہے اور جب کامیاب ہوتا ہے تو اسی طرح ظلم
کرنے لگ جاتا ہے تو آنحضرت ﷺ کو حکم کیا جاتا ہے کہ ایک تو کسی ظالم کی اطاعت
نہ کر بلکہ وہ تیری اطاعت کرے۔ اور ہر وقت اللہ تعالی کو سجدہ کیا کر اور اس کا قرب
حاصل کر۔ جب شاہنشاہ کا قرب حاصل ہوا اور اس کے دربار میں ہر وقت حاضر رہنا ہوا تو
اس کی رعیت پر کبھی ظلم کا خیال تک نہیں آئے گا۔ مقرب بارگاہ الہی کبھی کسی پر نہ
ظلم کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو ظلم کرنے دیتے ہیں۔ سوائے خدا تعالی کے اور کسی
کے قرب حاصل کرنے سے انسان طاغی بن جاتا ہے۔ جب آدمی اللہ تعالی کا قرب
حاصل کرنے کے درپے ہوگا تو ممکن نہیں کہ اس سے ظلم ہوسکے یا لوگ اس کے حق میں
ایسا خیال کرسکیں۔ یہ سورت قومی تعلیم و تربیت کے لیے ہے۔ عربی قوم میں کیا کیا
نقص ہیں ان کو رفع کرنا مقصود ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی حیات مبارک میں عرب
کی تکمیل کردی۔ اور اس سورت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان میں ایسی روح پیدا ہونی
چاہیے کہ جو علم حاصل کرے اور دوسروں کا مظلوم ہو کر نہ رہے اور خود بھی ظالم نہ بنے۔
اس مرض کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ الہامی علوم کی انسانوں میں وقعت پیدا

کردنی چاہیے اور ظالم طاغی کی کوئی بات نہ ماننی چاہیے۔ اللہ تعالی کے آگے جھکنا اور سجدہ کرنا وہ اپنے اوپر ضروری سمجھے اور قرب الہی کو ڈھونڈے۔ کیوں کہ جب وہ تقرب الہی حاصل کرنے کا شوق رکھتا ہے تو اسے گناہ کا خیال تک نہیں آتا۔ یہ سورت پہلی سورت ہے جس میں لڑائی کا حکم دیا گیا ہے۔ فليدع ناديه سندع الزبانيه یہ تو صریح ہے اور لاتطع میں قطع تعلقات اور الٹی میٹم ہے۔ اس سے لڑائی ضرور چھڑ جاتی ہے۔

سُورَةُ الْقَدْرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

سورہ قدر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِنَّآ أَنزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ① وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ

ہم نے اس کو اتارا شب قدر میں ٹ اور تو نے کیا سمجھا کہ کیا ہے شب

الْقَدْرِ ② لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ③ تَنَزَّلُ

قدر شب قدر بہتر ہے ہزار مہینے سے ٹ اترتے ہیں

الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ

فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے حکم سے ٹ ہر کام

أَمْرٍ ④ سَلٰمٌ هِىَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ⑤

ٹ امان ہے ٹ وہ رات صبح کے نکلنے تک ٹ

سورۃ القدر مکیہ

* قرآن مجید کی پہلی سورت "اقرء باسم ربک الذی خلق" لیلۃ القدر میں نازل ہوئی۔ لیلۃ القدر کا اگر آج کی زبان میں ترجمہ کیا جائے تو کہا جائے گا کہ بجٹ کی میٹنگ میں حظیرۃ القدس میں ایک کام پیش ہوتا ہے اور پھر اس پر فیصلہ ہوتا ہے۔ تو یہ کام جو حظیرۃ القدس میں پیش ہوا ایک ہزار ماہ کے لیے ہوا ہے۔ غرض اس مجلس میں (حظیرۃ القدس) قرآن کے نازل ہونے کا فیصلہ ہوا تو قرآن مجید کا اثر شخصی (لفظی یعنی اس کی صورت کا اثر) ایک ہزار ماہ تک دنیا میں قطعی طور پر کامل ہو کر رہے گا۔ (یعنی یوں تو یہ کتاب ہمیشہ کے لیے دنیا میں رہے گی مگر صحیح لفظوں میں اس پر عمل ایک ہزار ماہ تک کامل ہو کر رہے گا) ہماری سمجھ میں ایک سال دس ماہ کا ہوتا ہے۔ رمضان اور ذی الحج کے دو ماہ اس عملی وقت میں شمار میں نہیں آتے۔ انہیں چھٹی کے دو ماہ سمجھنے چاہئیں۔ اور سال میں عملی مہینے دس ماہ سمجھنے چاہئیں۔ تو اس طرح ایک ہزار مہینے ایک سو سال کے برابر ہو جائیں گے۔ جیسا کہ سورۃ ق والقرآن المجید میں پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ اور اسی کے مساوی یوں سمجھیے کہ سنہ ۸۶ ہجری میں یہ سو برس پورے ہوتے ہیں۔ اسی سال ولید نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو مدینہ منورہ کا حاکم مقرر کیا۔ اور انہوں نے مدینہ کے علماء کو جمع کر کے سنت (حدیث) کے لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت تک مسلمانوں کے پاس قرآن مجید کے سوائے کوئی اور قانون نہیں تھا۔ اب یہ قانون اقصائے چین سے لے کر مغرب تک پہنچ گیا متمدن اقوام عالم نے اس قانون کو اپنا دستور العمل بنالیا اور اپنا سمجھا۔ شروع میں سنت کو قرآن مجید کا ایک شارح (Bye-laws) بنادیا گیا۔ یعنی اساسی قانون تو قرآن مجید ہے اور یہ سنت اس کی شارح ہے۔ مگر آگے چل کر قرآن مجید کا صرف اتنا حصہ مسلمانوں میں باقی رہا جو اس سنت کے مطابق تھا اور بہت سا حصہ چھوٹ گیا۔ اس سنت میں عربی قومیت کے خواص خاص طور پر نمایاں ہیں۔ دوسری صدی میں قرآن مجید عربی قومیت کا ایک قسم کا قانون تھا اور سنت اس کی

پوری شارح۔ قرآن مجید کی بین الاقوامی روح اس دوسری صدی میں اتنی نمایاں نہیں رہی جتنی پہلی صدی میں تھی۔ تیسری صدی میں جب بنوہاشم کی سرپرستی میں عجمی قومیں آگے بڑھیں تو قرآن مجید کی انٹرنیشنل روح (۱) زیادہ نمایاں ہونے لگی۔

* آیت ۱ **انا انزلناه فی لیلة القدر** (۲) ہم نے اس قرآن مجید کو لیلتہ القدر میں نازل کیا۔ یعنی جس رات انسانی فطرت کا بجٹ تیار ہوا تھا اس رات یہ پروگرام منظور ہوا ہے۔ آیت ۲ **و مادراک ما لیلته القدر** اس آیت میں لیلتہ القدر کی تفصیل ہے۔ آیت ۳ **لیلته القدر خیر من الف شهر** وہ لیلتہ القدر ایک ہزار مہینے سے اچھی ہے۔ انسان جب کسی کام کے کرنے کا مصمم ارادہ کر لے تو وہ کام نصف (۳) سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اب صحیح فیصلہ کے بعد اس کا صحیح دور شروع ہوگا تو اس میں وہ مجموعی طاقت کے کم حصہ کا مالک ہے یعنی اس حصہ میں پورے کام کے آدھے سے بھی کم کام رہ جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس لیلتہ القدر کی رات میں سو سال کے کام کا فیصلہ تھا تو فیصلہ کی رات اس زمانہ سے بہتر ہونی چاہیئے۔ یعنی پروگرام بنانے والی رات اس زمانے سے تو اچھی ہے جس زمانے میں یہ کام عملی طور پر شروع کر دیا جائے۔ (کیوں کہ مصمم ارادہ کرنے سے آدھے سے زیادہ کام ہو جاتا ہے) غرض کہ جس وقت یہ فیصلہ رسول کریم ﷺ پر نازل ہوا تو آپ نے اپنی فطرت کے مطابق عمل کیا۔ آپ کی فطرت یہ تھی کہ جب علم ہو جائے کہ اللہ کی طرف سے فلاں فیصلہ ہے تو آپ اپنی پوری قوت اس کام کے سرانجام دینے میں صرف کر دیتے تھے اور پوری طرح اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھک جاتے تھے۔ غرض یہ رات زمین پر بھی ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ کیوں کہ رسول کریم ﷺ کا فیصلہ بھی اسی طرح مکمل ہے جس طرح ملاء اعلیٰ میں مکمل فیصلہ ہوا۔

---

(۱) روح کا اقتضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کے دیدار کا اشتیاق ہو اور ملکیت کا تقاضا، طہارت اور نظام احسن ہے۔

(۲) حظیرۃ القدس اسی رات کے مانند ہے۔

(۳) نصف سے کم باقی رہتا ہے جو عمل کرنے سے پورا ہو جاتا ہے یعنی عملی دور جو آئے گا وہ نصف سے کم وقت لے گا۔ ایسے وقت میں علم اور اس کا پروگرام بنا کر اس پر اجتماع کرنا ہے۔

* آیت ۴ تنزل الملائکۃ و الروح فیھا باذن ربھم من کل امر
اس مصمم فیصلہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ کارکن فرشتے اور روح اس ہزار مہینے کا کام کرنے کے لیے اسی وقت نازل ہوجاتے ہیں۔ اور ہر قسم کا کام کرنے والے فرشتے اور روح سب نازل ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور وہ اللہ تعالی کے حکم سے اس کام کی بنیاد ڈالنی شروع کردیتے ہیں اور تمام شعبوں میں کام کرنے لگ جاتے ہیں اور اس کام کے مبادی شروط اور علل کے مہیا کرنے میں وہ فوراً اپنا کام شروع کردیتے ہیں اور وہ کام ایک ہزار ماہ میں پوری طرح مکمل ہوجاتا ہے جیسا کہ فیصلہ ہوا تھا۔ آیت ۵ سلام ھی حتی مطلع الفجر اس رات میں جس کام کی بنیاد رکھی جاتی ہے اس میں کامیابی ہی کامیابی ہے یعنی سلامتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کام میں ناکام بنانے والی کوئی طاقت آ ہی نہیں سکتی۔ اگر ادنی آدمی کو بھی اس کام پر مامور کیا جائے تو بھی صحیح سلامت کام ہوجائے گا۔ اس لیے کہ لوگوں (انسانیت) میں روحانیت اور ملکیت کی تشنگی اس رات نازل کردی گئی تھی۔ اب آنحضرت ﷺ کو اس کام کے چلانے میں تکلیف نہ ہوگی۔ سورۃ العلق میں آیت ۱۹ کلا لا تطع میں جو ذکر ہے کہ تم مخالفوں سے صلح نہ کرو اس کے متعلق اس سورۃ میں یقین دلایا گیا ہے کہ اس سو برس کے عرصہ میں کوئی چیز تم کو ناکام نہیں بناسکے گی۔ اس واسطے تم کو ڈٹ کر اپنا کام کرنا چاہیے۔ اگر کوئی مخالفت کرے گا تو اس کا ہم سر توڑ دیں گے۔ مطلع الفجر سے اگر قیامت مراد لی جائے تو معنی ہوں گے کہ تشنگی، ملکیت اور روحانیت کی انسانوں میں نازل ہوتی رہے گی۔ ملکیت کا تقاضا ہے نظام احسن، طہارت اور عدالت۔ روحانیت کا تقاضا ہے تعلق باللہ اور اس کے نور میں فنائیت۔ اگر روحانیت فقط ہے تو رہبانیت ہے۔

* جب دنیا کا انٹرنیشنل مرکز سو برس میں اپنے مرکز کو مضبوط بنالے گا تو اس کے بعد کیا پروگرام دیا جائے، اس کے متعلق ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بارے میں دوسری نسل والے خود سوچیں گے اور اس پروقت کے اقتضا کے مطابق کام کریں گے اس واسطے اس کے متعلق یہاں ذکر کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ بعض لوگ عمر بن عبدالعزیز کو دوسری صدی کے خاتمے پر مجدد مانتے ہیں اور وہ ۱۰۰ ہجری میں خلیفۂ اسلام

ہوئے تو اس زمانے کو ان کی تجدید کا زمانہ کہتے ہیں کہ دوسری صدی کے سر پر ایک مجدد آگیا۔ مگر ہم اس کی تجدید ۸۷ھ سے گنتے ہیں جو نبوت کے ۱۰۰ برس بعد ہوئی اور چودہ برس مسلسل رہی یہاں تک کہ خلافت پر پہنچے۔ اور خلافت کا کام صرف دو سال کے قریب انہوں نے سرانجام دیا۔ مگر ان کا کام در حقیقت نبوت کی صدی سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے انٹرنیشنل روح قائم کرنے کے لیے آیت **ان اللہ یامرکم بالعدل و الاحسان الایہ** کا خطبہ جمعہ میں داخل کر دیا جس کا مسلمانوں کے خطبہ میں آج تک اعلان ہوتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز کی تجدید کا جو دور ہے اس کے متعلق ہمیں خوشی ہے کہ اسی زمانے میں سندھ فتح ہوا۔ آپ کی خلافت کے زمانے میں جو دو سال کے قریب رہی سندھ کا اکثر حصہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ہندوستان میں اسلام کا یہ اول بیج ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ پنجاب، کشمیر، سندھ، فرنٹیر اور افغانستان وغیرہ میں جس قدر قومیں بستی ہیں یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مرکزی جماعتیں ہیں اور یہی امامت کی حقدار ہیں۔ دریائے سیموں در حقیقت یہی دریائے سندھ ہے جس کا حدیث میں ذکر آتا ہے۔ ہندی میں اس کا نام ہے سین۔ اور رسول کریم ﷺ نے اپنی حدیث میں اس کا نام سیمون ذکر کیا ہے۔ تو یہ زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ ملکی زبانوں میں ایسے اختلافات عموماً ہوتے ہیں۔ پنجاب کے پانچوں دریا اور کابل کا دریا وغیرہ در حقیقت دریائے سندھ کا احاطہ ہیں۔ "ہندوستان میں ہم تمام ہندوستان ہندوؤں کے لیے چھوڑ سکتے ہیں مگر اس علاقہ یعنی پنجاب، کشمیر، سندھ، فرنٹیر، بلوچستان اور افغانستان سے ہم کبھی دست بردار نہیں ہو سکتے۔ خواہ وہ تمام دنیا کو ہمارے مقابلے پر لے آئیں۔ غرض مسلمانوں کا مرکزی حصہ یہی ہے۔ اس طرح عربی قوموں کا مرکز نیل اور فرات کا درمیانی حصہ ہے اور عجمی قوموں کا مرکزی حصہ جیحون اور سندھ کا درمیانی حصہ ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالی اس عجمی سرزمین سے تعلق رکھنے والے تھے"

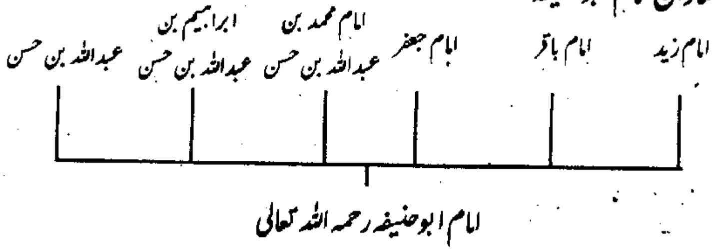
* عمر بن عبدالعزیز نے قرآن کے ماتحت عربی ذہنیت کو مہذب کر دیا ہمارا خیال ہے کہ عجمی ذہنیت کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے زندہ اور مہذب کر دیا۔ آپ بہت

بڑے امام ہیں۔ آپ عجمی قوم کو قرآن مجید اور فقہ کے مطابق اور حدیث پر عمل کرانے کے لیے عجمی ذہنیت مدنظر رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک عورت ہے کہ اس کو حمل ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی اور وہ زنا کی بھی قائل نہیں ہوتی اور اس کے خلاف شہادت بھی میسر نہیں ہوتی۔ حضرت عمرؓ اس کو رجم کی سزا دیتے ہیں مگر امام ابوحنیفہ اس کو رد کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب وہ زنا کی مرتکب ہونے کی قائل نہیں اور اس کے خلاف ثبوت بھی نہیں ملتا تو اس حالت میں اسے کیسے رجم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت مریم علیہا السلام کا واقعہ لیجئے کہ آپ کو بھی حمل تھا اور آپ زنا کی بھی مرتکب نہیں ہوئیں۔ مگر اس کے باوجود آپ کی دین داری کی دنیا گواہ ہے غرض اسی طرح اس عورت کا بھی معاملہ ہے۔ شک کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو دینا چاہیے۔ امام ابوحنیفہ نے نہ امامت کا دعویٰ کیا اور نہ حکومت سے منصب لیا اور نہ کسی سے کوئی پیسہ لیا بلکہ اپنا تمام علم مسلمانوں کو دے دیا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ایک آیت تھی کہ اس نے عجمی قوموں کی ہدایت کے لیے ابوحنیفہ جیسا برگزیدہ انسان پیدا کیا جس نے قرآن مجید کے سمجھنے میں عجمی لوگوں کی ذہنیت بدل دی۔ ہم ابوحنیفہ کے فقہ کی تقلید اس لیے نہیں کرتے کہ ہمارے آباء واجداد اس کے قائل تھے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان، ایران، افغانستان اور ترکستان میں ابوحنیفہ کے فقہ کے سوائے کوئی حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔ اس میں اگر اختلاف ہے تو صرف ایران کے شیعوں کا۔ مگر ہم امام ابوحنیفہ کے فقہ کو ائمہ اہل بیت کے ساتھ ملا سکتے ہیں۔ شیعوں کے دو فرقے ہیں ایک زیدی اور دوسرا امامیہ زیدی فرقہ کے امام حضرت زید ہیں اور امامیہ فرقہ کے امام حضرت امام جعفر صادق ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ان دونوں بزرگوں کے براہ راست شاگرد ہیں۔ ان کے علاوہ امام ابوحنیفہ امام باقر کے بھی شاگرد ہیں۔

* ان بزرگوں کے علاوہ دو حسینی امام ہیں (۱) محمد بن عبداللہ بن حسن اور (۲) ابراہیم بن عبداللہ بن حسن بن حسن علی انہیں حسن مثنیٰ کہتے ہیں۔ یہ دونوں بزرگ خلیفہ منصور سے لڑے ہیں اور امام ابوحنیفہ ان دونوں کے شاگرد ہیں اور ان دونوں بزرگوں کی تحریک خلافت کے مؤید اور معاون ہیں اور ان کو مدد دیتے رہے ان دونوں اماموں کے

والد عبداللہ بن حسن بھی امام ابوحنیفہ کے استاد تھے۔ غرض حضرت علیؓ کی اولاد میں جتنے امام گزرے ہیں امام ابوحنیفہ کا تعلق ان تمام اماموں سے ثابت ہے۔ اسی طرح عبداللہ بن مسعودؓ کی اولاد میں جتنے امام پیدا ہوئے امام ابوحنیفہ کا ان تمام کے ساتھ تعلق تھا۔ اور یہ تمام ائمہ اہل بیت ظالم مسلمان بادشاہ سے لڑنا فرض سمجھتے تھے۔ اسی واسطے آپ خلیفہ منصور کے خلاف سید حسن مثنی کی تحریک کے مؤید تھے۔ امام مالک بھی مدینہ میں امام ابوحنیفہ کے مانند اس تحریک خلافت کے مؤید تھے۔ منصور کے نائب مدینہ نے امام مالک کو تو خود سزا دی اور خلیفہ منصور نے امام ابوحنیفہ کو جیل میں ڈال کر کوڑے کی سزا دلائی۔ حتی کہ آپ جیل ہی میں فوت ہوگئے۔ ہارون الرشید کے زمانے میں برامکہ بڑے کامیاب اور مشہور وزیر گزرے ہیں۔ یہ تمام ابوحنیفہ کے شاگردوں کے تربیت یافتہ ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں میں امام ابویوسف نے ان کی خاص تربیت کی۔

استادان امام ابوحنیفہ:



* امام ابوحنیفہ اگرچہ شاہی تعلقات سے آزاد رہے لیکن قوم اور ملک کے ساتھ ان کے جو تعلقات تھے وہ خود ایک ملکی حیثیت رکھتے تھے جس کے فرائض کو انہوں نے اس دانائی اور ہوشمندی کے ساتھ سرانجام دیا جو ایک مدبر سلطنت کے شایان شان تھے۔ ان کے حلقہ درس سے جو شاگرد نکلے وہ ملکی عہدوں پر پہنچے اور نہایت دیانت اور قابلیت سے اپنی خدمتوں کو انجام دیا۔ ان میں خاص طور پر قاضی ابویوسف مشہور ہیں یہ صحیح ہے کہ ملکی تعلقات کے ساتھ مذہب اور اخلاق کے فرائض کو سمجھا دینا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن امام صاحب اس سے بے خبر نہ تھے وہ شاگردوں کو ہمیشہ ایسی ہدایتیں

کرتے تھے جن کی پابندی سے دین اور دنیا دونوں حاصل ہوں(۱) فقہ حنفی نہایت تیزی سے تمام ملک میں پھیل گیا۔ عرب میں تو چنداں رواج نہ ہوا کیوں کہ مدینہ میں امام مالک اور مکہ میں ائمہ اور ان کے حریف مقابل موجود تھے۔ لیکن عرب کے سوا تمام ممالک اسلامیہ میں جن کی وسعت سندھ سے ایشیائے کوچک تھی عموماً ان ہی کا طریقہ جاری ہوگیا۔ ہندوستان، سندھ، کابل اور بخارا وغیرہ میں تو ان کے اجتہاد کے سوا کسی کا اجتہاد تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ عثمان حکومت جن لوگوں کے ہاتھ رہی وہ اکثر حنفی فقہ ہی کے پابند تھے۔ خلفاء عباسیہ تو اس بحث سے خارج ہیں کیوں کہ یہ خاندان جب تک عروج پر رہا تلوار کے ساتھ قلم کا بھی مالک رہا ہے۔ ان کو خود اجتہاد کا دعوی تھا۔ انہوں نے کبھی کسی کی تقلید نہیں کی۔ تنزل کے بعد وہ اس قابل نہیں رہے کہ ان کے حالات سے کسی ملکی اثر کا اندازہ کیا جائے۔ تاہم ان میں اگر کسی نے تقلید گوارا کی تو امام ابوحنیفہ کی۔

* عباسیہ کے تنزل کے ساتھ جن خاندانوں کو عروج ہوا وہ اکثر حنفی تھے۔ خاندان سلجوق جس نے ایک بڑی مدت تک حکومت کی اور جس کے دائرہ حکومت کی وسعت طول میں کاشغر سے بیت المقدس اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد خوذ تک پہنچی تھی حنفی تھا۔ سلطان محمود غزنوی فقہ حنفی کا بہت بڑا عالم تھا فن فقہ میں اس کی ایک نہایت عمدہ تصنیف موجود ہے جس کا نام التفرید ہے اور جس میں کم و بیش ساٹھ ہزار مسئلے ہیں۔ نور الدین زنگی جس نے سب سے پہلے بیت المقدس کی لڑائیوں میں نام پیدا کیا اور جس کے دربار کا ملازم صلاح الدین فاتح بیت المقدس تھا وہ اگرچہ شافعی و مالکی فقہ کی بھی عزت کرتا تھا لیکن وہ خود اور اس کا تمام خاندان مذہباً حنفی تھا صلاح الدین خود شافعی تھا مگر اس کے خاندان میں بھی حنفی المذہب موجود تھے۔ الملک المعظم عیسی بن الملک العادل جو ایک وسیع ملک کا بادشاہ تھا حنفی مذہب میں غلو رکھتا تھا۔ چراکسہ مصر جو نویں صدی کے آغاز میں مصر کی حکومت پر پہنچے اور ۱۴۸ برس تک فرمان روا رہے اور بہت سی فتوحات حاصل کیں، خود حنفی تھے اور انکے دربار میں اسی مذہب کو زیادہ فروغ حاصل تھا۔ اب

(۱) سیرت نعمان ص ۵۸۔

تک مصری حکومت کا قانون ہے کہ قاضی سے عہد لیتے ہیں کہ حنفی مذہب پر فیصلہ کرے سلاطین ترک جو کم و بیش چھ سو برس سے روم کے فرماں روا ہیں عموماً حنفی ہیں۔ خود ہمارے ہندوستان کے فرماں روا خوانین اور آل تیمور اسی مذہب کے پابند رہے اور ان کی وسیع سلطنت میں اس طریقہ کے سوائے اور کسی طریقہ کو رواج نہ ہوسکا۔ تمام ممالک اسلام میں تین فقہوں نے رواج پایا حنفی فقہ، مالکی فقہ، شافعی فقہ۔ مسائل فقہ کی ترویج و اشاعت کا سبب اگرچہ خود ان کے مسائل کی خوبی و عمدگی ہے لیکن کچھ شبہ نہیں ہے کہ اس امر میں وضع فقہ کے ذاتی رسوخ اور عظمت کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ امام ابو حنیفہ کے سوا اور مجتہدین کے فقہ کی ترویج و اشاعت کا باعث زیادہ تر ان کی ذاتی خصوصیتیں تھیں۔ امام مالک مدینہ میں رہنے والے تھے جو نبوت کا مرکز اور خلفائے راشدین کا دارالخلافہ رہ چکا ہے اور ان کا خاندان ایک علمی خاندان رہ چکا ہے۔ اسی طرح امام شافعی کا وطن مکہ معظمہ تھا۔ باپ کی طرف سے قریشی اور ماں کی طرف سے ہاشمی تھے۔ مکہ معظمہ کی ولادت خاندان کا اعزاز اور رسول کریم ﷺ کی ہم نسبی ایسی چیزیں تھیں جن سے بڑھ کر حسن قبول اور مرجعیت کے لیے کوئی آلہ کارگر نہیں ہوسکتا تھا۔ امام ابوحنیفہ میں اس قسم کی کوئی خوبی موجود نہ تھی اور نہ کوئی خصوصیت تھی۔ وہ عربی النسل بھی نہیں تھے خاندان میں کوئی ایسا شخص نہیں گذرا جو اسلامی گروہ کا مرجع اور مقتدر ہوتا آبائی پیشہ تجارت تھا اور خود بھی تمام عمر اس ذریعے سے زندگی بسر کی۔ غرض کہ حسن قبول اور عام اثر کے لیے جو اسباب درکار ہیں وہ بالکل نہ تھے۔ اس کے باوجود ان کے فقہ کا تمام ممالک اسلامیہ میں اس وسعت اور ترقی کے ساتھ رواج پانا یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا طریقہ فقہ انسانی ضرورتوں کے لیے نہایت مناسب اور موزوں واقع ہوا تھا اور بالخصوص تمدن کے ساتھ جس قدر ان کے فقہ کو مناسبت تھی، کسی فقہ کو نہ تھی۔ وضع مسائل میں شافعی اور مالکی فقہ حنفی کی تقلید کرتے ہیں۔ علم کا پہلا درجہ ہے وضع سوال، جس طرح وضع سوال کی امام ابوحنیفہ نے اختیار کی اس کو تمام فقہ والے اختیار کرتے ہیں امام شافعی نے خود جا کر امام محمد سے فقہ کے قواعد سیکھے۔ اسی طرح مدونہ کی تدوین کرنے والے امام ابوالقاسم مالکی نے امام ابوحنیفہ کے شاگردوں سے فقہ سیکھا۔ فقہ میں بڑی مشکل بات وضع سوال ہے تو یہ بات فقہ حنفی کی ایجاد شدہ ہے۔

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ اٰيَاتٍ

سورۂ بینہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ

نہ تھے وہ لوگ جو منکر ہیں اہل کتاب اور مشرک والے

مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ① رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا

باز آنے والے یہاں تک کہ پہنچے ان کے پاس کھلی بات ایک رسول اللہ کا پڑھتا ہوا

صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ② فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ③ وَمَا تَفَرَّقَ

ورق پاک کہ اس میں لکھی ہیں کتابیں مضبوط اور وہ جو پھوٹ پڑی

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ④

اہل کتاب ہیں سو جب کہ آچکی ان کے پاس کھلی بات

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ

اور ان کو حکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی خالص کرتے اس کے واسطے بندگی

حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ

ابراہیم کی راہ پر اور قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور یہ ہے راہ

الْقَيِّمَةِ ⑤ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ

مضبوط لوگوں کی بے شک جو منکر ہوئے اہل کتاب اور

الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ هُمْ

مشرک ہونگے دوزخ کی آگ میں سدا رہیں اس میں وہ لوگ ہیں سب

شَرُّ الْبَرِيَّةِ ⑥ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

خلق سے بدتر وہ لوگ جو یقین لائے اور کیے بھلے کام

أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ﴿٧﴾ جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ

وہ لوگ ہیں سب خلق سے بہتر بدلا اُن کا اُنکے رب کے یہاں باغ ہیں

عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ رَضِيَ

ہمیشہ رہنے کو بہتی ہیں اُن کے نیچے نہریں سدا رہیں اُن میں ہمیشہ اللہ

اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ﴿٨﴾ ع

اُن سے راضی اور وہ اس سے راضی ہوئے یہ ملتا ہے اس کو جو ڈرا اپنے رب سے

سورۃ البینہ مدنیہ

* سورۃ بینہ میں ہے کہ ذہنی اور سوشل انقلاب کسی اہل کتاب یا مشرکین کی کسی جماعت نے نہیں کیا وہ ریا کشنری ہوگئے تھے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ ایک نبی آکر انقلاب کرے۔ وما تفرق الذی الایہ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد ایک فرقہ اہل کتاب میں سے بھی انقلابی ہوگیا تو وہ بھی اس لیے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے ان کو برانگیختہ کیا۔ وماتفرق الذین یعنی فرقہ فرقہ ہوئی۔ ایک جماعت انقلابی ہوئی اور ایک انقلابی نہ ہوئی۔ جو انقلابی تھے انہوں نے پورا انقلاب نہیں کیا بلکہ انقلاب میں کچھ حصہ لیا۔ الحاصل اس سورت کا مطلب ہے کہ قرآن اسلام کا ایک عمومی پروگرام ہے (سورۃ القدر میں اس کا بیان ہوچکا ہے) اور اس کا عملی مجسمہ آنحضرت ﷺ ہیں۔ کوئی تعلیم جب تک انسانی شکل میں مجسم نہ ہوجائے دنیا میں انقلاب پیدا نہیں کرسکتی۔ اس سورۃ کا بس اتنا خلاصہ ہے۔ آیت۱ **لم یکن الذین کفروا(۱) من اهل الكتاب(۲) الایہ** اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ اپنے دین پر عمل کرنا چھوڑ بیٹھے وہ لوگ کبھی باز نہ آئیں گے جب تک کہ ان کے پاس البینہ نہ آجائے۔ آیت۲ **رسول من الله یتلوا. الایه** اس بینہ کی تفسیر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔ **یتلوا صحفاً مطهرة** ان مقدس صحیفوں میں نہ ٹوٹنے والے قانون ہیں جو فطرت انسانی کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں فطرت انسانی جب تک اس رنگ پر رہے گی جس پر کہ وہ ابتدا سے چلی آرہی ہے اس وقت تک وہ قانون اسی طرح رہیں گے ہر ایک سورت مقدس صحیفہ ہے۔ رسول ایک انسان ہے جسے تمام مقدس کتابوں

---

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم اپنی تصنیفات میں ایک کلی نظام کا لفظ انقلاب کی جگہ پر فرماتے ہیں۔ تھوڑے عرصہ میں یعنی ۱۰۰ سال میں انقلاب روحانی و ملکیت جو کہ نصب العین کتاب اللہ کا ہے اور جس کا ذکر سورۃ القدر میں ہوا ہے وہ انقلاب نہ مشرکین سے اور نہ اہل کتاب سے ہوسکتا تھا اگرچہ حکومتوں کے انقلاب ہوئے۔

(۲) تین فرقے جو کہ خود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیرو جانتے تھے انقلاب روحانی و ملکیت نہیں کرسکتے تھے اس لیے نئی جماعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔

کا خلاصہ یاد ہے۔ وہ تمام مقدس کتابوں کو قانون فطرت پر جمع کر سکتا ہے۔ اس کا دعوی ہے کہ کوئی نبی سوائے اس کے کہ انسانی فطرت کے طبعی قوانین سکھائے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ اس مقصد میں تمام دین ایک ہیں اور ہر ایک دین کو اپنی صحت کے لئے اس انٹرنیشنل نقطہ کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ (آیت ۴ دیکھو آیت ۵ کے بعد)

* آیت ۵ و ما امروا الا لیعبدوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین وہ مشترک نقطہ یہ ہے کہ وہ سارا دین اللہ تعالی کی عبادت کے لیے مخصوص کر دیں۔ ان کا قانون یہ ہو کہ اللہ تعالی کی پوری غلامی کی جائے اور اس کے سوائے کسی کی غلامی نہ کی جائے۔ حنفاء اور وہ دین حنیفی طریقہ پر ہو کہ جس میں کسی قسم کا کوئی مجسمہ سامنے رکھ عبادت نہ کی جائے اس لیے کہ اگر کوئی مجسمہ سامنے رکھا گیا تو پھر ہر ایک قوم اپنے اپنے مجسمے سامنے رکھے گی اور اس طرح اتحاد نہیں ہوگا۔ یہ ہے حنفاء کا ترجمہ یعنی تم میں سے ہر ایک حنیف بن جائے حنیف لقب ہے ابراہیم علیہ السلام کا۔ اس میں فائدہ یہ ہوگا کہ ایک تو تمام قومیں آپس میں متحد ہو جائیں گی اور دوسرے انسان کی عقلیت پر زیادہ زور آئے بنسبت اس کی حسیات کے اور اس سے انسانیت کے مرکز سنبھالنے والی ایک صحیح طاقت پیدا ہو جائے گی جو عقلیات پر بحث کرنے والی ہو گی اور ایک ہی نظریہ پر متفق ہو جائے گی۔ یہ ہے فائدہ حنفاء ہونے کا۔ عقلی باتوں پر اعتقاد کرنے والی تمام قوموں میں جس قدر حکیم پیدا ہوں گے ان کا ایک ہی مسلک ہوگا۔ اور انسانیت ان سے باہر نہیں جا سکے گی۔ حنفاء ہونے سے یہ فائدہ پہنچ رہا ہے کہ لوگوں کو ایک مرکز پر آنے کا طریقہ بتلا دیا گیا۔ کسی انقلابی انسان کو دیکھنے کے بعد انسان میں انقلاب آتا ہے یعنی انسان کسی دوسرے انقلابی زندہ انسان کی صحبت سے انقلاب سیکھ سکتا ہے۔ تو جس زندہ انسان کی صحبت سے کسی نے کچھ سیکھا ہے اس کی تصویر یاد رکھنے کے لیے اگر اس کا مجسمہ رکھنے کی ضرورت ہو تو وہ بالکل پاگل آدمی ہے جو اس طرح اس کا مجسمہ سامنے رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس انسان کی صحبت سے انسان فیض یاب ہوتا ہے اس کی صورت تو انسان کے دماغ میں خود بخود رہتی ہے اور یہ انسان کی عقلی قوتوں کو موثر کرنے کے لیے کافی ہے۔ اور گزشتہ بزرگوں کی تصویریں یاد کرنا اور ان کے مجسمے

سامنے رکھنا انسان کو حقائق سمجھنے سے قاصر کردیتا ہے۔ اس سے انسان کے دماغ پر ہر قسم کے خرافات قابض ہوسکتے ہیں۔ کیوں کہ جب کوئی آدمی کسی گذشتہ انسان کی صورت اپنے دل میں بٹھاتا ہے اور وہ نہ اس کو جانتا ہے اور نہ اس کی حقیقت کو، بلکہ کسی کے بتانے پر تصور کرلیتا ہے تو اس سے بہت سے خرافات دماغ پر قابض ہوسکتے ہیں۔ محض وہمیات کو اس کی طرف منسوب کرکے ان کو اعتقادیات کے درجہ پر پہنچا دیتا ہے۔ اس لیے استاد کی دیکھی ہوئی تصویر جو دماغ میں بیٹھ جاتی ہے کافی ہے کیوں کہ اس سے فقط ان کے اعمال و افعال کی یادداشت دل میں اترتی ہے اس کے سوا اور کوئی وہمیات اس کے دماغ پر اثر نہیں کرتیں۔

* خلاصہ یہ نکلا کہ انسان کو جس قدر ایک استاد کی صورت سامنے رکھنے کی ضرورت ہے وہ مجسمہ رکھنے کے بغیر ہی حاصل ہے۔ اگر حقیقی استاد کے سوا کسی دوسرے کا مجسمہ سامنے رکھا جائے تو یہ انسان کی غلط رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے تصویر سامنے رکھ کر عبادت کرنے کا طریقہ بالکل منسوخ کردیا گیا۔ یہ ہے حنیفی دین کا خاصہ کہ جس پر قانون مبنی ہے اور جس کی دعوت قرآن مجید دیتا ہے۔ **و یقیموا الصلوۃ و یوتوا الزکوۃ** نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں اس کی تشریح گذشتہ سورتوں میں کافی ہوچکی ہے۔ **و ذالک دین القیمہ** یہ وہ قانون ہے جو نہ تو کبھی شکست پاسکتا ہے اور نہ کبھی ٹوٹ سکتا ہے۔ آیت ۴ **و ماتفرق الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ماجا ءتھم البینہ**(۱) اور جب وہ بینہ آیا تو بھی یہ اہل کتاب اپنا جدا فرقہ بنا کر بیٹھ گئے اور اس کی اتباع نہ کی تو اپنی کتاب کے حکم سے یہ مجرم ٹھہرائے جاتے ہیں۔ جو حکم آیت **و ما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء و**

---

(۱) اس جگہ تفسیر روح المعانی کو دیکھو کہ وہ بھی احتمال نکالتی ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ بعض انقلابی بنے اور بعض انقلابی نہ بنے یہ معنی ہے تفرق کا۔ اور روح المعانی نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک جماعت ایمان لائی اور ایک ایمان نہ لائی۔ تو ہم اس کی بھی یوں تعبیر کریں گے کہ ایک جماعت آنحضرت ﷺ کے نظریات پر ایمان لائی اور دوسری ویسی کی ویسی رہی۔ یعنی اہل کتاب کے ایک فرقہ نے تعلیم کے نقطہ پر انقلاب کیا کسی معنوعات کے نقطہ پر نہیں۔ مگر یہ سب کچھ آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ہوا۔

یقیموا الصلواۃ و یوتوا الزکوۃ یہ عمل مشترک ہے جو تمام ادیان میں مسلم تھا۔ اس کی دعوت دینے والا انسان راسخ القدم سامنے آگیا اب اس کے بعد کسی اہل کتاب کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ انٹرنیشنل نقطہ سے علیحدہ ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مذہب کی کتابوں میں اس شخص (یعنی آنحضرت ﷺ) کے متعلق پیشین گوئی موجود ہے (انجیل میں فارقلیط، توراۃ میں مسیح یا میح اور ہندو ویدوں میں رام کے آنے کی پیشین گوئی اور اہل فارس میں اس طرح کہ ایک شخص آئے گا جس کا نزول خدا کے نزول کے برابر ہوگا۔ وہ نہایت آسانی سے آسمانی بادشاہت زمین پر قائم کرے گا۔ ایک مبصر انسان تمام مذہبوں کی پیشین گوئیاں جمع کرے تو وہ آنحضرت ﷺ پر پوری طرح منطبق ہو جاتی ہیں تو آنے والا آگیا مگر یہ لوگ یعنی اہل مذہب آج تک انتظار کر رہے ہیں) اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ جب وہ شخص آئے تو اس کی اطاعت کریں اب اگر اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ مجوس اور ہندو اپنے فرقہ کو الگ رکھنے کی کوشش کریں تو ان کے مجرم ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ ان کی کتاب میں ان کو حکم تھا کہ جب وہ شخص آئے تو اس کی فوراً اطاعت کریں اور جب انہوں نے اطاعت سے انکار کر دیا تو وہ اپنی کتاب کی رو سے مجرم بن گئے۔

* آیت۶ ان الذین کفروا من اهل الکتاب(۱) و المشرکین اہل کتاب کو حکم تھا کہ اس نبی کی اطاعت کرو مگر وہ اس نبی کی اطاعت نہیں کرتے۔ اس واسطے وہ اپنی کتاب کے حکم کے مطابق کافر ٹھہرے۔ اب مشرکین کا ذکر آتا ہے کہ وہ اپنے سامنے صورتیں رکھ کر عبادت کرتے ہیں۔ دین حنیفی کے آنے پر یہ طریقہ بند کر دیا گیا اور یہ بات تو مشرکین مکہ پر واضح ہے۔ اس واسطے فی نار جهنم خالدین فیها ان دونوں کی سزا جہنم ہے یعنی یہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اولئک هم شر البریه وہ انسانیت کا بدترین حصہ ہیں کیوں کہ یہ ریاکشنری جماعت ہیں

---

(۱) اہل کتاب کے ایک فرقے نے یہ انقلاب قبول کر لیا جیسے اہل شام و مصر دونوں نے انقلاب ملکیت اور روحانیت قبول کر لیا۔ یا تو خود مسلمان ہو گیا یا اس انقلاب سے متاثر ہو کر کام کرنے لگے۔ ایک فرقہ ترقی کا خواہاں ہو گیا اور دوسرا فرقہ (ان الذین کفروا) کے تحت اپنی ری ایکشنری حالت پر رہا تو اس کے لئے دنیا و آخرت میں نار جہنم ہے۔ یعنی ہمیشہ غلام رہا یہ معنی ہے وما تفرق کا۔ واللہ اعلم۔

ترقی پسند نہیں ہیں۔ آیت ۷ ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات جو لوگ اس نبی کی دعوت کو مان کر اچھے کاموں میں لگ گئے اولئک هم خیرالبریه وہ انسانیت کا بہترین حصہ ہے آیت ۸ جزا ھم عند ربھم ان کے لیے بہشت ہے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی۔ مطلب یہ کہ یہ مرکزی جماعت ہے۔ ذالک لمن خشی ربه یہ درجہ ان لوگوں کے لیے ثابت ہوگا جو ربانی نظام کے سلسلۂ علت و معلول کو ٹھیک طرح سمجھتے ہیں انہیں کے دل میں سزا ملنے سے پہلے ڈر پیدا ہوسکتا ہے۔ اور ان کے دل میں عاقبت اندیشی کی وہ استعداد ہے اور یہی جماعت ہے جس کے حق میں ہے کہ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔

سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانُ اٰيٰتٍ

سورۂ زلزال مدینہ میں نازل ہوئی اور اسکی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝١ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ

جب ہلا ڈالے زمین کو اُسکے بھونچال سے ف۳ اور نکال باہر کرے زمین

أَثْقَالَهَا ۝٢ وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۝٣ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ

اپنے اندر سے بوجھ ف۴ اور کہے آدمی اُس کو کیا ہو گیا ف۵ اُس دن کہہ ڈالیگی

أَخْبَارَهَا ۝٤ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝٥ يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ

وہ اپنی باتیں اس واسطے کہ تیرے رب نے حکم بھیجا اُس کو ف۶ اُس دن ہو پڑینگے

النَّاسُ أَشْتَاتًا لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝٦ فَمَنْ يَعْمَلْ

لوگ طرح طرح پر ف۸ کہ اُنکو دکھا دیے جاویں اُنکے عمل ف۹ سو جس نے کی

مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝٧ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ

ذرہ بھر بھلائی وہ دیکھ لیگا اُسکو اور جس نے کی

ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝٨

ذرہ بھر بُرائی وہ دیکھ لیگا اُسے ف

سورۃ الزلزال مدنیہ

* جو لوگ ربانی نظام کو راست جاننے والے ہیں وہ اگر کسی گاؤں میں ہوں گے تو اساسی قانون کے تحت ایک چھوٹی سی جماعت پیدا کردیں گے اگر شہر میں ہوں گے تو اس طرز کی جماعت شہر ہی میں پیدا کردیں گے۔ اگر کسی ملک میں ہوں گے تو اسی طرح گاؤں اور شہر کی جماعت کو ترقی دے کر ملک بھر میں جماعت بنادیں گے اور پھر ترقی کر کے تمام دنیا میں اس قسم کی جماعت پیدا کردیں گے غرض جو شخص ربانی نظام قدرت کو سمجھتا ہے وہ اس سے نیچے تو ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ جو شخص گاؤں میں اس قسم کا نظام پیدا کردیتا ہے اسے اس کی حفاظت کا بالکل یقین نہیں ہوتا جب تک ایسا نظام شہر میں پیدا نہ کردے۔ ورنہ شہر کا فاسد نظام گاؤں میں آکر اچھے نظام پر غالب آجائے گا۔ اسی طرح جب ایک شہر میں اچھا نظام پیدا کردیا جائے گا تو اس پر کبھی اطمینان نہیں ہوسکتا جب تک کہ ملک میں ایسا نظام پیدا نہ کیا جائے ورنہ ملک کا فاسد نظام اس شہر کے اچھے نظام کو کھا جائے گا۔ اسی طرح جب ایک ملک میں اچھا نظام پیدا کردیا جائے گا تو اس پر بھی کبھی اطمینان نہیں ہوسکتا جب تک کہ دنیا کی تمام متمدن قوموں کو اس نظام کا پابند نہ بنادیا جائے ورنہ بین الاقوامیت کی اکثریت اس نظام کو فاسد کردے گی اور بگاڑ کر رکھ دے گی۔ تو نظام قدرت کے علت و معلول کے سمجھنے کا لوگوں کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ ہر مستقبل میں آنے والے خطرے سے ڈر کر اسکی پیش بندی کردیں گے اور دنیا میں انسانیت کے لیے ایک عمدہ انٹرنیشنل مرکز پیدا کردیں گے اسلام نے اس کو پہلی صدی میں طے کرلیا ہے۔ یہ مطلب العلق، القدر اور البینہ کے ارتباط کا ہے۔

* آیت ۷و۸ **و من یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ** ان دونوں آیات میں مرکزی نقطہ سمجھایا گیا ہے ربانی نظام قدرت (علت و معلول) کا جو سلسلہ ہے اس کی انتہا یہ ہے کہ انسان جو کچھ عمل کرے گا اس کی جزا اس کو ضرور ملے گی یہ جزا خواہ اسے اس دنیا میں ملے یا اگلی دنیا میں مگر اس کی جزا مل کر رہے گی۔ انسان اگر انسانیت کے قانون کو ذرہ بھر بھی توڑے گا (اس کا نام

برائی ہے) تو اس کی سزا اس کو مل کر رہے گی۔ یہ نظام کی پختگی کی دلیل ہے کہ یہ نظام کسی صورت میں ٹوٹ نہیں سکتا۔ اس موجودہ نظام کی رسیاں جب ڈھیلی پڑجائیں گی تو زمین میں انقلاب آجائے گا اس لیے کہ اب ڈھیلا ہونے سے یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ جیسے خیمہ کی چوبیں اور طنابیں اگر ڈھیلی پڑ جائیں تو خیمہ کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ اور یہ قیامت کی ابتداء ہے۔ آیت ۱و۲ اذا زلزلت الارض زلزالها و اخرجت الارض اثقالها زمین اپنے جسم کے موافق پورے زور سے زلزلہ میں آجائے گی یعنی اس نظام کی رسیوں میں جب خلل آجائے گا تو زمین ٹھہر نہیں سکے گی۔ یہ ابتدا ہے دوسری زندگی کی۔ اور انسان کا جو حصہ زمین میں دفن ہوگا اس کو نکال دے گی تو انسان دوسری زندگی میں آجائے گا۔ جتنی بوجھل چیزیں ہیں زمین ان سب کو نکال دے گی۔ انسان اس زمین پر صرف اسی شرط پر زندہ رہ سکتا ہے کہ یہ موجودہ نظام قائم رہے یعنی یہ سورج اور چاند اور آسمان قائم رہیں۔ آسمان سے بارش ہو، زمین سیراب ہو وغیرہ۔ مگر جب یہ نظام ٹوٹ جائے گا تو انسان کے یہاں رہنے کی گنجائش ہی نہیں۔ اسی واسطے انسان ایک دوسری دنیا میں منتقل کیا جائے گا۔ آیت ۳و۴ و قال الانسان مالها الایه جتنے انسانی اعمال ہیں وہ تمام ننگے ہو رہے ہیں اور انسان کے ساتھ چمٹ رہے ہیں جیسے کسی نے چوری کی ہے تو چوری کا گناہ اب چوری کی شکل میں انسان سے چمٹ رہا ہے اور انسان حیران ہو رہا ہے کہ یہ کیسے ہو رہا ہے۔ آیت ۵ بان ربک اوحیٰ لها اللہ تعالیٰ نے زمین پر ایسی بارش کردی ہے کہ انسان کے عمل اصل شکل میں انسان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ آیت ۶ یومئذ یصدر الناس اشتاتا الایه اس دن تمام بنی نوع انسان گروہ وار آئیں گے یعنی ایک قسم کے اعمال کے لوگ ایک جماعت میں ہوں گے تاکہ وہ اپنے اعمال کو دیکھ سکیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو قیامت کا ذکر آتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کو ایک عجیب چیز بتلانی منظور ہے۔ بلکہ اسے یہ بتانا ہے کہ تیرا جو کچھ عمل اس دنیا میں ہے وہ ضائع نہیں کیا گیا اس زمین کے نظام میں ایسا انقلاب پیدا کیا جائے گا کہ انسان کے کام ذرہ ذرہ محفوظ رکھے جائیں گے اور اس کا معاوضہ انسان کو دیا جائے گا۔ اسی کا نام ہے قیامت۔

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً

سورہ عادیات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝۱ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۝۲ فَالْمُغِيْرٰتِ

قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر پھر آگ سلگانے والے جھاڑ کر ف پھر غارت ڈالنے والے

صُبْحًا ۝۳ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝۴ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝۵

صبح کو ف۲ پھر اٹھانے والے اس میں گرد ف۳ پھر گھس جانے والے اس وقت فوج میں ف

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝۶ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ

بیشک آدمی اپنے رب کا ناشکرا ہے ف اور وہ آدمی اس کام کو

لَشَهِيْدٌ ۝۷ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝۸ اَفَلَا يَعْلَمُ

سامنے دیکھتا ہے ف اور آدمی محبت پر مال کی بہت پکا ہے ف کیا نہیں جانتا

اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝۹ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝۱۰

وہ وقت کہ کریدا جائے جو کچھ قبروں میں ہے اور تحقیق ہوئے جو کچھ کہ جیوں میں ہے ف

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝۱۱

بیشک ان کے رب کو ان کی اس دن سب خبر ہے ف

سورۃ العادیات مکیہ

* آیت ۱تا۵ و العادیات ضبحاً. فالمغیرات صبحاً. الایات
گھوڑوں کو بطور قسم بیان کیا گیا ہے اور ان کی پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں ان کے سمجھنے میں مفسرین کو بہت اشکال ہے۔ ان کی ذہنیت یہ ہے کہ جہاں کہیں قسم کا ذکر آتا ہے وہ اسے بہت مقدس سمجھتے ہیں اس خیال سے کہ قسم ہمیشہ مقدس چیز کے لیے آتی ہے اب وہ ان گھوڑوں کو بھی مقدس بنانا چاہتے ہیں اس واسطے وہ ان کو غازیوں کے گھوڑے کہتے ہیں۔ مگر یہ سورت مکی ہے اس واسطے غازی کہاں اور گھوڑے کہاں! وہ کہتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے کہ آگے چل کر غازی اور ان کے گھوڑے ہوں گے۔ غرض اس طرح وہ ظاہر سے بہت دور ہوگئے۔ اس واسطے بعض مفسرین نے حاجیوں کے قافلے کے اونٹوں کو اس جگہ مراد لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ مقدس چیز ہے۔ حاجیوں کے قافلے انہی اونٹوں پر جاتے تھے اور مکی زندگی میں یہ ہوتا تھا۔ اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ قسم کا جہاں کہیں ذکر آتا ہے وہ اس میں بہت تقدس مراد لیتے ہیں۔ مگر ہماری رائے اس کے خلاف ہے۔ ہم ان قسموں کو تقدس کے طور پر نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہ ایک فقط لطیف شہادت ہوتی ہے جس سے لطیف ذہنیت کو بات جلدی سمجھا دی جاتی ہے۔ اگر اس نازک مسئلہ پر حجت اور دلیل قائم کی جاتی تو اس پر بہت جھگڑے پیدا ہوجاتے۔ اس واسطے ہم اس سے ڈاکوؤں کے گھوڑے مراد لیتے ہیں۔ اہل عرب ان سے بخوبی آگاہ ہیں اس جگہ ان گھوڑوں کا ذکر کرکے ایک نتیجہ نکالا جائے گا اور یہی قسم کا مطلب ہے۔
آیت ۱و۲ گھوڑوں کی تعریف ہے۔ آیت ۳ فالمغیرات صبحا صبح کے وقت غارت ڈالنے والے گھوڑے آیت ۴ فاثرن به نقعا انہوں نے غبار اٹھایا یعنی حملہ کردیا۔ آیت ۵ فوسطن به جمعا اور دشمن کی جماعت مرکز پر پہنچ گئی لشکر امیر ہمیشہ وسط میں چلتا ہے تو یہ وسط پر غالب آگئے۔ ان گھوڑوں نے اپنے مالکوں کے لیے کس قدر بڑا کام کی اور ان کو کس قدر فائدہ پہنچایا؟ یہی کہ ان کی حکومت پیدا کردی

اور اس کے ساتھ انہوں نے خود بہت سی تکلیفیں برداشت کیں مگر گھوڑوں کو کیا حاصل ہوا؟ صرف یہی کہ ڈاکو ان کو دانہ گھاس اور پانی وقت پر دیتے ہیں اتنی بات پر ایک حیوان انسان کا اس قدر اطاعت گزار ہو جاتا ہے۔ آیت۶ **ان الانسان لربہ لکنود** اب جواب قسم ہے جس پر شہادت دی گئی ہے کہ در حقیقت انسان اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے۔ اب مقابلہ کر کے دیکھو کہ انسان اللہ تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں کھاتا ہے۔ اور کیا وہ گھوڑے کے برابر کام کرتا ہے؟ اس کا جواب انسان کی زبان سے نکلے گا کہ نہیں کرتا۔ اور یہی کنود کا ترجمہ ہے۔

* آیت۷ **و انہ علی ذالک لشھید** اور ہر انسان اپنے متعلق خود گواہ ہے کہ وہ نہیں کر سکتا۔ اس شہادت سے مضمون کتنا زوردار ہو گیا اگر دلائل سے انسان کو قائل کیا جاتا تو یہ ناممکن تھا کہ انسان مانتا۔ آیت۸ **و انہ لحب الخیر لشدید** اور انسان فقط یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر نہیں کرتا اور حق ادا نہیں کرتا اس میں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ اس میں کسی قسم کی کمزوری ہے بلکہ یہ روپیہ پیسہ کے لیے گھوڑے سے بھی زیادہ مشقت کرنے والا ہے (شدید لفظ کے معنی دوڑنا بھی آتے ہیں، اس کی طرف اشارہ ہے) مگر انسان کبھی یہ نہیں کہتا کہ مال کی محبت کے لیے کام کر رہا ہوں۔ بلکہ یہی کہے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے یہ کام کر رہا ہوں۔ اگر انسانی فطرت کو درست کرنے کے لیے کام کیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کام کے کرنے میں تو انسان بہت سست ہے مگر اپنی شخصی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے (یعنی مال جمع کرنے کے لیے) بہت تیز ہے اور گھوڑوں سے بھی زیادہ تیز دوڑتا ہے۔ لوگوں سے کہتا ہے کہ میں مسکین محتاجوں کے لیے جمع کرتا ہوں۔ اس طرح اپنے عیب کو چھپاتا پھرتا ہے۔ غرض اس کی یہ عادت بن گئی ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو چھپاتا ہے، وہ دنیا کو دکھاتا ہے کہ میں دین کی خاطر اپنے وطن اور قوم کے لیے کام کر رہا ہوں حالانکہ حالت یہ ہے کہ وہ صرف دولت کے لیے کام کر رہا ہے۔ تو اس کی کمزوری کا اظہار ضرور ہونا چاہیے۔ آیت۹ **افلا یعلم اذا بعثر ما فی القبور** انسان کی اس کمزوری کا نتیجہ یہ ہے کہ اسے قیامت میں لا کر کھڑا کر دیا جائے گا کہ اس

نے جس قدر اپنے عیب چھپائے تھے انہیں ننگا کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں جو قیامت کا ذکر آتا ہے اس کی یہی حکمت ہے۔ آیت ۱۰ **حصل ما فی الصدور** اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان چونکہ اقرار نہیں کرتا کہ وہ مال کی محبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس واسطے کہا کہ انسان کے سینے میں جس قدر مخفی ارادے تھے وہ سب ظاہر کر دیے جائیں گے تو اس وقت کیا یہ بات چھپی رہے گی؟ ہرگز نہیں!۔ آیت ۱۱ **ان ربھم بھم یومئذ لخبیر** جس طرح اس دن تمام دنیا جان لے گی (اس دن سے مراد قیامت ہے) اسی طرح ان کا رب آج بھی ان کو جان رہا ہے۔ عام تفسیروں میں یومئذ سے قیامت کا دن مراد لیا ہے اور یہ تفسیر غلط ہے۔ اس دن (قیامت) کو تو تمام لوگ اس کے عیب جان لیں گے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی خصوصیت بیان کرنے سے کیا فائدہ؟ اس دن سے وہ دن مراد ہے جس دن (اس دنیا میں) انسان اپنی کمزوری چھپاتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جس طرح تمام لوگ اس کی کمزوریوں کو جان لیں گے اسی طرح اللہ تعالیٰ آج بھی ان کی کمزوریوں سے آگاہ ہے۔

سُورَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۂ قارعہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْقَارِعَةُ ﴿١﴾ مَا الْقَارِعَةُ ﴿٢﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ﴿٣﴾

وہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ﴿٤﴾ وَتَكُوْنُ

جس دن ہوویں لوگ جیسے پتنگے بکھرے ہوئے اور ہوویں

الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿٥﴾ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٦﴾

پہاڑ جیسے رنگی ہوئی اون دھنی ہوئی سو جس کی بھاری ہوئیں تولیں

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٧﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٨﴾

تو وہ رہے گا من مانتے گزران میں اور جس کی ہلکی ہوئیں تولیں

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿٩﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ﴿١٠﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿١١﴾

تو اس کا ٹھکانا گڑھا ہے اور تو کیا سمجھا وہ کیا ہے آگ ہے دہکتی ہوئی

سورۃ القارعہ مکیہ

* سورۃ العادیات میں انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک اصول نہیں رکھتا وہ جب مجبور ہوتا ہے تو بعض چیزوں کا صحیح اعتراف کرلیتا ہے اور جہاں چھپانے کی جگہ مل گئی وہاں سچ کا اعتراف نہیں کرتا۔ اس سورت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جو آدمی اپنی زندگی کو صحیح اصول پر مسلسل چلائے گا فقط وہی کامیاب ہوسکتا ہے۔ یہاں قیامت کا ایک نیا پہلو ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بہت ہنگامہ خیز واقعہ ہے اور بعض انسان ایسے ہیں کہ اس ہنگامہ خیزی سے ان کے اصول پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بس یہی آدمی ہیں جو کامیاب ہوں گے۔ آیت۱ **القارعہ** ہنگامہ خیز واقعہ۔ آیت۲ تا۴ قاہرہ قوتوں کا اس نظام پر اتنا اثر پڑے گا کہ انسان ایک پتنگے کی مانند چھوٹی سی چیز دکھائی دے گا اس نظام کے مقابلہ میں۔ آیت۵ **و تکون الجبال الایہ** پہاڑ روئی کے گالے دکھائی دیں گے۔ جیسے بخارات اڑ کر برف کے گالے پڑتے ہیں پہاڑ بھی بخارات بننے کے بعد روئی کے گالے بن جائیں گے۔ گویا بڑا انقلاب پیدا کرنے والی قاہرہ حقیقتیں وہاں ظاہر ہوں گی۔ آیت۶ و۷ **فاما من ثقلت موازینہ. الایات** جس کے اعمال زیادہ اچھے ہوں گے وہی آرام کی زندگی بسر کرے گا۔ یعنی جو اپنے اصول کو نہیں بدلے گا اور اپنے سچے اصولوں پر اٹل رہے گا وہی آرام سے رہے گا۔ دنیا ادھر کی ادھر ہوجائے مگر اچھے اعمال والے اپنی بات سے اور اپنے اصول سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ یہ وہ اصول ہیں جو فطرت کے موافق ہیں اور حظیرۃ القدس کے ارادوں سے ان میں زیادہ وزن آگیا ہے۔ آیت۸ تا۱۰ **و اما من خفت موازینہ. الایات** جس آدمی کے کام بےاصول ہیں وہ آگ میں گر پڑے گا۔ حظیرۃ القدس میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ صحیح اصول کی پابندی آخرت میں جنت کی زندگی میں تبدیل ہوجاتی ہے اور جس انسان کی بےاصول زندگی ہے وہ جہنم کی زندگی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

سُورَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ اٰيَاتٍ

سورۂ تکاثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام کے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ① حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ② كَلَّا

غفلت میں رکھا تم کو بہتایت کی حرص نے یہاں تک کہ جا دیکھیں قبریں ف کوئی نہیں

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ③ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ④

آگے جان لو گے پھر بھی کوئی نہیں آگے جان لو گے ف

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ⑤ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ⑥

کوئی نہیں اگر جانو تم یقین کر کے ف بیشک تم کو دیکھنا ہے دوزخ

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ⑦ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ

پھر دیکھنا ہے اس کو یقین کی آنکھ سے ف پھر پوچھیں گے تم سے اس دن

عَنِ النَّعِيْمِ ⑧

آرام کی حقیقت ف

سورۃ التکاثر مکیہ

* آیت ۱و۲ الھکم التکاثر. حتیٰ زرتم المقابر زیادہ طلبی نے تمہیں اصل مقصد سے غافل کردیا۔ انسان کو یہ شوق ہے کہ وہ زیادہ کام کرے تو اس شوق میں زندگی بسر کرکے وہ قبر تک پہنچ جاتا ہے یعنی مرجاتا ہے۔ اس جگہ سمجھایا گیا ہے کہ کام زیادہ مطلوب نہیں ہے مگر جو ہو وہ ٹھیک طور پر ہو اور علمی طور پر ہو۔ آیت ۳ و ۴ کلا سوف تعلمون ثم کلا۔ الایات تم جلدی جان لوگے کہ زیادہ کام کرنا بے کار ہے یعنی حرص و ہوس کے لیے کثرت کار مطلوب نہیں ہے۔ آیت ۵و۶ کلا لو تعلمون علم الیقین. لترون الجحیم ایسا کام کرو کہ اس سے تمہاری علمی قوت میں جلا پیدا ہو۔ جلا پیدا ہونے کے بعد یہ نتیجہ نکلے گا کہ انسان اسی دنیا میں جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ماہر ڈاکٹر بیماری کو ابتدا میں دیکھ کر اس کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسے ہی کام کی خوبی سوچنے والے انسان کی نظر کام کے انجام تک فوراً پہنچ جائے گی کہ اس کام کا نتیجہ جہنم ہے۔ اگر اس طرح سوچ سمجھ کر کام کیا جائے تو انسانیت کے لیے بہت مفید ہے۔ کثرت کار مطلوب نہیں ہے۔ آیت ۷ ثم لترونھا عین الیقین تمہاری علمی قوت کی یہ جلا ہے کہ تم جہنم کو اس دنیا میں دیکھ لوگے اور آگے چل کر آخرت اپنے یقین کی آنکھ سے دیکھ لوگے۔ آیت ۸ ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم اس طریقہ کا علم تمہیں قرآن مجید سکھاتا ہے اور رسول کریم ﷺ تمہیں بتاتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ ان کی بڑی قدر کرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی دو بہت بڑی نعمتیں ہیں ایک تو قرآن مجید اور دوسرے رسول کریم ﷺ۔ ان دونوں کی بڑی قدر کرو۔ یہ تفسیر امام جعفر صادق نے کی ہے اور یہ تفسیر خاص لوگوں کی سمجھ کے موافق ہے۔ عام لوگوں کے لیے کھانا پینا اور دوسری دنیوی نعمتیں اس آیت کی تفسیر میں بیان کی جاسکتی ہیں۔ قرآن مجید کی تعلیم سے قیامت کا ربط اس سورت کا خلاصہ ہے۔

سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُ اٰيٰتٍ

سورۂ عصر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِيْنَ

قسم ہے عصر کی بے شک مقرر انسان ٹوٹے میں ہے البتہ مگر جو لوگ کہ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۥ وَتَوَاصَوْا

یقین لائے اور کیے بھلے کام اور آپس میں تاکید کرتے رہے سچے دین کی اور آپس میں

بِالصَّبْرِ ۝٣

تاکید کرتے رہے تحمل کی

سورۃ العصر مکیہ

سورۃ البینہ میں مرکزی جماعت کے متعلق اساسی خاکہ بیان کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد سورت زلزال میں اخلاق کی تہ کی خوبی پر توجہ دلائی گئی تھی۔ اچھی جماعت کبھی قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے اخلاق کے اندر جو بنیادیں ہیں وہ اعلیٰ درجہ کی نہ ہوں۔ سورۃ العادیات میں اخلاق کی صورت اور اعمال کی خوبی کی طرف اشارہ تھا اس کے بعد سورۃ القارعہ میں اعمال کو اخلاق سے مزین کرنے کی طرف اشارہ تھا۔ سورت البینہ کے بعد چار سورتیں آئیں ان میں اس مرکزی جماعت کے اساسی کاموں کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے مختلف پہلو انسان کی ترقی کے لیے کیوں ضروری ہیں۔ ان سب کی تشریح یہاں ہوجاتی ہے۔ سورۃ والعصر میں مرکزی جماعت کو تبدل زمانہ سے اپنے پروگرام پر نظرثانی کرنے کی جو ضرورت ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح زمانہ آہستہ آہستہ بدلتا ہے اس کے مطابق مرکزی جماعت کو اپنی حالت درست کرلینی چاہیے۔ مگر جو اصلی بنیادی نظام ہے اس میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ آیت ۱ و ۲ و العصر. ان الانسان لفی خسر والعصر کا ترجمہ ہے ہر زمانہ کا تبدل یعنی بدلنے والا زمانہ جو آہستہ آہستہ بدلتا جاتا ہے۔ اور اپنے اثرات اور نچوڑ چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یعنی تاریخ گواہ ہے کہ انسان اجتماعی طور پر ہمیشہ نقصان میں رہا ہے۔ صرف وہی جماعت کامیاب رہی جس کا ذکر آیت ۳ میں ہے۔ آیت ۳ الا الذین آمنوا جس نے اپنی ترقی کے لیے صحیح نظریات قائم کرلیے یعنی اساسی نظریات صحیح اور تجربہ شدہ ہوں۔ و عملوا الصالحات اور زمانہ کے مطابق اپنے نظریات کو عملی شکل پہنانے لگے۔ و تواصوا بالحق اور جماعت بنائی جو اساسی نظریات پر مشترک ہے اور سب ایک دوسرے کو اس پر پختہ رہنے کی وصیت کرتے ہیں۔ وہ ایسی جماعت ہے جو سمجھتی ہے کہ میں تو پورا کام کرلوں لیکن جب تک میرا ساتھی پورا کام نہیں کرے گا میرا کام نکما اور ادھورا رہ جائے گا۔ اس لیے وہ انتہائی کوشش سے اپنے ساتھیوں کو توجہ دلاتا ہے کہ

اپنا فرض پورا کرو۔ یہ بات چونکہ ہر فرد میں پائی جاتی ہے اس واسطے جماعت کا ہر ایک فرد مساوات کی روح کا مجسمہ ہے۔ ایسے لوگوں کا نظام ہمیشہ قائم کرنے کے لیے چیرمین (Chairman) ہوتا ہے۔ پریذیڈنٹ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ چیرمین اساسی نظریات کی صحت پر یکساں یقین رکھتا ہے۔

* جب جماعت میں مختلف طبقات پیدا ہوجائیں یعنی کچھ تو اعلی درجہ کے لوگ ہوں اور کچھ دوسرے درجہ کے تو ایسی حالت میں نظام قائم نہیں رہ سکتا جب تک کہ اعلی جماعت میں سے ایک آدمی کو پریذیڈنٹ نہ بنادیا جائے۔ و تواصوا بالصبر او وہ سب لوگ ایک دوسرے کے لیے انتہائی توجہ سے کوشش کرتے ہیں۔ ب ستہ میں جس قدر مشکلات پیش آرہی ہیں ان کو ہمت سے برداشت کرنا چاہیے۔ یعنی و مشکل کی وجہ سے ان کی پیش قدمی نہیں رکتی۔ ہر ... ن تاریخ گواہ ہے کہ اس قسم کی منظم جماعتوں کے سوا کبھی کوئی آدمی انفرادی طور پر کامیاب نہیں ہوا اور یہ مسئلہ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اس پر انسان آسانی سے یقین کرسکتا ہے کیوں کہ تاریخ اپنے واقعات محفوظ رکھتی ہے اور ان کو دہراتی رہتی ہے۔

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعُ اٰيٰتٍ

سورۂ ہمزہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی نو آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝۱ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝۲

خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کی ۔ جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝۳ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝۴

خیال رکھتا ہے کہ اس کا مال سدا کو رہے گا اس کے ساتھ کوئی نہیں وہ پھینکا جائیگا اس روندنے والی میں

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝۵ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝۶ الَّتِيْ تَطَّلِعُ

اور تو کیا سمجھا کون ہے وہ روندنے والی ایک آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی وہ جھانک لیتی ہے

عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝۷ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝۸ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝۹

دلوں کو ۔ ان کو اس میں موند دیا ہے ۔ لمبے لمبے ستونوں میں

سورۃ الھمزۃ مکیہ

جماعتوں کی ایک خرابی ہے سرمایہ داری۔ جہاں ایسا گروپ پیدا ہوجائے جو سرمایہ ہی کو سب کچھ سمجھے تو جماعت برباد ہوجاتی ہے۔ اس سورت میں فقط سرمایہ داری کے عیوب دکھلائے گئے ہیں کہ اس سے انسان کے اخلاق کس طرح برباد ہوجاتے ہیں اور دنیا اور آخرت میں ایسے شخص سے زیادہ تباہ حال کوئی انسان نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مصلح ان کے پاس جاتا ہے تو اس کے وہ عیب نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم کس طرح لوگوں کی اصلاح کرسکتے ہو تم نادار ہو۔ تم میں تو یہ عیب ہے اور پس پشت بھی ایسے لوگوں کی عیب جوئی کرتا ہے۔ وہ محض اپنے سرمایہ کی حفاظت کے لیے نکتہ چینی کرتا ہے۔ آیت ۱ ویل لکل ھمزۃ لمزۃ وہ آدمی جس نے اپنی فطرت ہی یہ بنالی ہے کہ وہ ہر آدمی پر طعن اور نکتہ چینی کرتا ہے اس کے سامنے اگر کوئی بہترین آدمی بھی آتا ہے تو اس میں بھی وہ نقص نکالتا ہے اس پر افسوس ہے اور یہ اخلاقی موت ہے۔ غرض یہ شخص ہر چیز میں برائی ہی برائی دیکھتا ہے اس کے بعد اس کی زندگی حیوانوں کی طرح ہوجاتی ہے۔ انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی خوبی کے متعلق اپنا نظریہ ٹھیک بنائے اور اس کے بعد جس قدر خوبی ممکن ہوسکے اپنے اندر پیدا کر دکھائے۔ مگر اس آدمی کی تو یہ حالت ہے کہ اس کے دماغ میں کسی خوبی کا نظریہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ وہ ہر چیز میں برائی دیکھتا ہے۔ اب اس کا سبب بتایا جاتا ہے کہ اس میں یہ خرابی کیوں پیدا ہوئی وہ سبب یہ ہے کہ: آیت ۲ الذی جمع مالاً و عددہ وہ مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے گن گن کر رکھتا ہے اس کی وجہ سے اس کی اخلاقی خوبی کم ہوگئی ہے۔ آیت ۳ یحسب ان مالہ اخلدہ پیسہ گن گن کر رکھنے کے بعد اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ رہے گا۔ یعنی اس کی ہر ایک ضرورت مال ہی سے پوری ہوتی رہے گی۔ یہ طبعی بات ہے کہ بعض کام تو واقعی مال ہی سے پورے ہوتے ہیں۔ مگر انسان کی بعض ضرورتیں ایسی بھی ہیں جن کے لیے علم و اخلاق چاہیے

ورنہ اس آدمی پر لوگ اعتبار نہیں کرتے۔ اور یہ بات کہ ہر ضرورت مال سے ہی پوری ہوتی ہے اخلاقی حصہ کی لغویت کو ظاہر کر دیتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس شخص کے پاس اصول ہی نہ رہے تو اب اس کا کام یہی ہے کہ لوگوں پر طعن و تشنیع کرتا پھرے۔

* یہ سرمایہ داروں کی عادت ہے کہ جب اپنی مجلس میں بیٹھتے ہیں تو ایک مصلح، ریفارمر اور لیڈر کی تشنیع شروع کر دیتے ہیں کہ یہ اصلاح کرتا پھرتا ہے روپیہ پیسہ تو اس کے پاس نہیں ہے۔ مال کے سوا کیسے تدبیریں چلتی ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ اس نے اپنے پیٹ کے لیے ایک جال بنا رکھا ہے تیسرا سرمایہ دار کہتا ہے کہ اس میں فلاں فلاں عیب موجود ہیں اور یہ اپنی اصلاح تو کرتا نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کی شکل بھی بری ہے اگر اس میں کوئی جوہر ہوتا تو اس کی شکل منحوس نہ ہوتی اور یہ کہ اس کے خویش و اقارب میں بھی بری عادتیں ہیں۔ اسی طرح سے عیب گنتے رہیں گے اور آخر میں کہیں گے کہ یہ ٹھیک ہے کہ بس پیسہ کماؤ اور کھاؤ۔ تو ان کے ہاں یہ خیال ہے کہ جائز اور ناجائز طریقہ سے مساکین کو لوٹو اور کھاؤ۔ ان کی مثال یوں ہے کہ گویا بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہے۔ ان سرمایہ داروں میں نہ رحم ہے، نہ اخلاق۔ گویا اس طعن و تشنیع کا سبب صرف سرمایہ داری ہے۔ اس قسم کے آدمی کی سوسائٹی میں جو بری حالت ہوتی ہے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخرت میں اس کو جو تکلیف پیش آئے گی اس کی توضیح سورۃ کے آخر میں کر دی جائے گی۔ آیت ۴ تا ۶

كلا لينبذن في الحطمة و ما ادراك ما الحطمة نار الله الموقدة وہ آگ میں ڈالا جائے گا جو اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی۔

* آیت ۷ **التي تطلع على الافئدة** اب بتلایا جاتا ہے کہ وہ آگ کیا ہے؟ وہ آگ ایسی ہے جو دلوں سے طلوع کرتی ہے۔ تمام متمدن قوموں میں عموماً دل کو مرکز اخلاق سمجھا جاتا ہے تو جب دل یعنی مرکز اخلاق میں خرابی پیدا ہو گئی تو اس کے باعث دل میں آگ پیدا ہو گئی۔ انسانی بدن کے اگر کسی حصہ کو تکلیف پہنچے تو تمام بدن میں آگ (جلن) سی محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ ایک چھوٹا سا مظاہرہ ہے۔ مگر جب مرکز اخلاق

یعنی دل میں خرابی پیدا ہو جائے تو اس سے جو بے چینی پیدا ہو گی اس کا یہاں (اس دنیا میں) صحیح تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کسی پر عاشق ہو جائے اور اس عشق میں اس کی محبت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اسے معشوق نہیں ملتا تو اسے آگ کی سوزش جیسی تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے۔ بس اس قسم کی محبت سرمایہ دار نے روپیہ پیسہ (مال) سے پیدا کر لی ہے۔ اور جب اس آدمی کو آگ میں ڈالا جائے گا تو اگر اس کے اخلاق اچھے ہیں تو وہ آگ اسے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ بہر حال قرآن مجید میں دوزخ کی یہ توضیح ہو جاتی ہے کہ انسان کی بداخلاقیوں سے وہ آگ پیدا ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ انسان کو جو بخار آتا ہے وہ دوزخ کا نمونہ ہے گویا بخار اندر سے طبعیت کی خرابی سے پیدا ہوتا ہے اور باہر سے نہیں آتا۔ آیت ۸و۹ انها عليهم مؤصدة في عمد ممدة وہاں ایک آگ باہر سے بھی آتی ہے اب اس کا ذکر ہے۔ گرم ممالک میں دوپہر کے وقت سخت گرمی ہوتی ہے اور یہ قدرتی چیز ہے۔ اب اگر ایک بخار والے آدمی کو ایسی زمین سے گزرنا پڑے جہاں شدت سے دوپہر کی گرمی ہے تو اس آدمی کو خواہ مخواہ تکلیف زیادہ ہو جائے گی۔ مگر یہ جو اسے تکلیف ہو رہی ہے اس کا سبب اس کی اندرونی خرابی ہے۔ اگر یہ تندرست ہوتا تو اس کو گرمی کی وجہ سے معمولی سی تکلیف ہوتی اور یہ گزر جاتی مگر چونکہ اس کے اندر خرابی ہے اس واسطے وہ سخت تکلیف اٹھا رہا ہے۔ اسی طرح جہنم ہے۔ وہاں اگر کوئی با اخلاق آدمی گذر جائے تو اسے جہنم کی آگ محسوس بھی نہ ہو گی۔ اگر ایسا آدمی وہاں سے گذرے جس کے اندر اخلاقی خرابی ہو تو اس کے لیے اس کی طبعیت میں بہت تکلیف کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس سورت میں جماعت میں سرمایہ داری کو روکنے کے لیے اخلاقی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ اور اخلاق کا اچھا رکھنا انسان کا فطری تقاضا ہے۔

سُوْرَةُ الْفِيْلِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُ اٰيٰتٍ

سورۂ فیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝١

کیا تونے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ ۱

أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝٢ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ

کیا نہیں کر دیا ان کا داؤ غلط ۲ اور بھیجے ان پر

طَيْرًا أَبَابِيْلَ ۝٣ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝٤

اڑتے جانور ٹکڑیاں ٹکڑیاں ۳ پھینکتے تھے ان پر پتھریاں کھنگر کی ۴

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ ۝٥

پھر کر ڈالا ان کو جیسے بھس کھایا ہوا ۵

سورۃ الفیل مکیہ

* عربوں میں قریش دراصل ایک حکمران جماعت تھی۔ عرب سرداران کے فیصلے کو شہنشاہ کا فیصلہ تسلیم کرتے تھے۔ لیکن قریش عرب کے اندرونی جھگڑے سے تنگ آ کر ایک جماعت چاہتی تھی کہ عرب کو شام سے ملحق کر دیا جائے اور اپنی تجارت محفوظ کر دی جائے تاکہ ان سے روما کی حکومت محصول نہ لے سکے۔ دوسری جماعت چاہتی تھی کہ عرب کو ایران سے ملحق کر دیا جائے لیکن ایک تیسری جماعت اپنی خود مختاری قائم رکھنا چاہتی تھی۔ انہیں میں ابوبکر صدیقؓ عشرہ مبشرہ اور عتبہ وغیرہ تھے۔ جب قرآن شریف نازل ہونے لگا اور ان کو اتحاد کی دعوت دینے لگا تو آزادی پسند کہنے لگے کہ مبادا یہ کسی دوسری سلطنت کا حامی اور وکیل ہے اور ملک کو دوسرے کے سپرد کر دینے والا ہے۔ یلحدون الیہ اعجمی و ھذہ عربی مبین اور اس قسم کی دوسری آیات کا یہی محمل ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے کچھ عربوں نے ایرانی حکومت سے ساز باز شروع کی تھی اور بہت سے عرب قبائلی ان سے مل گئے تھے۔ مگر حجاز اپنی حالت پر مستقیم رہا اس لیے روما کی حکومت کو خوف ہوا کہ مبادا قریش ایران سے ساز باز رکھیں۔ اس لیے ان کے استیصال کی تجویزیں کر رہے تھے کہ ابرہا کا حادثہ پیش آیا مگر معاملہ برعکس ہوا۔ اس سے قریش کی تجارت کو بڑا فروغ ہوا۔ شام اور عراق کے سرداران کی بڑی عزت کرنے لگے۔ آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت سے پچاس روز قبل واقعہ فیل ہوا

پس از گذشتن پنجاہ روز عام الفیل (۱)

جماعت میں پہلی خرابی سرمایہ داری کی تھی (سورۃ الہمزہ) اور دوسری خرابی یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر اعتماد کر کے ضعیفوں کو دبائے۔ اس سے امپیریلزم پیدا ہوتی ہے اس سورت میں امپیریلزم کی تباہی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

---

(۱) قصیدۂ عظمی مصنفہ امین الدین شاگرد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

* واقعہ یوں ہے کہ حجاز کے کسی آدمی نے شاہی گرجا (یمن) میں نجاست پھینک دی اس کا صحیح علاج یہ تھا کہ وہ آدمی (ملزم) اہل حجاز سے طلب کر لیا جاتا اور اس کے واسطے جتنی سزا ہوتی وہ دی جاتی۔ اور اگر اس کے ساتھ اس سازش میں کوئی جماعت شریک تھی تو اس کو بھی پوری سزا دی جاتی۔ اہل حجاز اگر ایسے آدمی یا جماعت کو جرم کے باوجود حکومت یمن کے حوالے نہ کرتے تو تمام حجاز پر چڑھائی ہو سکتی تھی۔ مگر یمن کی حکومت نے انصاف اور تحقیق کا کوئی درجہ ملحوظ نہیں رکھا۔ اس نے اپنی طاقت کے گھمنڈ پر حجاز کے معبد (بیت اللہ) کو گرانے کے لیے چڑھائی کر دی۔ وہ بہت ساز و سامان وغیرہ اپنے ساتھ لائے جس میں ہاتھی بھی تھے۔ ہاتھی عرب میں نہیں ہوتے اس لیے عربوں کو ڈرانے کے لیے ہاتھی لائے تھے۔

* یہ واقعہ اس سال کا ہے جس سال رسول کریم ﷺ پیدا ہوئے تو یہ ایک قومی تاریخی واقعہ نزدیک کا ہے۔ اس کی وہی مثال ہے جیسے کہ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ جس کو ہندوستانیوں کے بزرگ جانتے ہیں۔ میرے استاد دہلی کے جان گداز واقعہ کے کئی برس بعد پیدا ہوئے مگر ان کا علم ایسا تھا کہ گویا وہ یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اس لیے کہ اس واقعہ سے تمام قوم پر مصیبت چھا گئی تھی۔ اس طرح عرب کا یہ واقعہ نزدیک کا تھا۔ اب جو لوگ اس واقعہ سے انکار کریں ان کی عقل پر ہنسی آتی ہے۔

* آیت ۱ **الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل** ایک زور آور طاقت جو عربیوں کو کچلنے کے لیے آئی تھی، اسے کس طرح کچل دیا گیا؟ آیت ۲ **الم یجعل کیدھم (۱) فی تضلیل** کیا ان کی تدبیروں کو ہم نے غلط راستہ پر

---

(۱) رعا کی حکومت جو یورپ کی حکومت تھی چاہتی تھی کہ حجاز پر ہماری سلطنت ہو جائے تو ہندوستان کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ ہندوستان دراصل ایرانی سلطنت کا ایک صوبہ تھا اور وہ نہ چاہتا تھا کہ یورپ کو راستہ دیا جائے۔ یورپ نے مذہبی تبلیغ سے حبشہ کو تابع کر لیا اور عرب قبائل میں بھی زور شور سے تبلیغ شروع کر دی تاکہ اس طریقہ سے حجاز سے مل جائے۔ یورپ کے اشارہ پر حبشہ نے کچھ حصہ یمن کا لے لیا اور کچھ حصہ ایرانیوں کے ہاتھ چلا گیا۔ اس صورت میں فتح اس کی ہو سکتی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نہیں ڈالا؟ اگر یہ حقیقی مجرموں کو سزا دینے کی کوشش کرتے تو کامیاب ہوجاتے بلکہ خود حجاز کے بااختیار لوگ مجرموں کو ریگستانوں اور گوشوں سے تلاش کر کے نکال لیتے مگر اہل یمن کو تو انصاف اور حق کا خیال تک نہ تھا۔ ایک مقدس بابرکت عمارت جس کے ساتھ تاریخی عظمت کی سیکڑوں روایات وابستہ تھیں۔ اس کو گرانا اور اس کی بے عزتی اور توہین کرنا ان کے پیش نظر تھا اور بس۔ یہ ہے ان کی تدبیر کو غلط راستے پر ڈالنا۔ یعنی وہ مقدس چیز سے ٹکرانے لگے اور سیدھا راستہ جو مجرموں کو سزا دینے کا تھا وہ بھول گئے۔ اب مقدس گھر کے مالک سے ان کی ٹکر ہو گئی۔ اگر وہ انصاف کی طرف توجہ کرتے اور ان آدمیوں کو طلب کرتے جنہوں نے جرم کیا تھا تو تمام مجرم اہل یمن کو دیے جاتے مگر انہوں نے غلط راستہ اختیار کیا۔ اور خفیہ تدبیر (کید) یہ تھی کہ قریش لڑیں گے تو ان کا استیصال کیا جائے گا۔ اس طرح عرب میں حکومت روما قائم ہوجائے گی۔

* آیت ۳ و ارسل علیهم طیراً ابابیل اتفاق ایسا ہے کہ ہندوستان میں ابابیل ایک چھوٹے سے پرندے کو کہتے ہیں۔ اور عربی میں ابابیل پرندوں کے جھنڈ کو کہتے ہیں۔ وہ پرندے تھے جھنڈ کے جھنڈ جو اس موقع پر آگئے تھے۔ آیت ۴ ترمیهم بحجارة من سجیل انہوں نے چھوٹے چھوٹے روڑے (پتھر) اہل یمن کو

(بقیہ حاشیہ)

تھی جس کی طرف حجاز ہوجائے۔ حجاز میں ایک طبقہ تھا جو رومی سلطنت کو پسند کرتا تھا مگر ان کو خوف تھا کہ ہماری تجارت پر محصول لگایا جائے گا اور آزاد منش قریش اپنی حکومت کے دلدادہ تھے۔ جب کوئی ان پر حملہ کرتا تو کہتے تھے کہ میراث خلیل یعنی کعبہ پر دھاوا پڑ رہا ہے۔ پھر تو سارا عرب جمع ہوجاتا تھا۔ اس لیے زبردستی گھسنا حجاز میں تقریباً محال تھا۔ اس کے لیے یورپ والے کوئی تدبیر سوچ رہے تھے کہ گرجا میں گندگی کا واقعہ ہوا تو یورپ کی امداد سے حبشہ نے حجاز پر چڑھائی کی۔ مطلب یہ تھا کہ قریش اپنے بیت اللہ کو گرانے نہ دیں گے اور لڑیں گے تو مارے جائیں گے یعنی بیت اللہ کا گرانا مقصود بالذات نہ تھا بلکہ قریش کی بیخ کنی مقصود تھی۔ یہ تھی خفیہ تدبیر جس کو کید کہا گیا ہے۔ اللہ کی تدبیر یوں ہوئی ہے کہ بیت اللہ کی عزت بھی برقرار رہی اور قریش کی عظمت بھی قائم۔ ثقیف قبیلہ کو حبش نے رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا اس لیے اب فقط قریش رہ گئے تھے تو اللہ تعالی نے امداد دی۔

مارے۔ ان پرندوں نے اہل مکہ کی رہنمائی کی کہ اہل یمن کے ساتھ اس طرح لڑو یعنی اس طرح پتھر مارو۔ اہل مکہ نے جس قدر ممکن ہو سکا پہاڑوں پر چڑھ کر پتھر پھینکے۔ اہل یمن کے لیے دہری مصیبت تھی کہ ایک تو پرندے روڑے مار رہے تھے، دوم اہل مکہ بھاری بھاری پتھر مار رہے تھے۔ آیت ۵ فجعلھم کعصف ماکول وہ پتھروں کی مار سے ایسے ہو گئے کہ سیدھے طور پر اٹھ بھی نہیں سکتے تھے یعنی روندے گئے۔ پرندوں کے پتھر پھینکنے سے وہ مدہوش ہو گئے۔ ادھر جماعت قریش نے ان کو پتھر مارے تو ایسے ہو گئے جیسے تباہ شدہ گھاس، ہزیمت یافتہ لشکر کو اہل عرب ایسی ہی مثال سے یاد کرتے ہیں کہ گویا کوئی جانور گھاس کھا کر ادھر ادھر پھونک دے۔ اسی طرح یہ لشکر ہوا۔ کوئی کہیں مرا کوئی کہیں۔

* فطرت الہی میں ایسے بے نظیر واقعات بہت ملتے ہیں کہ جب ایک کمزور پر ظلم ہوتا ہو تو ایک حیوان اس کی مدد کو پہنچ جاتا ہے۔ ہم اس نظام کا تعین نہیں کر سکتے کہ وہ حیوان کس طرح مدد کے لیے آپہنچتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تمام قوموں میں ایسے بے انتہا واقعات ملتے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک عفت دار عورت جنگل میں تن تنہا جا رہی ہے اور کوئی آدمی اس کی عصمت دری کرنا چاہتا ہے تو سانپ اس کے پاؤں میں آکر لپٹتا ہے اور اس کا کام تمام کر دیتا ہے۔ کوئی طبعیات کا عالم ان واقعات کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور الہیات میں تو یہ مسلم بات ہے کہ ملاء سافل مدد کے لیے نمونہ بن کر آتے ہیں۔ بعض اوقات ملاء اعلی سے برقی رو کی طرح مدد آجاتی ہے۔ ہم طبعیات کے علماء کو اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ واقعہ یوں ہوا۔ اب توجیہ تم کرو۔ مثلاً ایک سانپ بچے کو کاٹنے کے لیے آتا ہے اس پر کتا حملہ کر کے اس کو کاٹ کھاتا ہے۔ اب اس جگہ اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ اسے طبعیات کے ذریعے حل کیا جائے کہ یہ کیسے ہوا۔ اور نہ اس جگہ کوئی عجوبہ چیز بتلانی مقصود ہے بلکہ دکھانا یہ ہے کہ ظلم کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جا سکتا اور مظلوم کے بچانے کے لیے قدرت کوئی نہ کوئی انتظام کر دیتی ہے۔ الہیات میں تو اس کی حکمت ملتی ہے کہ فرشتے جو کام کر رہے ہیں وہ اس کی تدبیر الہام کے ذریعے انسان کے دل میں ڈال دیتے ہیں اور اس

کے بعد انسان خود تدبیر کرلیتا ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔

ہمارے مفسرین نے قسم کھا رکھی ہے کہ جہاں کہیں قدرت الٰہی کا کوئی کرشمہ نظر آئے وہ اسے طبعی قوتوں سے بالکل خالی کر کے محض روحانی اثرات کا نتیجہ بتلائیں گے اور یہ غلط فلسفہ ہے۔ روحانی قوتیں جب اس عالم جسمانی میں اپنا کام کرنا چاہتی ہیں تو جسمانی قوتوں کو کام میں لاتی ہیں۔ اس کی مثال خود انسان کا وجود ہے۔ مثلاً انسانی دماغ میں ایک خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ روحانی چیز ہے۔ انسانی بدن اس کی تکمیل کے لیے پوری توجہ سے کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی روحانی طاقت اس زمین میں اپنا اثر کرنا چاہتی ہے تو وہاں کے قرب و جوار میں جو طبعی قوت جلدی کام کرنے والی ہوگی روحانی قوت اس پر اپنا اثر ڈالنا چاہے گی۔ مکہ کے لوگ جو ضعیف اور مجبور تھے ان کی عقل میں بھی نہیں آتا تھا کہ اس قسم کے جابر بادشاہ سے کس طرح مقابلہ کریں گے۔ ان کے سردار نے حکم دیا کہ تم اس جابر بادشاہ سے مقابلہ نہ کرو بلکہ پہاڑوں پر چڑھ جاؤ۔ وہ اس سے زیادہ اپنا بچاؤ نہیں سوچ سکتے تھے۔ اب ان کی رہنمائی کے لیے چند پرندے ظاہر ہوئے۔ ہم نے جو فرض کرلیا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے پرندے تھے اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں ان کے منہ میں تھیں یہ غلط ہے۔ وہ بڑے بڑے پرندے (مثل گدھ) تھے اور انہوں نے دور سے پتھر پھینکنے شروع کیے۔ جب یہ پتھر اہل یمن پر پڑے اور برسات کی طرح ان پر برسنے لگے تو ان کی صفوں میں ابتری پیدا ہو گئی۔ اور وہ پریشان ہو گئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ عرب میں بیت اللہ کی تقدیس اس فطرت کے درجہ پر پہنچی ہوئی تھی، تو ان کو خوف ہونے لگا کہ یہ عذاب الٰہی ہے۔ اس خوف سے ان کے دلوں میں دہشت سما گئی۔ اہل یمن بھی اس بیت اللہ کو ابتدا سے مقدس جانتے تھے۔ یہ تحریک یعنی اس کی بے عزتی کی تحریک حبش کے نصرانیوں کی تھی اس تحریک میں تو یمن والے مجبوراً داخل ہوئے تھے لیکن پھر وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور یمن کے لوگ جب بھاگے تو تمام لشکر میں ادھم مچ گیا۔ اب حبش کے لوگوں میں بھی پریشانی پھیل گئی۔ کیوں کہ حبش کے لوگ نصرانیت سے پہلے بیت اللہ کا حج کرتے تھے۔

* اہل یمن کی فوج میں فیل تھے۔ انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ ہاتھیوں پر اوپر سے پتھر برس رہے تھے اور عرب کی گرمی نے ان کا دماغ پریشان کر دیا تھا۔ اہل مکہ نے جب پہاڑوں پر سے دیکھا کہ ان پتھروں سے دشمن کی فوج میں اب ابتری پھیل گئی ہے تو انہیں ہمت اور جرأت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے پہاڑوں سے پتھر پھینکنے شروع کر دیے اور اہل یمن کو بھس بنا کر رکھ دیا۔

* سر سید نے اس کی تاویل کی ہے کہ یہ چیچک(۱) کے جراثیم تھے۔ سر سید ایک حکیم عالم تھے اور وہ اس لطیفہ بازی سے اپنے نوجوانوں کو قرآن کی طرف متوجہ رکھنا چاہتے تھے ان کی غرض صرف اس قدر تھی اور بس۔ اب عربوں نے سر سید کی اسی بات کو عربی میں ترجمہ کر دیا اور یورپ میں پیش کر کے پھولے نہیں سمائے۔ سر سید کی علمی و عملی تحریک میں سمجھدار آدمی کے لیے چند نقص نمایاں معلوم ہوتے تھے۔ اس کے متعلق جب کبھی سر سید سے سوال کیا گیا تو انہوں نے اس کا جواب دینے سے گریز کیا۔ ان کا ایک مہمل سا لطیفہ ہے کہ جب تالاب بھر جائے گا تو پانی باہر نکلنے کے لیے اپنا راستہ خود تلاش کر لے گا۔ سر سید اپنے نوجوانوں کو یورپین سائنس سے تعارف کرانا چاہتے تھے۔ ان کو اعتماد تھا کہ جو غلطیاں رہ جائیں گی ان کو ہمارے نوجوان خود درست کر لیں گے۔ ہم اس بڑے آدمی (سر سید) کی نیک نیتی کا ثمرہ اپنے آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ سر سید نے موسیٰ علیہ السلام کے سمندر سے گزرنے کے واقعہ کی تفسیر جوار بھاٹا اور مدوجزر کے ذریعہ کر دی۔ یہ ایک مہمل سی تفسیر ہے۔ مگر کالج اور اسکول کے پڑھنے والے طلبہ کے لیے (جن کو دینیات کا زیادہ علم نہیں ہے) یہ ایک عجیب اور نادر تفسیر ہے۔ ایک عالم نے کالج کے انڈر گریجویٹ (عبدالقادر خان جو آج کل کراچی میں امیر الحجاج ہے) سے سر سید کی نسبت کہا کہ جو آدمی سر سید کی کتابیں پڑھتا ہے وہ مسلمان نہیں رہتا۔ اس نوجوان نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ مسلمان نہیں رہتا مگر وہ عیسائی بھی نہیں ہوتا۔

---

(۱) محمد علی قادیانی نے بھی قرآن شریف کے انگریزی ترجمے میں ابابیل کا یہی ترجمہ کیا ہے۔ مرتب۔

* سرسید کی تفسیر کو پڑھ کر کالج کے مولوی حمید الدین صاحب مرحوم نکلے جو علی گڑھ کے بی۔ اے ہیں۔ انہوں نے قرآن کی تفسیر عربی میں لکھی اور اس واقعہ کی تفسیر نیچرل قواعد کے ذریعہ کی ہے کہ دنیا عش عش کرنے لگی۔ موسی علیہ السلام کا سمندر سے گزرنا دنیا کی تین بڑی قومیں مانتی ہیں۔ یہود و نصاری اور مسلمانوں کے ہاں یہ واقعہ مسلم ہے۔ سائنس کے اعتراضات تمام دنیا کو پریشان کر رہے ہیں۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ سائنٹیفک طریقہ سے مولوی حمید الدین سے بڑھ کر نوجوانوں کو کوئی نہیں سمجھ سکا۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کی تاریخ بڑی شاندار ہے۔ انہیں ہر فن کے عالم اول درجہ کے ان کی اپنی قوم میں ملیں گے وہ محققانہ طور پر آگے بڑھ سکتے ہیں اور ہر مدد کے لیے اپنے گھر ہندوستان ہی سے ہر ایک چیز حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سورت کی یہی روح تھی کہ اگر کوئی امپیریلزم (شاہنشاہیت) کسی کمزور کو دبانے پر مستعد ہو جائے تو قدرت ایسے سامان پیدا کر دے گی جو اس طاقت کو برباد کر دیں گے اس واسطے مسلمانوں کو شہنشاہیت سے پاک رہنا چاہیے یعنی کمزوروں کو نہ دبائیں۔ اس سورت میں اشارہ قرآن مجید کی تعلیم کا مرکز بیت اللہ ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اب اگلی سورت میں اس کی تصریح کر دی جائے گی۔ عبدالمطلب کے نہ لڑنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ تاجر لوگ اگر جنگ کرتے تو یمن کی تجارت بند ہو جاتی۔ اگر مغلوب ہوتے تو نادان حبشی ان کی بیخ و بنیاد اکھاڑ کر رکھ دیتے اور مکہ مکرمہ کو ایسا ویران کر دیتے کہ اس میں کوئی آ کر نہ بستا اور پروپیگنڈا کرتے رہتے کہ ہم نے بتوں کا مندر رضائے الہی کے لیے توڑا اور یہ محض لینے کی سیاسی چال تھی۔

سُوْرَةُ الْقُرَيْشٍ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُ اٰيٰتٍ

سورۂ قریش مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝١ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝٢

اس واسطے کہ مانوس رکھا قریش کو مانوس رکھنا ان کو سفر سے جاڑے کے اور گرمی کے

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝٣ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ

تو چاہیے کہ بندگی کریں اس گھر کے رب کی جس نے ان کو کھانا دیا

مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝٤

بھوک میں اور امن دیا ڈر میں

سورۃ القریش مکیہ

* اصحاب الفیل کے واقعہ کے بعد حجاز، یمن اور شام میں قریش کی بڑی عزت ہو گئی کہ یہ جماعت خدام بیت اللہ ہے جس کی حفاظت خود خدا کرنے والا ہے۔ امراء طبقہ کو ایسے کرشموں سے جو قوموں پر نازل ہوتے ہیں بہت تعجب اور خوف ہوتا ہے اور غرباء تو غلام بن جاتے ہیں تو اس واقعہ نے قریش میں دو باتیں پیدا کر دیں۔ ایک تو ان کو تجارت میں سہولت ہو گئی۔ شام اور یمن کے بادشاہ جو نصرانی تھے اس واقعہ کے بعد انہوں نے ان کی تجارت سے ٹیکس وصول کرنا چھوڑ دیا۔ پھر ان کے دل میں بھی سلطنت کے لیے وسوسے پیدا ہونے شروع ہو گئے کہ ہم میں تو اتنی طاقت ہے کہ ہم دوسروں کو زیر کر سکتے ہیں اور پھر کوئی طاقت ہم پر حملہ نہیں کر سکتی۔ اس واقعہ فیل سے یہ بات ان کے دل میں پیدا کرانی مطلوب تھی۔

* یمن کی فوج سے قریش نہ لڑے اس کے دو سبب تھے۔ ایک تو ان کو خیال تھا کہ اگر لڑائی شروع ہو گئی تو شام کے نصرانی بھی ان کے مددگار ہو جائیں گے اور اگر بالفرض ہم کامیاب ہو بھی گئے تو بھی ہماری تجارت کے دونوں راستے بند ہو جائیں گے۔ تجارت پیشہ لوگوں کو اس کا بڑا خوف تھا۔ دوم یہ کہ بیت اللہ کی عمارت بہت پرانی ہو گئی تھی اور سقف میں شگاف ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے خیال میں یہ بات گوارا کر لی کہ ہم ضعیف تجارت پیشہ لوگ ہیں۔ بادشاہوں سے نہیں لڑ سکتے۔ اگر یمن کی فوج نے ظلماً بیت اللہ کو گرا دیا تو پھر ہم اس کو از سر نو احسن طریقے پر بنا لیں گے۔ یہ ان کی آخری بزدلی تھی۔ مگر آنحضرت ﷺ کے لیے زمین تیار کرنا بھی اسی واقعہ سے ہوا۔ اس واقعہ کے بعد ان میں بھی ملک گیری کے خیال آنے لگے اور انہوں نے معلوم کر لیا کہ خدا تو ہمارے ساتھ ہے تو بادشاہوں کا کیا ڈر۔ یہ وہ تدبیر الٰہی تھی جس سے آنحضرت ﷺ کے لیے آسانی مہیا ہو سکے اور نیسرک للیسریٰ کا پورا پورا مضمون ظاہر ہو جائے۔ اسی زمین پر یعنی حجاز میں جو قرآن مجید کا مرکز ہے بیت اللہ ہے۔ اور اس قرآن پر عمل کرنے

والی پہلی جماعت جو نمونہ کا کام دے گی وہ قریش ہے۔ انہی کے طریقہ پر ان کے ساتھ انصار (دوسری قوموں کے لوگ) مل گئے۔ اور اس طرح اسلام کی ایک مرکزی جماعت پیدا ہوگئی۔ اس پر پہلی سورتوں میں کافی بحث ہوچکی ہے۔ قریش میں ایک خاص قسم کا نیشنلزم تھا۔ جب تک اس کی اصلاح نہ کردی جائے وہ برے نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اس سورت میں گویا نیشنلزم تحریکوں کی اصلاح کی طرف اشارہ ہے کہ اسے کس طرح درست کیا جائے۔ اس سورت کا لفظی و معنوی تعلق ظاہر ہے کہ بعض مفسرین نے لام جارہ کو ماکول سے متعلق کیا ہے۔

* آیت ۱ و ۲ **لایلاف قریش. ایلافهم رحلة الشتاء و الصیف**

قریش کا طبعی شوق تھا کہ وہ گرمی اور سردی میں تجارت کے لیے سفر کرتے تھے۔ گرمی میں شام کی طرف اور سردی میں یمن کی طرف۔ ہندوستان کی جو تجارت یورپ کے ساتھ تھی اہل یمن اس کا واسطہ تھے۔ عربوں کی تاریخ میں یمنی قوموں کی ترقی کا کافی ذکر ہے اور اس کی بنیاد یہی تجارت تھی۔ اسی طرح مدینہ سے شمال میں وادی القری کا عرب کی تاریخ میں ذکر آتا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام مدینہ کے شمالی علاقہ میں رہتے تھے۔ آپ کی قوم نے تجارت میں بڑی ترقی کی تھی۔ آپ کی قوم کے بعد یہود کا ایک گروہ جو کہ ضرورت سے حجاز میں آکر آباد ہوگیا تھا اس نے تجارت اپنے ہاتھ لے لی تھی۔ ان کی بستیاں مدینہ سے لے کر شام تک چلی گئی تھیں۔ ان کی ترقی بھی قریش کے روبرو تھی۔ قریش اپنے آپ کو طبعی طور پر حجاز کے مالک اور مرکزی قوم سمجھتے تھے۔ ان تاریخی اور اپنے زمانے کے اثرات سے انہیں تجارت کا خاص شوق تھا اور اس کے ذریعہ انہوں نے ترقی کی بہت سی توقعات قائم کرلی تھیں۔ لیکن اس بلند خیالی کے مطابق ان کو تجارتی سامان میسر نہیں تھا تو ان کی مشکلات حل کرنے کے لیے ایک بڑا ذریعہ یہ بن گیا کہ وہ بیت اللہ کے خادم تھے۔ اور تمام عرب میں بیت اللہ کی عزت تھی جو عام طور پر مسلم تھی۔ اس واقعہ فیل کے بعد یمن اور شام میں بھی بیت اللہ کی عزت کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا۔ اب لوگ قریش کو مذہبی حیثیت سے بزرگ سمجھ کر بہت سی رعایت دیتے۔ ان کے قافلے امن سے سامان لاتے اور دور دراز ملکوں میں لے جانے میں کامیاب ہوجاتے اور

اس تجارتی ذریعہ سے جس کی کامیابی میں بیت اللہ کی خدمت کا بڑا دخل تھا مکہ کے تمام رہنے والوں کو روٹی پہنچتی تھی۔ یہ سورت اہل قریش یعنی مکہ کے رہنے والوں پر بھاری ذمہ داری ڈالتی ہے اور ان کو متنبہ کرتی ہے کہ تم اپنی قومیت کی بنیاد نسلی تفاخر پر نہ رکھو۔ بلکہ اس بیت کے رب کی عبادت کرنے کو اپنا شعار بناؤ اس مختصر جملہ میں یہ مطلب آجاتا ہے کہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی جو توقعات ہیں کہ ان کی نسل میں سے ایک جماعت تمام دنیا کے لیے نیک کاموں میں پیشوا ثابت ہو وہ جماعت اس نصب العین کو اپنے سامنے رکھے۔ نیشنلزم کے سامنے جب بلند نظریہ آجائے تو اس کی اصلاح ہو جائے اور اگر ایک اصول کی حمایت پر ایک قوم تل جائے تو اس اصول کے آدمی جس قوم میں ملیں وہ ضرور ان کی عزت کریں گے۔ اس طرح ان کی نیشنلزم طاقت انٹر نیشنلزم کیلئے مرکز کا کام دینے لگے گی اور یہ نیشنلزم کی انتہائی اصلاح ہے۔

* آیت ۳ فلیعبدوا رب هذا البیت الذی اطعمهم من جوع و آمنهم من خوف اس بیت کے رب کے غلام بن کر رہیں جس رب نے ان کی روٹی کا سامان اس بیت اللہ کے وسیلہ سے بنا دیا ہے۔ اور جابر بادشاہوں کے خوف سے امن میں بسنے لگے ہیں تو ان پر واجب ہے کہ اس پیشین گوئی کے مصداق بن جائیں جو حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے کی تھی کہ اس گھر سے ایک جماعت صالحہ ان کی اولاد میں سے پیدا ہو جو تمام قوموں کی استاد بن جائے اور تمام قوموں کو اس مرکز پر جمع کردے۔ اس لیے تم کو چاہیے کہ نیشنلزم کا خیال چھوڑ کر اس نصب العین کو سامنے رکھو۔ جس قوم میں یہ نکتہ موجود ہو اس کو اپنے اندر جذب کرلو اور اپنے اندر یہ خصوصیات پیدا کرلو۔ یہ حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ قریش تجارت کا شوق رکھتے تھے اور ان کو جو تجارتی سہولتیں میسر تھیں وہ فقط اس بیت اللہ کے خادم ہونے کی حیثیت سے ملتی تھیں۔ اسی بیت اللہ کے ذریعے ان کو امن ملا ہوا تھا تو اس بیت اللہ کی تعمیر کے وقت (یعنی حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام) کے جو اصول مانے گئے تھے قریش کو ان کا حاصل کرنا ضروری ہے یعنی اس بیت کی تعمیر کے وقت جن اصولوں کو اساسی طور پر مانا گیا تھا ان کے یہ حامل نہیں لیکن اگر وہ ان اصولوں کی حمایت کریں گے

تو حفاظت سے رہیں گے اور ان کو رزق میسر ہوتا رہے گا۔ اور کامیاب ہوں گے۔ واقعہ فیل کے بعد نوجوان قریشیوں میں ملک گیری کی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ جب میں مصر کی طرف تجارتی سامان لے جاتا تھا تو یہی سوچتا تھا کہ مصر پر کدھر سے حملہ کیا جائے۔ اور مغیرہ بن شعبہ کا قول ہے کہ قبل اسلام جب میں ایران گیا تو بادشاہ کو سجدہ کرتا دیکھ کر دل میں آیا کہ بادشاہ کو تھپڑ مار کر اتار دوں۔ ایسے مخنث لوگ بادشاہی کر رہے ہیں حالانکہ بادشاہی کے زیادہ حقدار ہم ہیں۔

سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعُ اٰيَاتٍ

سورۂ ماعون مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی سات آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ﴿١﴾ فَذٰلِكَ

تو نے دیکھا اس کو جو جھٹلاتا ہے انصاف ہونے کو ف سو یہ وہی ہے

الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ﴿٢﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ

جو دھکے دیتا ہے یتیم کو ف۲ اور نہیں تاکید کرتا محتاج کے

الْمِسْكِيْنِ ﴿٣﴾ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ﴿٤﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ

کھانے پر ف۳ پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی

صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴿٥﴾ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاۗءُوْنَ ﴿٦﴾ وَ

نماز سے بے خبر ہیں ف۴ وہ جو دکھلاوا کرتے ہیں ف۵ اور

يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ﴿٧﴾

مانگی نہ دیویں برتنے کی چیز ف۶

سورۃ الماعون مکیہ

* سورۃ ماعون کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور اس کا غلام ہو رہنے کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی آدمی یتیموں، بے کسوں اور مسکینوں کی امداد نہ کرے اور تجارت وغیرہ سے سرمایہ جمع کرنے کا یہ مطلب ہے کہ جماعت کے غرباء اور مفلوک الحال لوگوں کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اگر اس میں مذہبی جماعت فیل ہو گئی تو پھر نمازیں بھی فیل ہے۔ سورۃ قریش میں قریش کی قومیت کو ایک مذہبی جماعت میں تبدیل کرنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ مذہبی جماعتوں میں جو عیب پیدا ہو جاتے ہیں ان کو اس سورت میں سمجھایا گیا ہے مذہب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قوم کی خرابی دور کرنے کے لیے مذہبی رنگ اختیار کیا جائے مگر قوم میں وہ خرابیاں بدستور قائم رہیں یا آگے سے بھی بڑھ جائیں۔

* آیت ۱ تا ۳ ارئیت الذی یکذب بالدین فذالک الذی یدع الیتیم و لایحض علی طعام المسکین ایسے آدمی کا خاکہ کھینچا گیا ہے جو دوسری زندگی کا منکر ہے۔ ایک مذہبی آدمی اور دنیا دار میں نمایاں فرق یہ ہوتا ہے کہ خدا کے ماننے میں تو دونوں قریب قریب شریک ہیں مگر آخرت کو ماننے والا انسان دین دار کہلاتا ہے اور اس سے بے پروائی برتنے والا انسان دنیا دار کہلاتا ہے۔ اس سورت میں ایک دنیا دار سرمایہ دار اور دین دار کا مقابلہ کر کے دکھایا گیا ہے کہ کون نامعقول ہے۔ ارئیت الذی یکذب بالدین وہ آدمی جو یوم الدین کا انکار کرتا ہے کیا تو نے اسے دیکھا؟ فذالک الذی یدع الیتیم اس آدمی کی یہ حالت ہے کہ وہ یتیموں کو دھکے دیتا ہے یتیم کی لازمی وصف ہے بے کس و بے یار و مددگار۔ وہ ایسے لوگوں کو اپنی طرف آنے نہیں دیتا۔ و لایحض علی طعام المسکین اور مساکین کو کھانے کی طرف نہیں بلاتا۔ ان کے طعام کا بندوبست نہیں کرتا اور ان کے گذران کی کوشش نہیں کرتا۔ یہی لوگ یکذب بالدین ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو دین دار

سمجھتے ہوں۔ یتیموں کو دھکے دینے اور مساکین کے کھانے سے بے پروائی برتنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو اس میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا اور آخرت کا وہ قائل نہیں تو جس قدر اصول اس کی عقل نے تسلیم کیے ہیں ان پر یہ پورا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک نیشنلسٹ جتنی چیزوں کو صحیح سمجھتا ہے وہ اگر ان کا پابند ہو تو وہ قابل تعریف مانا جاسکتا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں دین دار آدمی کا ذکر آتا ہے کہ ان نمازیوں کے لیے افسوس ہے۔ (آیت ۵ و ۶ آیت ۷ کے بعد دیکھو)

* دوسری تقریر یہ ہے کہ مذہبی جماعت جب سرمایہ پرست ہوجاتی ہے اور جب وہ نظام عالم میں فیل ہوجاتی ہے تو اپنے آپ کو مذہبی ثابت کرنے کے لیے صلواۃ کی پابند ہوجاتی ہے لیکن چونکہ اس نے کوئی مشقت نہیں جھیلی اس لیے باوجودیکہ وہ جماعت نماز باقاعدہ پڑھتی ہے مگر مناجات جو روح نماز ہے اس میں نہیں ہوتی۔

آیت ۷ و یمنعون الماعون جن چیزوں کو لوگ عاریۃً لے کر فائدہ اٹھاسکتے ہیں یہ نمازی لوگ ان سے بھی لوگوں کو فائدہ حاصل کرنے نہیں دیتے۔ مثلاً کہ ایک آدمی کے پاس پتیلی ہے وہ اپنا کھانا پکا چکا ہے، اب ہمسایہ کو ضرورت ہے کہ اس میں اپنا کھانا پکا کر اسے واپس کردے گا۔ ماعون اس چیز کو کہتے ہیں جو ایک شخص کے استعمال کے بعد دوسرے کے استعمال میں بھی (ضائع ہونے کے خطرے کے بغیر) آسکتی ہو۔ اگر کوئی شخص نماز تو پڑھتا ہے لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنی چیز عاریۃً دوسرے شخص کو نہیں دیتا تو اس پر افسوس ہے۔ ایسی دین داری سے کیا فائدہ کہ لوگوں کی عام خوبیاں بھی ان نمازیوں میں نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نیشنلزم کی اصلاح کے لیے جو دین داری پیش کی جارہی ہے وہ ایسی ہے۔ آیت ۵ فویل للمصلین (۱)

---

(۱) اصول فقہ کے مسئلہ صفت سے زید کی مثال دی جاتی ہے کہ جب وہ اس صفت میں کمال رکھتا ہے تو وہ اس صفت میں مشہور ہوتا ہے۔ جیسے صرف میں پڑھایا جاتا ہے کہ ضرب یضرب ضرباً فهو ضارب یعنی زمانہ گذشتہ میں زید نے مارا، حال کے زمانہ میں مارتا ہے اور مستقبل میں مارے گا اور مارتا بھی خوب ہے تو ایسی حالت میں اس کو ضارب کہا جائے گا۔ اب یہاں مصلین تب بولا جائے گا جب پوری شرائط و ارکان سے نماز ادا کرے۔ اگر اس زمانہ میں ویل للمصلین کے معنی ویل للمسلمین کیا جائے تو کوئی مناقضہ نہیں۔

الذین ھم عن صلاتھم ساھون اب یہ شبہ ہوتا ہے کہ واقعی دین دار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نماز پڑھنے والے اور خدا کو ماننے والے کیا ایسی ہی بدعنوانیاں کرتے ہیں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ لوگ سچے دین دار نہیں ہیں یہ فقط دکھلاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔ نماز کے معنی بالکل بھولے ہوئے ہیں تو حاصل یہ نکلا کہ یہ جماعت دین دار نہیں ہے۔ آیت ۶ الذین ھم یراؤن یہ نمائشی طور پر نماز پڑھتے ہیں قرآن مجید ایسی دین داری کی دعوت نہیں دیتا۔ ایسے دین دار سے وہ آدمی جو لادین ہے زیادہ اچھا ہے کیوں کہ وہ اپنے اصول کا پابند ہے۔

* یہ دین دار لوگ جو ایسی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں قرآن مجید کی دین دار جماعت سے نہیں ہیں۔ یہ تو اپنی نماز سے بھی غافل ہیں۔ اور یہ مردار طاقت ہے۔ اس سے کوئی امید نہیں کہ یہ کامیاب ہو۔ یہ جماعت اور مذہبی کام بھی رسمی طور پر ادا کرتے ہیں ان کے دل میں تقرب الٰہی کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں ہے۔ حاصل کلام یہ کہ یہاں مذہبی جماعت کے ناکام ہونے کا خاکہ کھینچا گیا ہے کہ جو جماعت یتیموں اور مسکینوں کو سنبھالنے کا اپنے اوپر ذمہ نہیں لیتی وہ جماعت دراصل بے دین ہے۔ وہ مذہبی لباس پہن کر اندرونی طور پر سرمایہ پرست ہیں وہ خدا پرست نہیں۔ اگر ان کو ایمان بیوم الدین ہوتا تو وہ اعلیٰ کام میں (جس میں رضائے مولا یقینا موجود ہے) سبقت کرتے اور یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلاتے اور ان کو اپنے عیال کی طرح سمجھتے۔ یہی تو دین ہے اور اسی کے سبب سے یوم الدین میں بہت اجر کی توقع ہے۔ اور یہ مدعی دین جو یتیموں کو دھکیلتے ہیں اور مساکین کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں کرتے یہ دراصل منکر بیوم الدین ہیں۔ کیوں کہ یوم الدین میں تو انسانیت کا ظہور ہوگا اور یہ انسانیت سے دور ہیں۔ (دیکھو سورۃ البلد)

* اب جب یہ دین دار طبقہ ان انسانیت کے کاموں (یعنی یتیموں کو اپنے عیال کے مثل رکھنے اور مسکینوں کے کھانے کے انتظام کرنے) میں فیل ہوجاتے ہیں تو پھر نماز کی طرف دوڑتے ہیں مگر وہاں بھی فیل ہوجاتے ہیں انسان خدائے تعالیٰ کی طرف طبعاً اس وقت دوڑتا ہے جب اس کے اوپر بڑی مشکل آپڑتی ہے یا اس نے ایک بڑا کام شروع کیا ہوا ہوتا ہے جیسے یتیموں اور مسکینوں کی پرورش کا انتظام۔ انہوں نے کوئی انسانیت

لی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لی تو گویا ان کا دماغ بڑا عیش پسند واقع ہوا ہے۔ وہ اگر نماز پڑھتے ہیں تو فقط دکھانے کے لیے تاکہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں اور ان کو دین دار نمازی سمجھیں۔ مگر ان کے دل میں اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنی التجا اور تضرع رب سے نہیں کرتے کیوں کہ ان کے سر پر بار نہیں۔ اور پھر یہاں تک نالائق ہے کہ ماعون جیسی اشیاء سے متعلق کہتا پھرتا ہے کہ لوگوں کو مت دو۔ اس کو تو چاہیے تھا کہ لوگوں کو تلقین کرتا کہ یتیموں اور مساکین کا انتظام کریں تاکہ لوگوں کے دل میں انسانیت پیدا ہو اور خود بھی اس پر عمل کرتا مگر وہ یتیموں کو دھکے دیتا ہے اور مساکین کا کوئی انتظام نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے گھر میں کوئی چیز فارغ پڑی ہے تو فقط فائدہ اٹھانے کے لیے عاریتہً بھی لوگوں کو نہیں دیتا اور اگر کوئی ایسی اشیاء دینے دیتا ہے تو اس پر بندش ڈالتا ہے اور طرح طرح سے لوگوں کو سمجھاتا ہے کہ اپنی اشیاء لوگوں کو استعمال کے لیے نہ دیں۔ خود بھی بخیل ہے اور لوگوں کو بھی بخل سکھاتا ہے۔ ہمارے ہندوستان کے گدی نشین پیر اس سورت کے پورے پورے مصداق ہیں۔ اور حضرات علماء میں سے بھی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ ان میں سے کوئی بھی مساکین سے ظلم دور کرنے اور مساکین کے کھانے کا انتظام کرنے والا ہو۔ مذہب عمل سے ترقی کرتا ہے نہ کہ محض علم سے۔ مدرسے اور خانقاہیں بھری پڑی ہیں۔ ان میں نہایت بداخلاقی پھیلی ہوئی ہے کیوں کہ ان سے جو کام مطلوب ہے وہ نہیں لیتے۔ جیسے ہی تعلیم سے فارغ ہوئے ان کو مدرسہ سے نکال دیا۔ آگے وہ کیا کرے۔ اس کی خبر نہیں انسانیت کے کام اگر ان کو مدرسوں اور خانقاہوں میں سکھائے جاتے تو آج مسلمانوں کی حالت یوں تباہ نہ ہوتی کہ سود در سود میں غرق ہیں۔ علاوہ اس کے اخلاق بھی تباہ ہیں۔

سُورَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلٰثُ اٰيٰتٍ

سورہ کوثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝١ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝٢

بیشک ہم نے دی تجھ کو کوثر سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر

إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝٣

بیشک جو دشمن ہے تیرا وہی رہ گیا پیچھا کٹا

سورۃ الکوثر مکیہ

* اس سورت میں ان دینی اصولوں کا خلاصہ ہے جن کی دعوت نیشنلسٹوں کو دی جاتی ہے۔

* آیت ۱ **انا اعطینا الکوثر** اے رسول ﷺ ہم نے تجھے خیر کثیر دیا۔ خیر کثیر کو قرآن مجید میں حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ ہے حکمت۔ اور دوسرے موقع پر حکمت کا کورس قرآن عظیم بتلایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تجھے قرآن مجید دیا۔ مشہور یہ ہے کہ الکوثر ایک حوض یا نہر کا نام ہے جو قیامت میں آنحضرت ﷺ کی امت کو پانی پینے کے لیے ملے گی۔ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے دنیا میں قرآن مجید کا فیض پھیلا۔ قوموں نے طبقہ در طبقہ قرآن مجید سیکھا اور انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ یہی فیض حاصل کرنا حوض کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ جس آدمی نے یہاں جس قدر قرآن مجید سیکھا ہے اسی انداز سے وہاں تشنگی دور کرنے والا پانی ملے گا۔ تو جن روایتوں میں حوض وغیرہ سے تعبیر کیا گیا ہے وہ بھی قرآن مجید کا اثر ٹھہرا۔ دنیا میں حوض کوثر یہی قرآن مجید ہے حوض کوثر کی صفتیں جو حدیث میں منقول ہیں وہ قرآن مجید پر صادق آتی ہیں۔ اور قیامت میں قرآن مجید کی مثالی اور روحانی شکل وہی حوض کوثر کا پانی نظر آئے گا۔ رسول کریم ﷺ قریش کے اعلیٰ خاندان کے سردار ہیں۔ آپ کے پاس ایک علم (قرآن مجید) ہے۔ قریش کو چاہیے کہ اپنا علمی کمال اپنے سردار کی اس کتاب کو بنالیں۔ اس سے نیشنلزم کی اصلاح ہو جائے گی۔ جب آنحضرت ﷺ کو اتنا بڑا ذخیرہ خیر کثیر کا دیا گیا تو آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ:

* آیت ۲ **فصل لربک** اپنے رب کو یاد کر۔ اور اس صلوۃ کے ذریعہ قرآن کی اشاعت کا حکم ہوتا ہے یعنی اشاعت قرآن کے وقت آپ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ جب آپ کے پاس بڑی بڑی جماعتیں آجائیں گی اور آپ

سے کام میں شریک ہو جائیں گی تو آپ کے دل میں غرور اور تکبر پیدا نہ ہوگا اور آپ اللہ کے بندے اور غلام رہیں گے اور اس تعلیم کا مالک اللہ کو سمجھیں گے۔ رسول کریم ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید قوموں میں پھیلائیں۔ قرآن مجید تو اللہ تعالی نے عنایت فرمایا ہے۔ اب فرض یہ ہے کہ اس کو پھیلایا جائے۔ آنحضرت ﷺ جب نماز پڑھتے ہیں تو اس میں بھی قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اور یہی طریقہ اشاعت کا ہے۔

آیت ۳ **وانحر** اسی طرح قریش میں ماننے والی جو جماعت تیار ہو رہی ہے ان کے لیے کھانے کا انتظام مہیا کرو۔ اونٹ ذبح کرنے میں ایک سخاوت کی لہر ہے۔ اگر ایک آدمی کے کھانے کا انتظام کرنا ہو تو بھی ایک اونٹ ذبح کرنا ہوگا۔ اس طرح بہت سے لوگ خود بخود کھانا کھا سکیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو دریا دلی سے اپنے حال میں شریک کرو۔ اور اسی طرح علمی و عملی اصلاح ہو جائے گی۔ اس سورت میں نماز کے ساتھ قربانی کو بھی جمع کر دیا گیا ہے۔ سورت ماعون میں کہا گیا تھا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں مگر مساکین کے کھانے کا انتظام نہیں کرتے اب اس جگہ بتلایا کہ ان کی یہ حالت ہے کہ ایک آدمی کے لیے سارا اونٹ ذبح کرتے ہیں۔

* آیت ۳ **ان شانئک هو الابتر** جو آدمی تیری برائی چاہتا ہے وہ ناکام رہے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ قریش جب تک اس دین کو قائم رکھیں گے اس وقت تک ان پر کوئی غالب نہیں آسکے گا۔ دوسری حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی حبشی ہو اور وہ کتاب اللہ کو قائم رکھتا ہو تو اس کی اطاعت کرو۔ ان دونوں آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے قریش کی جس قدر عزت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس دین کے پابند تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قریش ذاتی طور پر آپ کی قوم میں سے تھے مگر اس قومیت کو قرآن مجید سے کیا تعلق؟ غرض اس سورت میں بتلایا گیا ہے کہ جو اس تعلیم (قرآن مجید) اور دین سے بغض رکھتے ہیں وہ ناکام رہیں گے۔ ابتر کہتے ہیں اس شخص کو جس کا بیٹا نہ ہو۔ تو یہ ایک عام ذہنیت ہے کہ انسان یہی سمجھتا ہے کہ اگر اس کا بیٹا ہے تو اس کا کام آگے چلتا رہے گا ورنہ بند ہو جائے گا۔ اس واسطے ان کو بتایا گیا ہے کہ جو آدمی خدا ترس نہ ہو اور مستحقین کی مدد نہ کرے وہ ناکام رہے گا۔ اور

اس کی تحریک بھی اسی پر ختم ہو جائے گی اس کے برعکس آنحضرت ﷺ کی تحریک کی طرف اشارہ ہے کہ وہ تحریک کامیاب رہے گی اور آپ کا کام چلتا رہے گا۔

* ہمارے مفسرین کی بڑی غلطی یہ ہے کہ جہاں آنحضرت ﷺ کی ذات کو خطاب ہوتا ہے تو اس کام کو آپ کی ذات تک محدود سمجھتے ہیں یعنی اس کو خاص بنا لیتے ہیں اس میں غلطی یہ ہے کہ جو حکم آپ کو اس جماعت کے افسر کے اعتبار سے دیا گیا ہے تو اب جب کہ افسر کو حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حکم کے ساتھ تمام جماعت بھی شامل ہے۔ اب جو کہا گیا ہے کہ اس تحریک کے خلاف کام کرنے والے ناکام رہیں گے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ رسول کریم ﷺ کی تحریک کو جو آپ کے ساتھ چلانے والے ہیں ان کے ذریعے آپ کے کام کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ حاصل یہ نکلا کہ اس خیر کثیر (قرآن مجید) کی اشاعت کے لیے ایک تو اس کے احکام پر سر بسجود ہو جاؤ اور اس کے سوا اپنا کوئی پروگرام اختیار نہ کرو اللہ تعالی کے آگے سر بسجود رہو۔ اتصال اپنا قائم رکھو، اسی حالت میں اشاعت تعلیم قرآن مجید کیا کرو اور اس قانون کی اقامت کے لیے قربانیاں گوارا کرو خواہ گلا کاٹا جائے۔ تو جب اس مضبوطی سے اور ہمت و استقلال سے کام کیا جائے گا تو تم ہی کامیاب رہو گے اور انقلاب اس کے سوا ہو نہیں سکتا جب تک انسان اپنے قانون پر مستعدی سے کام نہ کرے اور قربانی دینے پر تیار نہ ہو۔ جب وہ قربانی دے گا اس وقت دشمن مغلوب ہو جائے گا اور اس کا پیچھا چھوٹ جائے گا اور اس کو کہیں سے مدد نہیں پہنچے گی۔ اور لشکر تازہ دم اسی وقت رہتا ہے جب تازہ دم فوج آتی جائے۔ اور جب ایک فوج محصور ہو گئی تو مفتوح ہو گئی۔ اسی کے لیے کہتے ہیں اذ حوصر سقط اب اگلی سورت میں بیان کہ اسلام کیسے غالب ہوا۔

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتُّ اٰيٰتٍ

سورۂ کافروں مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ① لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ②

ترجمہ اے منکرو ف۱ میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ③ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا

اور نہ تم پوجو جس کو میں پوجوں ف۲ اور نہ مجھ کو پوجنا ہے اس کا جس کو

عَبَدْتُّمْ ④ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ⑤ لَكُمْ

تم نے پوجا اور نہ تم کو پوجنا ہے اس کا جس کو میں پوجوں ف۳ تم کو

دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ⑥

تمہاری راہ اور مجھ کو میری راہ ف۴

سورة الکافرون مکیہ

* آیت۱ قل یا ایھا الکافرون اے رسول ﷺ کافروں کو کہو (یعنی ریاکشنری والوں کو) کہ اب ہمارا تمہارا تعلق منقطع ہو گیا۔ کافر سے وہ لوگ مراد ہیں جو اسلام کے خلاف اپنے پروگرام کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ اس واسطے ان کو پہلی آیت میں خطاب کیا گیا ہے۔ دوسری اور تیسری آیت میں کہا گیا ہے کہ: آیت۲ و ۳ لااعبد ما تعبدون و لا انتم عابدون ما اعبد ہم تمہارے معبود کی اور تم ہمارے معبود کی عبادت نہیں کرتے۔ تمہارا اور ہمارا پروگرام آپس میں نہیں ملتا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمارا تمہارے ساتھ مرکزی نقطہ نہیں ملتا۔ دو دینی تحریکوں میں کم از کم اتنا اثر تو ضرور ہونا چاہیے کہ ان کا معبود ایک ہو مگر یہاں حالت یہ ہے کہ ہمارا اور ان کا معبود ایک نہیں۔ غرض ان دو آیات میں بتلایا گیا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے معبود کو نہیں مانتے۔ (زمانہ حال میں)

* آیت۴ و ۵ و لا انا عابد ماعبدتم و لا انتم عابد ما اعبد ان دو آیات میں بتلایا گیا ہے کہ ہم آئندہ بھی ایک دوسرے کے معبود کو نہیں مانیں گے۔ آیت۶ لکم دینکم و لی دین تمہارے لیے تمہارا پروگرام اور ہمارے لیے ہمارا پروگرام۔ غرض دونوں کے پروگرام اب ایک دوسرے سے پوری طرح منقطع ہو گئے۔ حقیقت میں یہ ایک طرح کا الٹی میٹم ہے۔ جب تک دو جماعتوں اور دو سلطنتوں میں ملنے کی توقع ہوتی ہے اس وقت تک ان دونوں میں لڑائی نہیں ٹھن سکتی۔ مگر جب ملنے کی توقع ختم ہو جاتی ہے اس وقت لڑائی کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ اب یہ کہ لڑائی کب ہو گی اس کے متعلق حالات خود فیصلہ کریں گے۔ سفارتی تعلقات کا منقطع کر لینا ہی لڑائی کا پیش خیمہ ہے بہت سے مفسروں نے بے سمجھی سے اس سورت کو لڑائی کے ترک کر دینے پر محمول کر لیا ہے یعنی یہ کہ اس سورت میں لڑائی کو موقوف کرنے کے لیے حکم دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ در حقیقت یہ ایک قسم

کا الٹی میٹم تھا۔ مولوی حمید الدین صاحب مرحوم کی تفسیر بھی اسی طرح ہے۔ سرسید نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں لڑائی مدافعانہ ہے۔ اور مولوی حمید الدین صاحب اس سورت کو الٹی میٹم قرار دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے تو مکہ مکرمہ میں اعلان جنگ ہوچکا تھا جس سے قریش گھبرا رہے تھے اور آنحضرت ﷺ کے متعلق دارالندوہ میں مشورہ کے لیے جمع ہوئے تھے اور وہ اسے ایک بڑی عظیم جنگ سمجھتے تھے کیوں کہ آنحضرت ﷺ کے بلند ارادوں اور کام کی اعلیٰ تدبیرات کو دیکھ کر ان کو آنحضرت ﷺ کی کامیابی کا پورا یقین ہوچکا تھا۔

سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُ اٰيَاتٍ

سورۂ نصر مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۞ ١ وَرَاَيْتَ النَّاسَ

جب آ پہنچے مدد اللہ کی اور فیصلہ ہو اور تو دیکھے لوگوں کو

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۞ ٢ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ

داخل ہوتے دین میں غول کے غول تو پاکی بول اپنے رب

رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۞ ٣

کی خوبیاں بیان اور گناہ بخشوا اس سے بیشک وہ معاف کرنے والا ہے

سورۃ النصر مدنیہ

* الٹی میٹم کے بعد لڑائی ہوتی ہے۔ الٹی میٹم کا جو نتیجہ نکلا وہ اس سورت میں بتلایا گیا ہے کہ مکہ بھی فتح ہوگیا جو مرکز عرب تھا۔ اب ایک حکومت قائم ہوگئی ان اصولوں پر جن کا آپ نے مکہ مکرمہ میں اعلان کیا تھا اور ظاہر میں یہ حکومت نیشنلسٹ یعنی قومی تھی مگر اصولاً وہ انٹر نیشنل طاقت تھی جس میں دوسری قومیں شریک ہوگئیں۔

* آیت ۱ اذا جاء نصر اللّٰہ و الفتح اللہ تعالیٰ کی مدد ہے، مرکزی جماعت کا قیام۔ مہاجرین اور انصار کی مرکزی جماعت اپنا فرض پہچان گئی جو کام پہلے صرف آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک سے تعلق رکھتا تھا آپ کی تعلیم سے جو جماعت پیدا ہوئی اس نے اس فرض کو اپنے اوپر ذمہ داری سے لے لیا یعنی اسے اپنا فرض قرار دیا تاکہ حجاز جیسے ملک میں ایسی اعلیٰ تحریک کے لیے مضبوط مرکزی کمیٹی قائم ہوجائے اور وہ بھی دس بیس برس کی قلیل مدت میں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت تھی۔ اسی کو نصر اللہ سے تعبیر کیا گیا اور یہ مسلسل رہے گی (یعنی یہ نصر من اللہ آپ کی اور آپ کی جماعت کے ساتھ مسلسل رہے گی) اس کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ اس مدد ملنے کے بعد مکہ مکرمہ فتح ہوگیا جو حجاز کا دارالسلطنت تھا۔ آیت ۲ و رأیت الناس یدخلون فی دین اللّٰہ افواجاً مرکز پر قبضہ ہونے کے بعد تمام ملک میں قبضہ مکمل ہورہا ہے اور قوموں کی قومیں اس مسلک اور دین میں داخل ہورہی ہیں اور آپ کے پروگرام کو قبول کرکے اور آپ کی تحریک میں شامل ہوکر خدائی انٹر نیشنلزم کو کامیاب بنانے کی کوشش میں لگ گئی ہیں۔ آیت ۳ فسبح بحمد ربک واستغفرہ اے رسول ﷺ تو نے اپنا کام پورا کردیا اب تو اللہ کو یاد کر۔

* اس سورت میں ذکی صحابہ کا امتحان ہورہا ہے۔ سب سے پہلے سیدنا ابوبکر صدیقؓ اس سورت کا مطلب یہ سمجھے کہ آنحضرت ﷺ (روحی فداہ) کا اب وقت ختم ہوچکا ہے۔ آپ نے اس کام کو مکمل کرلیا جس کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ اب آپ کو

اللہ تعالیٰ جل شانہ حظیرۃ القدس کی طرف بلا رہے ہیں اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عباس کا اس سورت میں امتحان لیا تو انہوں نے بھی اس سورت کا یہی مطلب لیا۔ مولوی حمید الدین صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہے یعنی حجاز کا دارالسلطنت ہے۔ مگر ہم لوگ اسے پولٹیکل فتح سے تعبیر کرتے ہیں کہ اس اسلام کا ایک شعبہ ہو گیا اور اس سے پولیٹیکل کام کو ترقی ہوئی۔

سُوْرَةُ اللَّهَبِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

سورۂ لہب مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝۱ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ

ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے اور ٹوٹ گیا وہ آپ ف۱ کام نہ آیا اس کو مال اسکا

وَمَا كَسَبَ ۝۲ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳ وَّ

اور نہ جو اس نے کمایا ف۲ اب پڑیگا لپٹیں مارتی آگ میں ف۳ اور

امْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴ فِيْ جِيْدِهَا

اس کی جورو جو سر پر لیے پھرتی ہے ایندھن ف۴ اس کی گردن میں

حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵

رسی ہے مونجھ کی ف۵

سورۃ اللہب مکیہ

* مولوی حمید الدین لکھتے ہیں کہ سورۃ اذا جاء نصر اللہ میں مسلمانوں کی فتح کی طرف اشارہ تھا اور اس سورۃ میں کفار کی شکست کی طرف اشارہ ہے۔ مولوی صاحب کا ذہن اس سورت سے اس طرف متوجہ ہوا کہ قریش مکہ کا فرعون کون تھا؟ قرآن مجید کسی خاص آدمی کا نام نہیں لیتا مگر اس سورت میں اس نے ابولہب کا خاص طور پر نام لیا ہے۔ رسول کریم ﷺ کے خلاف سب سے بڑی طاقت ابولہب تھی۔ اس واسطے اس کا نام قرآن مجید میں لیا گیا ہے۔ اور اس شکست کا ذکر ہے۔ مگر اسلامی روایتوں میں یہ عام نظریہ ہے کہ اس امت کا فرعون ابوجہل تھا۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مکہ کا حاکم ابوجہل تھا۔ ابولہب نہیں تھا۔ مولوی حمید الدین صاحب کو اس جگہ عام رائے سے ہٹ کر ایک نیا فلسفہ چھانٹنا پڑا لیکن اس بارے میں ہمیں ان کی تفسیر سے موافقت نہیں ہے۔ انہوں نے ایک رسالہ کی شکل میں اس سورت کی تفسیر کی ہے مگر ہم اور نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں پولیٹیکل طاقت انتہائی طاقت نہیں ہے یعنی مستقل طاقت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک دوسری طاقت کا نتیجہ ہے۔ طاقت درحقیقت سوشل ہوتی ہے اور اس سے حکومت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ تمیز ہمیں تب سے پیدا ہوئی جب سے ہم نے یورپ کی انٹرنیشنل تحریک کا مطالعہ کیا اور اس نے ہمیں قرآن مجید کی تفسیر میں بہت مدد دی ہے۔ ہمارے اکثر مفسرین اس کو مدنظر نہیں رکھتے اس واسطے وہ بہت پریشان ہوتے ہیں۔ یورپ میں بھی ساری طاقت اس سے پیدا ہو رہی ہے۔ اگر کسی قوم کو دوسری قوم پر پولیٹیکل فتح ہوجائے اور سوشل فتح نہ ہو تو یہ (پولیٹیکل) فتح عارضی ہے اور چونکہ سوشل فتح نہیں ہوئی اس واسطے سوشل کو نپلیں دوبارہ نکل آئیں گی اور ان کے خلاف سوشل طاقت جمع ہوجائے گی۔ ہم اس سورت کو سوشل فتح سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح سورت النصر میں پولیٹیکل فتح تھی۔

* اب سوشل فتح میں جس چیز کا ذکر آنا چاہیے وہ ایک مقابل طاقت خاندان کی ہوتی

چاہیے۔ رسول کریم ﷺ نے اپنے دل میں مخفی دعا مانگی جسے استعداد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی چھپی ہوئی خواہش تھی کہ اگر کسی برے خاندان کی سوشل مثال کا ذکر آنا منظور ہو تو وہ ہمارے خاندان کے کسی گھر کی مثال ہونی چاہیے۔ ابولہب رسول کریم ﷺ کا چچا تھا۔ اس واسطے آپ کا یہ خیال کہ اپنے خاندان کی بری مثال پیش کی جائے ایک نہایت حکیمانہ فعل ہے۔ یہ آپ کی طبیعت کی مخفی دعا تھی، اللہ تعالی نے اسے قبول کرلیا اور ویسی ہی سورت نازل کی۔ رسول کریم ﷺ کے خاندان کے سوا اگر کسی دوسرے گھر کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آجاتا تو وہ ساری عمر کے لیے دشمن ہوجاتا اور موجودہ صورت میں جو خرابی کا الزام ہے وہ آپ کے اپنے خاندان سے ہے اور وہ یہیں ختم ہوجاتا ہے۔ ہماری سمجھ میں ابولہب کو اگر عرب کی سوشل خرابی کا نمونہ سمجھا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ مگر اسے حجاز کی پولیٹیکل طاقت کا نمائندہ بنا کر فرعون بنانا بالکل غلط ہے۔ مولوی حمیدالدین صاحب مرحوم کا یہ خیال کہ قران مجید پولیٹیکل طاقت سے سیدھا نہیں لڑتا دراصل سرسید کے خیالات کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ ان سے متاثر تھے۔

* اس سورت کی تفسیر یہ ہے کہ یہ لفظ ایک بددعا ہے۔ آیت۱ **تبت يدا ابى لهب و تب** خدا کرے ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹیں۔ اور خود برباد ہو۔ آیت۲ **ما اغنى عنه ماله و ما كسب** اپنے گھر کے اجتماع کے ذریعے جو اس نے مال کمایا ہے اور اس نے جو آدمی پیدا کیے ہیں خدا کرے وہ اس کے کام نہ آئیں۔ آیت۳ **سيصلى نارا ذات لهب** جلدی ایسا وقت آنے والا ہے کہ وہ شعلے والی آگ میں داخل ہوگا۔ آیت۴ **و امراته حمالة الحطب** اور اس کی بیوی جو آگ جلانے کے لیے ایندھن جمع کرتی ہے۔ آیت۵ **فى جيدها حبل من مسد** اس کے گلے میں کھجور کا رسا ہوگا۔

* اس طرز پر تفسیر کرنے کا مطلب یہ بن جاتا ہے کہ پولیٹیکل طاقت کے زور سے سوشل اصلاح نہیں ہوسکتی۔ وہ لوگوں کی ذہنیت بدلنے سے ہوتی ہے اور ذہنیت بدلنے کا طریقہ یہ ہے کہ توجہ اور تاثیر سے دوسرے ذہن پر اثر ڈالا جائے۔ اس کا دوسرا طریقہ

دعا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی پوری توجہ سے پیش کیا جاتا ہے کہ یا اللہ تعالیٰ یہ کام ہوجائے۔ یہ سورت ایسے الفاظ میں نازل ہوئی ہے کہ یہ ہوچکا ہے۔ لوگوں نے غلطی سے اسے پیشین گوئی پر محمول کرلیا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اور یہ محض دعا ہے۔ ہم کسی آدمی کے متعلق بددعا کریں اور وہ قبول بھی ہوجائے تو اس کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا کہ اس آدمی کی قوت بھی سلب ہوگئی۔ وہ اپنی پوری قوت کے مطابق زور سے کام کرسکتا ہے مگر مقابل میں اتنی طاقت آئے گی کہ وہ شکست کھاجائے گا۔ یہ شکست سوشل نوعیت کی ہوگی۔ یہاں مفسرین نے اپنی بددماغی سے ایسے شبہات پیش کیے ہیں کہ ان کا اس جگہ ذکر کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مثلاً کہتے ہیں کہ جب انہیں بتادیا گیا کہ ابولہب مسلمان نہیں ہوسکے گا اور وہ جہنم میں جائے گا تو پھر اسے اسلام لانے کی دعوت دینے کا کیا مطلب؟ مگر جس طرح ہم نے ترجمہ کیا ہے اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔ وہ جس وقت اپنی اصلاح کرلے گا اسی وقت سے وہ اول درجہ کے آدمیوں میں شامل ہوسکتا ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ جو بری مثال پیش کر رہا ہے وہ ختم ہو یعنی بری مثال نہ رہے اور اس کو شکست ہو۔ شکست دو قسم کی ہوتی ہے یا تو وہ جہنم میں چلا جائے گا یا ہدایت پاکر اس کی سوشل حالت کو شکست آجائے گی۔ اس کا حاصل ہماری سمجھ میں یہ ہے کہ یہ سورت اسلام کی سوشل فتح کی خبر دینے والی ہے۔ سوشل اصلاح بھی تمام عرب کی اور خصوصاً قریش کی بدرجۂ اتم ہوجائے گی۔ یہ سوشل فتح و اصلاح نتیجہ ہے ذہنی اصلاح و انقلاب کا۔ معاشرہ ہمیشہ ذہنی انقلاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔

* اس سورت اللہب(۱) کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر جنگ سے کسی قوم پر دوسری قوم غالب آجائے تو دیکھنا یہ ہے کہ اگر مغلوب قوم میں معاشرت وہی رہی یعنی طبعی ضروریات پوری کرنے کا طرز وہی سابقہ رہا جیسے رسوم نکاح و شادی اور آپس میں ملنا جلنا اور خانگی عادات وغیرہ ویسے کے ویسے رہے اور ان کی اقتصادی حالت بھی ویسی کی ویسی رہی بلکہ جن رسوم پر ان کے لین دین تھے وہ بھی ویسے رہے اور مال کسب کرنے کے

---

(۱) اگر ابولہب بالفرض مسلمان ہوجاتا تب بھی یہ سورت ویسی کی ویسی ہی پڑھی جاتی کیوں کہ معاشرے میں جو غلطیاں سرزد ہورہی تھیں یہ دراصل ان پر بددعا ہے۔

طریقے بھی ویسے رہے تو حکیم آدمی پیشین گوئی کرے گا کہ یہ مغلوب قوم فی الواقع مغلوب نہیں ہوئی۔ چند دنوں کے بعد ویسی کی ویسی برسر اقتدار آجائے گی اور یہی فلسفہ ہے جس پر آج کل یورپ ترقی کر رہی ہے۔ مثلاً اگر مکہ مکرمہ کی فتح کے بعد ان کے خاندانی رسوم اور میل جول کی عادت ویسی کی ویسی رہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کے طریقے کسبِ رزق کے جو پہلے تھے ویسے ہی رہے (گویا پہلے کی طرح اپنے کفر پر رہے) تو چند دنوں کے بعد ویسے کے ویسے ہوجائیں گے اور پھر بھی مکہ پر قبضہ کرلیں گے بلکہ فاتح جماعت کا اثر بھی نہیں رہے گا۔

* اہل مکہ کی معاشرت اور اقتصادی حالت میں ظلم بھی تھے اور خلاف انسانیت کام تھے۔ تو جب تک ان کی معاشرت اور اقتصادی حالت کی اصلاح نہ کی جائے گی تب تک ان کے مفتوح ہونے پر کبھی اطمینان نہیں ہوسکتا (معاشرت اور اقتصادی حالت کو انگریزی زبان میں سوشل کہتے ہیں) آنحضرت ﷺ کی توجہ ان کی سوشل اصلاح کی طرف تھی چنانچہ اہل مکہ کی بری معاشرت اور بری اقتصادی حالت (سوشل) کا ایک برا نمونہ دکھا کر اس پر بددعا کرنی تھی کہ یہ حالت ان کی نہ رہے بلکہ اصلاح پذیر ہوکر قرآن مجید کی تعلیم پر آجائے۔ یعنی ان کی سوشل حالت ہماری تعلیم کے آگے شکست کھا جائے۔ جیسے اسلام پولیٹیکل (جنگی) حالت سے ان پر غالب ہوا اور وہ شکست کھا گئے۔ ایسے ہی ان کی سوشل حالت بھی شکست کھا جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابولہب پر لعن طعن ہو۔ بلکہ انکی معاشرت اور اقتصادی حالت کو شکست دینے کی بددعا ہے کہ یااللہ ان کی یہ حالت برباد ہوجائے اور اصلاح شدہ حالت ان پر غالب آجائے۔ نمونہ کے لیے اپنے خاندان کو مدنظر رکھا گیا۔ اس سوشل کی شکست تو اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ ان میں ذہنی تبدیلی آجائے۔ انہوں نے جن نظریوں پر اپنی حالت بنا رکھی ہے اور جس فلسفہ پر ان کی سوشل حالت کا مدار تھا وہ بدل جائے(۱) آگے فلسفۂ توحید کا ذکر سورۂ اخلاص میں کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد انسانیت کا زیادہ مطمع نظر نقصان سے بچنے کی طرف ہوتا

---

(۱) اس کا بدلنا اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ نقطۂ توحید پر جس طرح قرآن حکیم کہتا ہے جمع ہوجائیں اور اس نقطۂ توحید سے جو اثرات معاشرت پر پڑتے ہیں ان کو وہ قبول کرلیں۔

ہے اور نفع کمانا تو خود بخود آہی جاتا ہے اور شر سے بچنا یہ انسانیت کا اصلی تقاضا ہے۔ جس جماعت میں یہ نظریہ آجائے تو اس کا کامیاب ہونا یقینی ہے۔ شر سے بچنے کا مضمون سورۃ الفلق میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ من شر ما خلق اور اس کے بعد ہی فلسفہ حب ہے۔ اس حب سے عدل پیدا ہوتا ہے اور یہ سورت الناس میں ہے۔ ذہنیت کی تبدیلی فلسفہ سے ہوتی ہے۔ اور فلسفہ یہ ہے کہ ایک چیز کو مرکز بنالیا جائے اور باقی اشیاء کو اس طرف راجع کردیا جائے اب ان کی ذہنیت کو اس طرح تبدیل کیا جاتا ہے کہ تمام انسانیت کا مالک اللہ تعالی ہے۔ اس کے سوا کوئی شر سے بچانے والا نہیں اور وہی اللہ تعالی محبوب ہے۔ اسی سے محبت رکھنی چاہیے۔ جب اہل مکہ کا فلسفہ بدل جائے گا تو ضرور ان کی سوشل حالت بھی بدل جائے گی اور یہ فتح جو جنگی طاقت سے ان پر ہوئی وہ ہمیشہ کے لیے رہے گی اور قریش جماعت اسلام کی مفتوح ہو گئی۔ مثال کے طور پر لیجیے کہ ہندوستان پر پولیٹیکل فتح مسلمانوں نے حاصل کی مگر ہنود کی معاشرت اور اقتصادی حالت وہی رہی اور ان کا فلسفہ بھی وہی رہا۔ اگرچہ مسلمانوں نے ان پر غلبہ حاصل کرلیا مگر دراصل وہ مغلوب نہ ہوئے ان کی طاقت ویسی کی ویسی رہی۔ آخر انہوں نے مسلمانوں کو شکست دی۔

سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُ اٰيَاتٍ

سورہ اخلاص مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ

تو کہہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ کسی کو جنا

وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا

نہ کسی کو جنا گیا وہ اور نہیں اس کے جوڑ کا

اَحَدٌ ۝۴

کوئی ایک

سورۃ الاخلاص مکیہ

* گذشتہ دونوں سورتوں (اذا جاء نصر اللہ اور تبت یدا ابی لہب) میں ہم نے دیکھا کہ پولیٹیکل طاقت درحقیقت سوشل طاقت سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی سوشل طاقت ذہنی ترقی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک ذہن کو ایک طرف نہ لگا دیا جائے اور اس کی تبدیلی نہ کی جائے تو سوشل تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔ اب جو ذہنی تبدیلی ہے اس کا نام ہے فلسفہ۔ ان تین سورتوں (اخلاص اور معوذتین) میں اسلام کی عقلی فتح ہے۔ پہلے پولیٹیکل اس کے بعد سوشل اور آخر میں عقل۔ اب اس کے بعد انسانیت کے لیے کچھ اور نہیں ہے جس سے انسانیت کی اصلاح کی جائے۔ اسلام کے اصلی عقلی فلسفے کا خلاصہ بیان کرنے سے پہلے ایک عام قاعدہ یعنی تمہید بنانے کی ضرورت ہے۔

* فلسفہ کا حاصل یہ ہے کہ عقل کے سامنے ایک چیز بطور مرکز کے پیش کی جائے اور تمام چیزیں اس میں وابستہ کردی جائیں تو فلسفہ بن جائے گا اور اس سے زیادہ فلسفہ کا مطلب نہیں ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ فلسفے کے مختلف سکول ہوتے ہیں اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تمام فلاسفہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ تمام چیزوں کو ایک مرکز پر جمع کردیں (وہ مرکز جو ان کے خیال میں ہوتا ہے) چنانچہ ایک فلسفی یہ کرتا ہے کہ وہ اپنے خیال کے مطابق اپنے بنائے ہوئے مرکز کے ساتھ تمام چیزوں کا اتصال کردیتا ہے۔ اور اسی طرح فلسفے کے مختلف اسکول بن جاتے ہیں مثال کے طور پر لیجیے کہ فلسفے کے ایک اسکول نے کسی ایسی چیز کو مرکز بنایا ہے کہ عام انسانیت اس کی مرکزیت کو آسانی سے قبول کرلیتی ہے۔ اور پھر تمام چیزوں کو عام فہم طریقہ سے اس مرکز سے وابستہ کیا جاتا ہے تو فلسفی کا وہ اسکول تمام اسکولوں کی بنسبت انسانیت کے لیے زیادہ قابل قبول ہوگا اور فلسفے کے دوسرے اسکولوں کو اس کے مقابلے میں کامیابی کی امید موہوم ہوجائے گی۔ قرآن مجید نے اس سورت کو اسلام کے مرکزی نقطہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

* آیت ۱ قل ھو اللہ احد تمام عقلمند باسانی مانتے ہیں کہ اللہ تعالی ایک ہے

اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ عربی میں جو واحد کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں ایک۔ اس کے مقابلے میں اور لفظ اس مفہوم کے آسکتے ہیں مگر احد کے مقابلہ میں کوئی لفظ آ ہی نہیں سکتا۔ آیت ۲ اللہ الصمد صمد اسے کہتے ہیں جس کی تمام چیزیں محتاج ہوں اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ یہ لفظ پہلے ایسی چٹان یا پہاڑ کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا جس کی پناہ لے کر لشکر والے جنگ کرتے تھے یعنی لشکر کے پیچھے یہ ٹھوس طاقت چٹان یا پہاڑی کی شکل میں ہوتی تاکہ لشکر اس کو اپنی پشت پناہ سمجھ کر میدان جنگ میں بے خوف لڑے اور پیچھے سے خطرہ نہ ہو۔ اس کے بعد صمد کا لفظ اس سردار کے لیے وضع کیا گیا جس کی پناہ میں جانے کے بعد کسی دشمن کا خوف نہیں رہتا اور جہاں تک اس کی زندگی کا تعلق ہے اسے کوئی شخص ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے بعد قرآن مجید نے اس لفظ کو اللہ تعالی کے لیے استعمال کیا کیونکہ اس درجہ پناہ دینا اور کسی دوسری طاقت سے متاثر نہ ہونا صرف اللہ تعالی کی خصوصیت ہے اور کسی دوسری طاقت میں یہ بات نہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یونانی فلاسفہ نے اللہ تعالی کے لیے جو لفظ استعمال کیا اس کا عربی ترجمہ ہے واجب الوجود یعنی جس کی ہستی دوسرے کی محتاج نہیں بلکہ از خود موجود ہے۔ اسی طرح ایرانی فلاسفہ کا لفظ ہے خدا یعنی خود آمدہ۔ اس معنی کو ادا کرنے کے لیے قرآن مجید نے صمد کا لفظ استعمال کیا۔ فلسفیانہ طور پر اس کا ترجمہ ہے واجب الوجود۔ آیت ۳ لم یلد و لم یولد یونانی فلاسفہ کے واجب الوجود سے عقول (عقل اول، عقل دوم، عقل سوم یعنی دس تک) ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی قوتیں خارج ہوئیں۔ یعنی سب سے پہلے اللہ تعالی سے عقول عشرہ جو مثل واجب الوجود کے قدیم ہیں پیدا ہوئیں اگرچہ یہ عقول بھی مادہ سے پاک ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ واجب الوجود سے یہ عقلیں خارج ہوئیں یعنی یہ عقلیں واجب الوجود سے نکلیں۔ اس سے آگے ایک بڑی بھاری غلطی پیدا ہوئی کہ لوگ جس آدمی کو خدا کا بیٹا ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کی روح میں یہ عقلیں گھس گئی ہیں۔ یہ اس لیے خدا کا بیٹا ہے کہ چونکہ عقل اول بلاواسطہ خدا سے پیدا ہوئی اور یہ شخص اس کا اوتار ہے تو اس حیثیت سے اس کو خدا کا بیٹا کہنا مناسب ہے۔ مگر یہ لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ در حقیقت کسی فلسفی کا

یہ مطلب نہیں ہے۔

* اسلامی فلاسفہ ان دس عقول کو خدا کی صفات کے طور پر مانتے ہیں اور وہ سلسلۂ عقلیت کو جسے ایک عقلمند فلسفی قائم کرنا ضروری سمجھتا ہے مسلمان فلسفی اللہ تعالیٰ کی صفات میں پورا کردیتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تمام بڑے فلسفیوں کا مطلب یہی تھا۔ پھر صفات الٰہی سے متعلق اس غلط فہمی کو قرآن مجید نے اس طرح رد کیا کہ نہ تو اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ اس کا کوئی باپ ہے۔ آیت ۴ و لم یکن لہ کفوا احد اس کے جوڑ یا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری چیز میں یہ قابلیت ہی نہیں ہے کہ اس کو تمام چیزوں کا مرکز مان لیا جائے۔ مولوی حمیدالدین صاحب نے اس سورت کو بادشاہ کے دستخط سے تعبیر کیا ہے کہ جس طرح دستخط پہچان کے طور پر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کے لیے اس جگہ چار صفات بیان کردی گئی ہیں۔ اور آئندہ دو سورتیں (معوذتین) اس کی ضمیمہ ہیں۔

* جس طرح سورۃ اللہب سوشل غلبہ کی دلیل ہے اسی طرح سورۃ اخلاص عقلیت کے غلبہ کی دلیل ہے یہ فطری بات ہے کہ پولٹیکل طاقت سوشل طاقت سے پیدا ہوتی ہے اور سوشل طاقت فلسفہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کا فلسفہ اعلیٰ ہوگا اس کی ذہنی قوتیں ضرور تکمیل کے درجے پر پہنچ جائیں گی اور ضرور ان کی معاشرت اور اقتصادی حالت اچھی ہوگی کیونکہ ذہنی قوتوں کا اثر معاشرت اور اقتصاد پر پڑتا ہے۔ اگر سوشل حالت جو ذہنی قوتوں سے پیدا ہوتی ہے اچھی ہوگی تو اس سوشل (یعنی معاشرہ اور اقتصاد کی اچھی حالت) سے جو پولیٹیکل قوت پیدا ہوتی ہے وہ بھی اچھی ہوگی اور غلبہ پورا ہوگا۔

* الحاصل قرآن مجید میں یہ دکھانا منظور تھا کہ قرآن مجید کی فتح ہوئی مگر اس فتح کو پولیٹیکل فتح تک محدود کردینا کافی نہیں ہے اور جن لوگوں نے اسلام کو پولیٹیکل تحریک سمجھا وہ یہی کہتے ہیں کہ اسلام کا دور گذر چکا ہے (کیوں کہ آج کل اسلام کی پولیٹیکل طاقت نہیں رہی)۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ پولیٹیکل تحریک اور اس کی فتح فقط قرآن مجید کی تعلیم کا ایک حصہ ہے۔ اور پولیٹیکل تحریک اور غلبہ کی تہہ میں سوشل طاقت کام کرتی ہے اور جو سوشل پروگرام آج بھی دنیا میں موجود ہے اس پر بھی قرآن مجید کا سوشل

پروگرام فتح مند ہے اور اسلام کے پروگرام کا اس پر بھی غلبہ ہے۔ اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی دنیا بھر میں اسلام (قرآن) سے اچھا سوشل پروگرام کوئی اور نہیں ہے۔ سوشل (معاشرتی و اقتصادی) طاقت ہمیشہ عقلی فلسفہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اسلام کا فلسفہ تمام دنیا کی عقلیت پر غالب ہے۔ اس کے مقابلے پر فلسفے کا کوئی اسکول پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اسلام و انسانیت لازم و ملزوم رہیں گے۔ جب تک دنیا میں انسانیت ہے اس وقت تک اس سطح زمین پر اسلام کا رہنا خود انسانیت کے لیے ضروری ہے۔ اس کو یوں سمجھیے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فلسفہ اچھا ہے مگر سوشل حالت گری ہوئی ہے اور ہندوؤں کا فلسفہ ردی ہے مگر سوشل حالت مسلمانوں کی بنسبت اچھی ہے یعنی ایک حصہ سوشل کا جو مال سے تعلق رکھتا ہے وہ اچھا ہے اب اگر مسلمانوں کی سوشل حالت کی کوئی شخص اصلاح کردے گا تو مسلمانوں کو اسی وقت پولیٹیکل طاقت بھی حاصل ہوجائے گی اور جس قوم کا فلسفہ ردی ہوتا ہے وہ اگر ترقی کرتی ہے تو جلد گر جاتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں میں فقط سوشل حالت کے انقلاب سے بڑا انقلاب ہوسکتا ہے۔ مسئلہ واجب الوجود کو ہم نے درمیان میں چھوڑ دیا تھا اس جگہ اس کی تحقیق کی جاتی ہے۔

* انسان سب سے پہلے تصور کرتا ہے "ہونا" اور "نہ ہونا" یا "وجود" اور "عدم" اور "ہونا" یا "وجود" ایک ہی چیز ہے۔ وجود کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو کبھی معدوم نہیں ہوسکتی اسے "واجب الوجود" کہتے ہیں دوسری وہ ہے کہ معدوم ہوسکتی ہے، اسے "ممکن" کہتے ہیں۔ اسی طرح "نہ ہونا" یا "عدم" کی بھی دو قسمیں ہیں ایک ایسا عدم ہے کہ اسے کبھی وجود کی قسم میں تبدیل کرنا ممکن ہی نہیں۔ اسے ممتنع الوجود (یعنی اس میں کبھی وجود آ ہی نہیں سکتا) کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم ایسی ہے کہ اسکا وجود ہونا ممکن ہے اسے ممکن کہتے ہیں۔ اسی طرح "ہونا" یا "نہ ہونا" کے مسئلہ پر غور کیا جائے تو تین قسمیں پیدا ہوتی ہیں (۱) "واجب الوجود" جس میں کبھی عدم آ ہی نہیں سکتا۔ اور اس کے مقابلے میں (۲) "ممتنع الوجود" جس میں کبھی وجود آ ہی نہیں سکتا اور (۳) "ممکن" ممکن کی دو قسمیں ہیں اور دونوں قسمیں ایک ہی لحاظ میں آتی ہیں یعنی ہر ایسا وجود جو

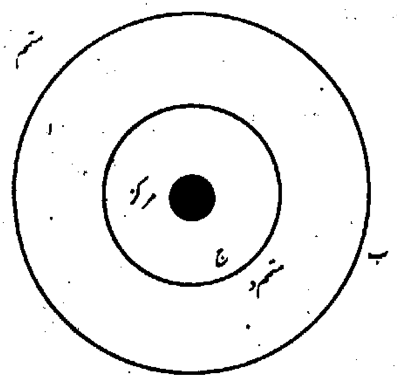
معدوم ہوسکتا ہے اور ہر ایسا معدم جو موجود ہوسکتا ہے۔ ان دونوں قسموں کو "ممکن خاص" کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک "ممکن عام" ہے جس کی عمومی تفسیر کی جاتی ہے کہ ہر ایسی چیز جس کا وجود ممتنع نہ ہو۔ اس میں "واجب الوجود" اور "ممکن خاص" دونوں آجاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا وجود ممتنع تو نہیں ہے۔ ممکن عام کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہر ایسی چیز جس کا وجود ضروری نہ ہو اور فقط اتنی بات ہو تو اس میں "ممتنع" اور "ممکن" دونوں آجاتے ہیں۔ "وجود" اور "عدم" کے متعلق یہ عقلی تقسیم ہے۔ اس سے زیادہ عقل کوئی اور قسم تجویز نہیں کرسکتی۔ اس میں اب "وجود" کا مرکز "واجب الوجود" ہے۔ اور "ممکن الوجود" چیزیں اس کے پرتو سے پیدا ہوں گی۔ "ممتنع الوجود" کا ہم صحیح تصور تک نہیں کرسکتے۔ اس کی ہستی، وجود سے اس قدر دور ہے کہ اس کے تصور کرنے کے لیے ہم چند فرضی چیزوں کے آلے بنالیتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک ادھورا سا خیال دماغ میں بٹھا کر احکام جاری کرتے ہیں۔

* ممکن الوجود کی جو چیزیں ہیں ان کی تقسیم اور ہے ایک ایسا بھی ممکن الوجود ہے جس کے وجود کی ابتدا اور انتہا نہیں۔ اگرچہ وجود ان کو واجب الوجود کے فیض سے ملا ہے اور دوسری ممکن چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی ابتدا اور انتہا بھی ہے کہ پہلے نہیں تھیں پھر ہوگئیں اور پھر نابود ہوگئیں۔ وغیرہ یہ مسئلہ بھی فلسفہ میں ایک طرح پر طے شدہ ہے کہ جس کی ابتدا نہیں اس کی انتہا نہیں ہوسکتی اور جس کی انتہا ہے اس کی ابتدا ضرور ہوگی۔ "واجب الوجود" کے عوض قرآن مجید نے لفظ صمد لیا ہے۔ چونکہ واجب الوجود کا سمجھنا ایک خاص علمی اصطلاح پر مبنی تھا اس لیے عام لوگ اس کے مخاطب نہیں ہوسکتے۔ اس لیے لغت میں سے ایک لفظ چھانٹ لیا گیا ہے جس کے اندر واجب الوجود کے معنی خود بخود آجاتے ہیں۔ یونانی فلاسفہ کہتے ہیں کہ جب ایک چیز کی حقیقت سمجھنی منظور ہو تو ارسطو نے اس کے متعلق دس سوال مقرر کردیے ہیں کہ یہ دس سوال دریافت کرلو اس کے بعد اس کی حقیقت واضح ہوجائے گی۔ ان کے نام ہیں "مقولات عشرہ یعنی (۱) وضع (مکان کی شکل سے نسبت ہے اور مکان سے اونچی چیز ہے۔ پہلا آسمان ہے اس کے اوپر دوسرا آسمان ہے حتی کہ سب سے آخری آسمان ہے اس کا

جو اوپر کا حصہ ہے اسے وضع کہتے ہیں) (۲) این (کہاں ہے) (۳) متی (کب سے ہے) (۴) کیف (کیسا ہے) (۵) کم (کتنا ہے) (٦) الجوہر (قائم بالذات یعنی جو اپنے پر قائم ہے) (۷) الاضافہ (دوسرے سے کیا نسبت) (۸) الملک (مثلاً کپڑا اور قمیص کسی کی ملکیت ہے) (۹) الفعل (دوسری چیز میں اثر کرنا (۱۰) الانفعال (دوسری چیز سے اثر قبول کرنا) جب ان دسوں کے جواب مل جائیں تو پھر اس چیز کو متعین کہا جاسکتا ہے۔ اس کا نام ہے مقولات عشرہ۔ سوال اس طرح ہوگا، ہو، پھر این ہو، پھر متی ہو، علیٰ ہذا القیاس۔ اب دس عقلوں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

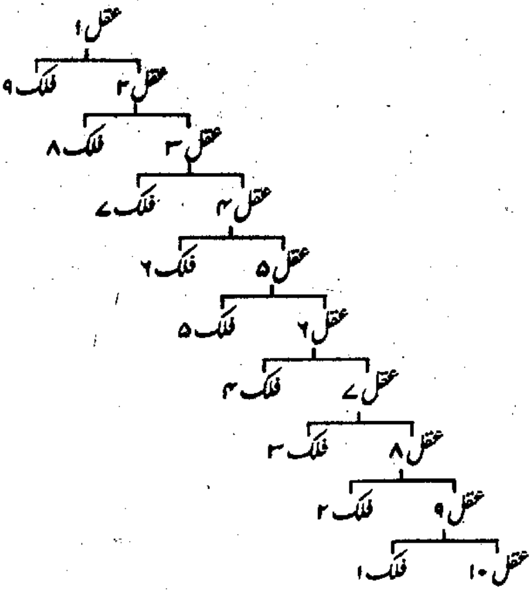
* سب سے اول واجب الوجود سے جو صادر ہوگا اس کو "صادر اول" کہتے ہیں یعنی ظاہر ہوئی۔ ایک چیز جو چھپی ہوئی تھی وہ ظاہر ہو گئی۔ واجب الوجود میں سارے کا سارا وجود محفوظ ہے۔ اس کا کوئی حصہ ظاہر ہوجائے گا تو پھر اس کا اپنے موقع پر جانا ضروری ہے۔ واجب الوجود سے باہر وجود کا ایک ذرہ بھی نہیں ملتا۔ اس لیے وجود کو یوں کہنا پڑے گا کہ وہ واجب الوجود سے صادر یعنی ظاہر ہوا۔ تو سب سے پہلی چیز جو ظاہر ہوتی ہے وہ نور محض ہے اور وجود کے جتنے حصے واجب الوجود سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صادر ہوتے رہیں گے وہ سب اسی صادر اول (نور محض) سے ظاہر ہوں گے۔ یعنی اب آئندہ تمام چیزیں اس صادر اول کے وسیلہ سے ظاہر ہوں گی۔ اور واجب الوجود سے براہ راست ظاہر نہیں ہوں گی۔ اس کو عقل اول کہا جاتا ہے۔ یہ ظلمت اور جسمانیات سے پاک ہے اس لیے اس کے لیے عقل کے سوا کوئی اور لفظ مناسب نہیں ہوسکتا۔ صادر اول (نور محض) کے مسئلہ میں دنیا کا کوئی عقلمند اختلاف نہیں رکھتا۔ تمام عقلمند اس کو اسی طرح مانتے ہیں اگر کسی کا اختلاف ہوتا ہے تو صرف نام کا اختلاف ہوتا ہے۔ کسی عقلمند نے اس کا نام صادر اول رکھا دیا ہے اور کسی نے کچھ اور۔ (ہندو فلسفے میں اس کا جو نام ہے وہ اپنی جگہ بیان ہوگا) ورنہ حقیقت میں یعنی معنی کے لحاظ سے سب متفق ہیں۔ اس عقل اول کے بعد یونانی فلاسفہ نے جس طرح خاکہ کھینچا ہے اس پر تمام فلاسفہ کی موافقت ضروری نہیں ہے۔ یونانی فلاسفہ کو ستاروں اور آسمان کی رصد گاہ قائم کرنے میں سات سیارے معلوم ہوئے جو باقاعدہ حرکت کرتے ہیں۔ (۱) سورج (۲) چاند (۳)

زہرہ (۴) مشتری (۵) زحل (۶) مریخ (۷) عطارد۔ پھر ایک سیارہ دوسرے کو چھپالیتا ہے جسے ہبوط کہتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ان کے مدارج مقرر کیے ہیں کہ سب سے پہلے چاند ہے اور سب سے آخر میں زحل ہے۔ ان کی حرکتیں باقاعدہ کرنے کے لیے ان کا تخیل اس طرح پر ہے کہ ایک شفاف گول کرہ ہے اور اس میں ایک ایک سیارہ ٹھونسا ہوا ہے۔ یعنی اس گول شفاف کرے کے اندر ایک ایک سیارہ قائم کردیا گیا ہے۔ ان کے ابتدائی نظریات میں یہ مقرر ہے کہ گول کرہ کے سوا باقاعدہ حرکت اور کوئی نہیں کرسکتا۔ کرہ اپنے مرکز پر ایک ہی قاعدہ سے متحرک رہ سکتا ہے۔ چونکہ یہ کرے ایک دوسرے کی نظر کو روکتے نہیں اور پردہ نہیں بنتے اس لیے ان کو شفاف مانا گیا ہے۔ اور چونکہ ان سیاروں کی حرکتیں گول نہیں ہوتیں اس لیے ہر کرہ کے اندر ٹیڑھے کرے اور فرض کرنے پڑے۔ اور اس طرح ان کی حرکتوں کو باقاعدہ بنادیا گیا ہے، کہ مرکز ایک ہی رہے گا جس پر وہ حرکت کررہے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے سات فلک مانے۔ فلک کہتے ہیں چرخے کے اس گول حصے کو جو مٹی کے پھرانے سے پھرتا ہے۔



ب بڑا گول شفاف کرہ۔ د کرہ گول شفاف۔ ج یہ حصہ ٹیڑھا کرہ ہے اور حرکت کو باقاعدہ بنانے کے لیے بنانا پڑا ہے۔ الف اس کا ٹیڑھا حصہ یعنی ٹیڑھا کرہ جو حرکت کو باقاعدہ بنانے کے لیے بنانا پڑا۔

* غرض یونانی فلاسفہ نے دیکھا کہ بہت سے چمکنے والے ستارے اکٹھے حرکت کرتے دکھلائی دیتے ہیں تو ان کو انہوں نے ثوابت کیا یعنی ایک جگہ ٹھونسے ہوئے۔ وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں اور حرکت نہیں کرتے۔ ان سات سیاروں کے علاوہ جس قدر چمکنے والے ستارے ہیں وہ ثوابت ہیں اور وہ ایک فلک میں ٹھونسے (گاڑے) ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس طرح آٹھ فلک فرض کرکے ان ثوابت اور سیاروں کی خصوصی حرکتوں کو باقاعدہ کردیا۔ اب ایک چیز باقی رہ گئی کہ یہ دن رات کیسے ہوتے ہیں کہ ۲۴ گھنٹے میں یہ تمام سیارے اس چکر میں پھر جاتے ہیں اس کے لیے ان کو ۹ فلک ثابت کرنے پڑے ان کو "فلک اطلس" کہتے ہیں اور ان میں کوئی سیارہ نہیں ہے۔ تو اس طرح نو فلک مان کر انہوں نے موسموں اور دن رات کا صحیح نمونہ بنالیا اور اپنا علم ہیئت مکمل کرلیا۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد ان کا ایک نیا نظریہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل اول سے دو چیزیں نکلیں (۱) عقل ثانی اور (۲) نواں فلک۔ یعنی یہ دونوں عقل اول سے نکلے۔ باقی عقول اور فلک ان سے اسی طرح بتدریج نکلتے گئے۔



* فلک نمبر ایک اور عقل نمبر دس کے نیچے عناصر ہیں اور ان کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے جسے اربعہ عناصر کہتے ہیں۔ (۱) ہوا (۲) آگ (۳) پانی (۴) مٹی یہ عقل نمبر ۱۰ نے پیدا کیے۔ غرض ان اربعہ عناصر کا مشترکہ مادہ عقل نمبر ۱۰ سے پیدا ہوا۔ اسی پر فلکوں کی حرکتوں کا اثر پیدا ہوا اور اس پر مختلف رنگ پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اس رنگ کو صورت کہتے ہیں جو مادہ کا خاص رنگ ہے کر ایک مخلوق بن جاتی ہے۔ سب سے پہلے چار صورتیں ظاہر ہوئیں جن کا نام اربعہ عناصر ہے۔ پھر انہی کی ترکیب سے معدنیات، نباتات، حیوانات اور انسان پیدا ہوئے(۱)۔

* یونانی فلسفہ یوں تو بنی امیہ کے زمانے ہی سے آہستہ آہستہ عربی میں داخل ہونے لگا تھا اور خاص خاص لوگ اس سے آشنا تھے لیکن خلیفہ مامون کے زمانے سے مستقل طور پر عربی میں منتقل ہوا۔ اور اسی خلیفہ کے زمانے میں عربی تراجم کی وجہ سے اس کا عام رواج ہوا۔ اور اسی زمانے سے مذہبی عالم اور حکیم دو حصوں میں بٹ گئے۔ اس سے پہلے فقط ایک نام تھا جو سمجھدار ہوتا وہ فقیہ کہلاتا اور عام آدمی غیر فقیہ کہلاتے۔ ہمارے مفسرین نے دیکھا کہ قرآن مجید میں سات آسمانوں، ایک کرسی اور ایک عرش کا ذکر ہے تو حکمائے یونان کی طرح جنہوں نے نو فلک قرار دیے تھے انہوں نے بھی سات آسمان ایک کرسی اور ایک عرش ملا کر نو آسمان بنا دیے۔ یہ قرآن مجید کی غلط تفسیر ہے۔ اس قسم کا ایک اور غلط استعمال ہوا وہ یہ کہ یونانی فلاسفہ نے چونکہ ہر فلک کو بارہ حصوں (ٹکڑوں) میں تقسیم کر رکھا ہے اور وہ ہر ایک حصہ کو بارہ برج کہتے ہیں تو قرآن مجید میں لفظ بروج (والسماء ذات البروج) کو بھی ہمارے مفسرین یونانی اصطلاح میں لے آئے۔ یہ دوسری غلطی ہے۔ یونانی فلاسفہ کا یہ نظریہ ہے کہ عقول اور افلاک کے لیے ابتداء اور انتہاء نہیں ہے۔ یہ اگرچہ ممکن چیزیں ہیں مگر قدیم ہیں ان کا یہی نظریہ ہے۔ اس نظریہ کو ماننے کے بعد جسمانی حشر اور جسموں کا جنت اور دوزخ میں جانا ممکن نہیں

---

(۱) مجلس میں جب ادنی درجے کے شاگرد موجود تھے تو مولانا نے تنزلاً یہ تقریر فرمائی اور میں تو:

آنچہ استادِ ازل گفت ہمہ می گویم

رہ جاتا۔ اسی زمین پر ایک ٹکڑے کا نام جنت اور دوزخ رکھ دیا جائے تو یہ قرآن مجید کی غلط تفسیر ہوگی اور افلاک پر جنت ماننا اور افلاک کے نیچے دوزخ ماننا یہ اس نظریے کے ماتحت معقول ہو ہی نہیں سکتا اس قسم کی پیچیدگیوں نے مسلمان حکماء کا ایک ایسا طبقہ پیدا کردیا جو یونانی فلاسفہ کے ان نظریات کو پوری طرح تسلیم نہیں کرتا وہ صرف بنیادی چیزیں مان لیتے ہیں مگر جس شکل سے یونانی فلاسفہ ان کی تفسیر کرتے ہیں مسلمان حکماء ان کو نہیں مانتے۔ امام غزالی اس قسم کے حکماء کے ایک بہت بڑے پیشوا ہیں مگر بدقسمتی سے امام غزالی بھی یونانی نظریہ کے مقابل کوئی مکمل نظریہ پیش نہیں کرسکے۔ اس لیے مسلمان حکماء کی رائیں بھی کوئی صحیح قواعد پر مکمل نہیں ہوسکیں۔ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ عقل اول کے ماننے میں کوئی فلسفی اختلاف نہیں کرتا مگر یونانی اس کے بعد نو عقول مانتے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کی حقیقت کا نظریہ نو افلاک پر مرتب ہوتا تھا۔ اگر ان میں کوئی ایسا عالم پیدا ہوجائے جو نویں فلک سے زیادہ ماننے پر مجبور ہوجائے تو وہ لازمی طور پر عقول بھی اسی قدر زیادہ مانے گا۔ مطلب یہ ہے کہ عقول کی تعداد کسی عقلی تقاضا سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ آسمانوں کی ایسی ہیئت معین کرنے کے بعد ہی ایسا خیال پیدا ہوا۔

* ہندوستان اس مسئلہ میں کسی سے کم نہیں تھا۔ افلاطون کہتا ہے کہ ہماری ریاضی ہندیوں کے سوا اور کوئی جان ہی نہیں سکتا۔ آسمان کی اس ہیئت کے متعلق ہندوستانی نظریہ بالکل نیا ہے۔ اسے وہ ایک ایسا نورانی لطیف جسم مانتے ہیں جسے آکاش کہتے ہیں جو ہوا سے زیادہ لطیف اور سورج سے زیادہ نورانی ہے اور یہ عقل اول کا فیض ہے جو آکاش کو پیدا کیا ہے۔ آکاش میں یہ تمام سیارے تیر رہے ہیں اور اس آکاش کی قوت کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ باقاعدہ حرکت نہیں کرتے۔ نو افلاک تو الگ رہے انہیں ایک فلک کو ماننے کی بھی ضرورت نہیں ہے اور وہ کسی فلک کو نہیں مانتے۔ ہر متحرک چیز کے ساتھ وہ اس کی ایک خاص روح مانتے ہیں اور یہ کہ اس روح کے ذریعہ سے عقل اول کا فیض اس جسم تک پہنچتا رہتا ہے۔ اس کے بعد ہندو فلاسفہ نے بھی اس فضا کو جسے آکاش کہتے ہیں سات سیاروں کی طرح سات حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ فضا کے ایک

طبقہ کو آسمان کہتے ہیں یہ ہندی فلسفہ یا ہندی حکماء کی حکمت قدیم زمانے سے لے کر آج تک چلی آتی ہے۔

* ایران دونوں فلسفوں (یونانی و ہندوستانی) کا مجموعہ تھا۔ قدیم زمانے میں اہل عرب یونانی فلسفے کی بنسبت ہندی فلسفے کی طرف زیادہ مائل تھے۔ امام غزالی کے بعد ایران میں ایسے عالم پیدا ہوئے جو اس ہندی فلسفہ کو جس کے ساتھ ایرانیوں کا بھی ایک حصہ موافق تھا خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ انہوں نے ارسطو کے فلسفہ کو رد کر کے اس کی جگہ اسلامی تشریحات کے لیے ہندوستانی فلسفہ (یا اسے ایرانی فلسفہ سمجھیے ایک ہی بات ہے) کو پیش کر دیا۔ اس میں ایک مشہور شخص شہاب الدین سہروردی مقتول تھے۔ یہ حکیم سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں گذرے ہیں۔ یہ ایک بڑے حکیم تھے اور ایرانی فلسفہ خوب جانتے تھے۔ انہیں نے اسلامی تعلیمات کی تشریح ایرانی فلسفے کے مطابق کرنی شروع کی۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ مامون الرشید کے زمانے سے لے کر اس زمانے تک جو علم الکلام مسلمانوں میں مرتب ہوچکا تھا وہ ان نظریات کے مطابق تھا جو ارسطو وغیرہ کے نظریے تھے۔ یعنی انکا علم الکلام شہاب الدین کے نظریات سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ شہاب الدین کے نظریات کے تحت اسلامی تعلیمات بہت وضاحت سے سمجھ میں آسکتی تھیں۔ جن مسائل کو متکلم حل نہیں کرسکتے تھے یہ نہایت آسانی سے ان کو حل کردیتے۔ مگر بد قسمتی سے سلطان صلاح الدین اس پہلے یونانی فلسفے پر جس پر مسلمانوں نے اپنی عمارت کھڑی کی تھی شرعی طور پر عقیدہ رکھتا تھا۔ اس لیے علماء نے سلطان صلاح الدین کو سمجھایا کہ شہاب الدین اسلام کی تردید کرتا ہے۔ اس واسطے انہیں قتل کردیا گیا۔ اس کے بعد ہلاکو کا بغداد پر حملہ ہوا۔ اس زمانے میں اس کا وزیر نصیر الدین طوسی تھا جو مذہبا شیعہ تھا اور ارسطو کے فلسفہ کا معتقد تھا۔ ابن سینا جو ارسطو کے فلسفے کا اچھا شارح ہے اس کے فلسفے کا معتقد تھا۔ ہلاکو کی سلطنت کے ساتھ ساتھ نصیر الدین طوسی کا علمی عروج انتہا تک پہنچا۔ اب علماء اور حکماء اہل سنت والجماعت بہت پریشان ہوئے کہ اگر وہ ارسطو کے فلسفے کو رواج دیتے ہیں تو اس کے اندر شیعہ پن رواج پاتا ہے۔ نصیر الدین طوسی کا شاگرد علامہ قطب الدین شیرازی ہے۔

اس نے شہاب الدین کے فلسفے کو دوبارہ زندہ کردیا۔ شہاب الدین مقتول کا فلسفہ جو دراصل ہندوستانی فلسفہ تھا قطب الدین شیرازی کی تشریح کے بعد علماء میں بہت مقبول ہوگیا۔ علماء کو سب سے زیادہ فائدہ یہ ملتا تھا کہ اس سے انسان شیعہ نہیں بنتا تھا۔ ایرانی حکماء اس زمانہ میں قدیم ایران پر فخر کرتے تھے اور ان کا مقابلہ تاتار سے تھا۔ اس واسطے تاتار کے مقابلہ میں ایرانی حکماء میں نیشنلزم پیدا ہوگئی جو پہلے دبی ہوئی چیز تھی۔ یہ پہلے اسلام سے مقابلہ نہیں کرسکتے تھے مگر اب وہ زور پکڑ گئے۔ اس کی تاثیر سے شہاب الدین مقتول کا فلسفہ (جسے ہندوستانی یا ایرانی نام سے تعبیر کیجیے) زیادہ پھیل گیا۔

* علامہ قطب الدین شیرازی کے بعد اس فلسفہ کا سب سے بڑا علمبردار جلال الدین دوانی ہے جو شیراز کا ایک زبردست عالم تھا۔ جلال الدین دوانی کا شاگرد میر فتح اللہ شیرازی ہے جو اکبر بادشاہ کا نورتن تھا۔ یعنی ایک واسطے سے وہ جلال الدین دوانی کے شاگرد کا شاگرد ہے۔ اسی طرح شیخ مبارک (ابوالفضل اور فیضی کا باپ) جلال الدین دوانی کے دوسرے شاگرد کا شاگرد ہے۔ میر فتح اللہ اور شیخ مبارک نے جب شہاب الدین مقتول کے فلسفہ پر نظر ڈالی اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندوؤں کا فلسفہ دیکھا تو انہیں علم ہوا کہ وہ یونانی فلسفہ کے زمانہ میں ایک نہر کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور اب ہندوؤں کے فلسفے کے زمانے میں ایک سمندر کے کنارے پر تھے۔ اکبری دربار کے انقلاب کی یہی روح تھی۔ اس فلسفہ کے رواج سے ہندوستان میں مذہبی قوت کو جس قدر صدمہ پہنچ سکتا تھا پہنچا۔ اور امام ربانی رحمہ اللہ نے اس کی تلافی کردی۔ اور اس صدمہ سے ہم کو بچالیا۔ امام ربانی کی زیادہ تر توجہ اشراق (کشف) سے متعلق ہے۔ اشراق کا مطلب ہے طلوع نور جو مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور یہی مطلب کشف کا ہے۔ امام ربانی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں میں ایسے فاضل پیدا ہوئے جو یونانی اور ہندوستانی فلسفہ اور امام غزالی رحمہ اللہ اور جلال الدین دوانی کی تحقیقات اسلامیہ کے ماہر تھے۔ اس جماعت کے علمبردار بعد میں شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنا اسلامی فلسفہ مکمل کرلیا جس میں بعض چیزیں ارسطو کی باقی رہ گئیں اور باقی چیزیں ایرانیوں سے لیں اور بعض چیزیں ہندو فلسفے سے اخذ کرلیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب قدس

سرہ العزیز کہ میں دینی علوم کے جہت بڑے ماہر تھے اس لیے وہ ہر جزوی مسئلہ کو تفصیل سے بیان کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کے ہاں افلاک کا نظریہ باقی نہیں رہا۔ ان کے ذہن کو ہندی اور یونانی فلسفہ زیادہ اپیل کرتا ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم نے ستاروں کو قرآن کے ترجمہ میں "تیرتا ہوا" ذکر کیا ہے۔

* شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کے زمانہ کے بعد ہندوستان کا یورپین سائنس سے تعارف ہوا۔ اس حملہ کی برداشت فقط شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفہ میں تھی مگر بد قسمتی سے جس طرح مسلمانوں کی سیاست بکھر گئی تھی اسی طرح ان کی علمی قوت بھی پریشان (منتشر) ہو چکی تھی۔ اس واسطے وہ ایک راستہ سے جلدی سے سیدھے نہیں چل سکے۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے امام غزالی رحمہ اللہ تعالی کے فلسفہ سے کام لینا شروع کیا۔ ان رحمہ اللہ تعالی کے فلسفے میں ان کو بہت سی ایسی چیزیں ملیں جن کا چھوڑنا ضروری تھا۔ اس کے عوض وہ یورپین فلاسفی کی نئی چیزیں پیش کر سکتے تھے۔ اس سے عام مذہبی طبقہ بھڑک اٹھا۔ جس طرح سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں ہوا تھا یعنی ایک طرح کا جمود پیدا ہوا تھا۔ نئی تحریک سے پہلے سرسید کی اوائلی تعلیم و تربیت شاہ ولی اللہ کے اسکول میں ہوئی۔ سرسید نے (۱) شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین (جو شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے) سے تعلیم حاصل کی۔ اور (۲) مولانا مملوک علی صاحب سے بھی جو مولانا رشید الدین کشمیری پرنسپل عربک کالج دھلی کے شاگرد تھے۔ پھر (۳) عقلی اور ادبی فنون شاہ رفیع الدین سے حاصل کیے جو شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولانا رشید الدین صاحب کشمیری کو شاہ عبدالعزیز نے خاص طور پر تربیت دی تھی۔ اور انہوں نے اسی طرح مولانا مملوک علی کو تیار کیا تھا۔ مگر سرسید کے تمام ساتھی اس اسکول کے نہیں ہیں۔ جس قدر فرصت ایک نئے فلاسفر کو ایک نیا نظریہ سوچنے کے لیے ملنی چاہیے ہمارا خیال ہے کہ سیاسی جھمیلوں کی وجہ سے سرسید کے لیے ممکن نہیں تھی۔ اگر سید محمود کی زندگی دوسرے طریقہ سے نکمی نہ بنادی جاتی تو ہمارا خیال ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں صحیح اور بہترین فلاسفر ہوتے اور یورپ کے سامنے اسلام کو پیش کرنے کی ان میں سب سے زیادہ قابلیت ہوتی۔ انہیں چند اسلامی مسائل پر غور

کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے اپنے والد کی تمام خامیاں دور کر دیں اور جس عالم نے ان کی بات سنی وہ عش عش کرنے لگا۔

* مولوی عبدالحق صاحب دہلوی (مفسر حقانی) ایک دفعہ سرسید کے ہاں مہمان تھے۔ سرسید ان کو جب کالج کی عمارت دکھلا کر واپس کمرے میں لائے تو سرسید نے کہا مولانا! یہ عمارت آپ کو رو رہی ہے (یعنی آپ کے جھگڑوں کے سبب ناقص رہ گئی ہے) تو مولانا عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ اس قسم کا یورپین فلسفہ مسلمانوں کے سامنے پیش نہ کرتے تو مسلمان آپ کو یہ کالج سونے کا بنا دیتے۔ اس وقت سید محمود صاحب نے جو دوسرے کمرے میں تھے یہ بات سنی تو آ کر کہا کہ مولانا میں ان مسائل میں اپنے والد کے ساتھ نہیں ہوں۔ مگر افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ سید محمود نے اسلامی فقہ پر جو تھوڑا بہت لکھا ہے وہ ایک بہترین نمونہ ہے۔ سرسید کے زمانہ میں شاہ ولی اللہ کے پسماندہ لوگوں میں ایک حکیم پیدا ہوئے جن کا نام مولانا محمد قاسم قدس سرہ العزیز تھا۔ وہ مدرسہ دیوبند کے بانی اور علوم اسلامیہ کے از سر نو اشاعت کرنے والے تھے لیکن آپ کے دماغ میں سیاسی مخالفت کی تلخی نے گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ آپ یورپین سائنس پر غور کرتے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ آپ شاہ ولی اللہ صاحب کے اسکول کے بہترین ترجمان تھے اور آپ نے اپنے شاگردوں کی ایک کافی تعداد چھوڑی۔ آج ہندوستان کی مذہبی علمی قوت کا اچھا بقیہ وہی لوگ ہیں جو اپنے آپ کو شاہ ولی اللہ صاحب سے مربوط جانتے ہیں۔

سُورَةُ الْفَلَقِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

سورۂ فلق مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾

تو کہہ میں پناہ میں آیا صبح کے رب کی ہر چیز کی بدی سے جو اس نے بنائی

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ وَمِنْ شَرِّ

اور بدی سے اندھیرے کی جب سمٹ آئے اور بدی سے

النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ﴿۴﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ

عورتوں کی جو گرہوں میں پھونک ماریں اور بدی سے برا چاہنے والے کی

اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

جب لگے ٹوک لگانے

سورۃ الفلق مکیہ او مدنیہ

* سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی یہ تفسیر حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہ العزیز کی تقریر کا خلاصہ ہے۔ یہ تفسیر مولانا شبیر احمد صاحب نے حاشیہ ترجمہ مولانا شیخ الہند قدس سرہ العزیز پر لکھ دی ہے۔ فلسفہ کا اہم حصہ یہ ہے کہ تمام کائنات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اس کے متعلق اس سورت میں بحث ہے۔ یعنی تمام مخلوقات کو ایک مرکز سے ربط دے دینا اس سورت میں بتلایا گیا ہے۔ یہ ایک فطری بحث ہے کہ تمام کائنات میں انسان اپنی ضرورت کے مطابق ان چیزوں کے متعلق غور کرتا ہے اور اس سے زیادہ اس میں دماغی قوت ہی نہیں یعنی جن چیزوں کی اسے ضرورت ہے ان ہی کے متعلق وہ غور کرتا ہے اور باقی کے متعلق نہیں کرتا۔ کیونکہ انسان میں یہ فطری تقاضا ہے کہ پہلے وہ شر سے بچنے کی تجویزیں سوچتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس چیز کا میں تم کو حکم دوں تم اپنی توفیق طاقت اور استطاعت کے موافق اطاعت کرو اور جس سے میں منع کروں اس سے بالکل ہٹ جاؤ کیونکہ ضرر دینے والی اشیاء سے بچنا ضروری ہے۔ جب شر سے بچ گیا تو آگے منفعت کے ہزاروں دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ گویا یہ سورت فلسفہ وحدت الوجود کا تتمہ ہے جو سورہ الاخلاص میں تھا۔

* آیت ۱ **قل اعوذ برب الفلق** چیر کر پیدا کرنے والے کی پناہ میں آتا ہوں۔ تمام مخلوقات ایک دوسرے سے چیر کر پیدا ہوتی ہے۔ چیر کر پیدا کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس کی پناہ میں آتے ہیں کہ دنیا کی کوئی چیز ہمیں ضرر نہ پہنچائے۔ ہر چیز کے اول درجہ کا فائدہ یہی ہے کہ اس سے ضرر نہ پہنچے۔ مادہ جب مرکب ہوتا ہے تو اس کے لیے صورت لازمی ہے اور وہ تیسری چیز بن جاتی ہے۔ یعنی مادہ و صورت مل کر تیسری چیز بن جاتی ہے یہ خلق ہے۔ آیت ۲ تا ۴ **من شر ماخلق و من شر غاسق اذا وقب.** الآیات مخلوقات کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان آیات میں ایک ایک حصہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر اتنے مشکل مضمون کو آسان کرنے

کے لیے انسان کو نبات فرض کرلیا گیا ہے۔ جیسے آم یا کھجور کا درخت۔ جب انسان کو نبات کی حیثیت میں فرض کرلیا گیا تو اب یہ بتلانا مقصود ہے کہ اسے کون سی چیزیں نقصان پہنچاتی ہیں۔ ان پر اب درجہ وار بحث ہوگی۔

* درخت کے لیے سب سے پہلے وہ چیز نقصان دہ ہے جو سبزہ (نباتات) کو کھاجائے یعنی اس چیز کو اس سبزہ کے کھانے سے فائدہ ہو اور نباتات کو نقصان ہو۔ سبزہ خور جانور نباتات کو اس غرض سے نہیں کھاتے کہ نبات (سبزہ) کو نقصان پہنچائیں بلکہ اس واسطے کھاتے ہیں کہ ان کی ضرورت اس سبزے سے پوری ہوتی ہے۔ اسی واسطے کاشتکار کھیتی کے ارد گرد باڑ بنالیتے ہیں تاکہ سبزہ خور جانور سبزہ نہ کھاسکیں۔ من شر ماخلق اس آیت میں ارشاد ہے کہ ہر اس چیز سے جو شر سے پیدا کی گئی ہے۔ عربی ترکیب اگر اس طرح کی ہو جس طرح اس آیت میں ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس کی پیدائش کا تقاضا ہے کہ ہمیں ضرر پہنچائے جیسے سانپ، بچھو وغیرہ۔ اس قسم کی تمام مخلوقات کے شر سے ہم اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ و من شر غاسق اذا وقب ڈوبنے والی چیز جس سے تاریکی پیدا ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چاند کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ ہے غاسق۔ اس سے اشارہ ہے تمام ایسی قوتوں کی طرف جن کے نہ ہونے سے ہمیں ضرر پہنچے۔ جیسے نباتات کو پانی یا غذا نہ ملے تو وہ سوکھ جاتے ہیں اور چاند کی روشنی نباتات کو ایک طرح کی زندگی بخشتی ہے تو جب یہ کم ہوجائے گی تو زندگی کا ذریعہ نہ ہونے سے نباتات کو ضرر پہنچے گا۔ اسی طرح ہماری ضروریات زندگی نہ ہونے سے جتنے ضرر ہمیں پہنچ سکتے ہیں ان سے بھاگ کر ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں کہ وہ ہمیں ان ضرروں سے بچائے اور ہماری زندگی کی جس قدر ضروریات ہیں انہیں ہمارے لیے مہیا کردے۔

* آیت ۴ و من شر النفاثات فی العقد (۱) اور ہمیں ان جماعتوں

(۱) نباتات یا اشجار جب دو پتی ہوتے ہیں تو اس جگہ گرہ ہوتی ہے، پھر اشجار میں جہاں شاخ نکلتی ہے وہاں گرہ ہوتی ہے تو ان گرہوں کے زور اور طاقت سے پانی صاف ہوکر اوپر جاتا ہے اور پھر وہ بار آور ہوتے ہیں۔ انسان کے اعتقادات بھی اسی طرح ہیں۔ اگر ان اعتقادات میں کسی کی نفث

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے شر سے بچا جو پھونک مار مار کر عقلی عقیدے کو کمزور کر دیتے ہیں۔ ہمارے مفسرین یہاں کئی روایتیں لکھ دیتے ہیں جن کی صحت کے متعلق ہمیں اس جگہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر ان سے جو نتیجہ وہ نکالتے ہیں وہ قرآن مجید سے ربط نہیں کھاتا۔ جیسے ایک عورت جادوگرنی فرض کرلی جاتی ہے (بقول ان کی روایت کے) کہ وہ اپنی بیٹوں سے جادو کراتی ہے اور اب قرآن مجید میں اس کے شر سے پناہ مانگی جارہی ہے۔ اس کی اس قسم کی تاویل اگرچہ ہوسکتی ہے کہ اس کا آیت سے تعلق پیدا کردیا جائے مگر ہمارا ترجمہ بہت صاف ہے۔ اس آیت سے جادوگرنیاں مراد لینا قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور یہ قرآن یا نبوت کی شان کے خلاف بھی ہے۔ ہم عورتوں کی جگہ جماعتوں کو لیتے ہیں اور جماعت کو عربی میں مؤنث کے صیغے میں لیا جاتا ہے یعنی ان جماعتوں کے شر سے پناہ مانگی جاتی ہے جو اپنے غلط پروپیگنڈے سے انسان کی فطری ترقی کو روکتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان میں پروپیگنڈے کیا گیا کہ یورپین اقوام بہت بڑی چیز ہیں اور ہندوستانی ان کا کبھی مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اس غلط پروپیگنڈے نے ہماری ذہنیت برباد کردی۔ ہماری کمر توڑدی اور ہمیں پست ہمت بنادیا۔ حتیٰ کہ ہم اپنی ہستی کو بھول گئے۔ اس کی مثال حام نباتات میں ایسی ہوگی جیسے اوپر سے برف گر رہی ہو۔ اس طرح کا جو پروپیگنڈا ہوتا ہے اسے عربی میں جادو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی تندرست ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ کام نہیں کرسکتا حالانکہ وہ کام اسکی طاقت کے اندر ہے۔ اس حالت کو عربی میں جادو سے تعبیر کی جائے گا کہ اس پر سحر ہوگیا ہے اور پروپیگنڈے کا یہ ادنی کرشمہ ہے کہ وہ صرف ایک آدمی ہی نہیں بلکہ قوموں کی قومیں سمجھنے لگ جاتی ہیں۔ کہ ہم کچھ نہیں کرسکتے حالانکہ وہ سب کچھ کرسکتی ہیں۔ تو ایسی تمام طاقتیں جو باہر سے اثر ڈال کر ہماری ترقی کو روک دیں ہم ان کے ضرر سے خدا کی پناہ میں آتے ہیں۔ گندم کے کھیت میں جو عقدہ ہوتا ہے وہ اچھا

(بقیہ حاشیہ)

سے خرابی آجائے تو اس کی تمام ترقی بند ہوجاتی ہے **حبطت اعمالهم** اعمال کے وزن، ثقل اور عفت کی بنا اعتقادات پر ہیں۔ بغیر اعتقاد کے عمل **هباء منثورا** ہیں۔ **انما الاعمال بالنيات**۔

پانی جمع کر کے آگے پہنچاتا ہے۔ یہاں تک کہ انتخاب در انتخاب سے دانہ ہوتا ہے لیکن اگر کیڑا بھی اس عقدہ میں لگ جائے اور وہ اپنے زہریلے سانس کی پھونک لگائے تو گرہ اور عقدہ سست ہو جائے گا۔ پھر نباتات بڑھ نہیں سکتیں اور خوشہ پیدا نہیں ہوتا۔

* آیت ۵ و من شر حاسد اذا حسد حاسد کو یہ تکلیف ہوتی ہے کہ فلاں آدمی کو یہ نعمت کیوں ملی۔ یہ چیز مجھے ملنی چاہیے تھی یعنی اس سے چھین کر اس (حاسد) کو ملنی چاہیے تھی۔ یہ ہے حاسد کی تعریف (اگر انسان کسی کے پاس کوئی اچھی چیز دیکھے اور ایسی چیز کی تمنا کرے تو یہ حسد نہیں ہے) غرض حاسد کو نظام قدرت پر اعتراض ہوتا ہے کہ اس شخص کو یہ چیز کیوں دی گئی، اس کے بجائے مجھے کیوں نہیں دی گئی۔ اس کی مثال یوں ہو سکتی ہے کہ کسی شخص کو کاشتکار سے دشمنی ہے اور فقط اس دشمنی کے باعث وہ نباتات کو کھیت سے اکھاڑ کر باہر پھینک دیتا ہے حالانکہ اسے نباتات سے کسی قسم کی دشمنی نہیں تھی۔ اسی طرح ایسی چیزیں جن کو نظام قدرت پر اعتراض ہے اور محض اسی لیے وہ ہماری دشمنی پر آمادہ ہوتی ہیں ہم ان کے ضرر سے اللہ تعالی کی پناہ میں آتے ہیں اس طریقہ سے ہم نے تمام مخلوقات پر ایک اجمالی نظر ڈالی ہے اور انہیں اپنے نفع کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر حصہ سے نفع حاصل کرنے کی اصل قوت ہم اللہ تعالی میں ثابت کرتے ہیں اور اسی کی پناہ میں آتے ہیں۔ اس طرح عام مخلوقات کو اللہ تعالی کی طرف ربط دینے کی قوت ہمارے اندر پیدا ہو جائے گی اور اس سورت میں یہی مقصد تھا کہ ایک ایسی مثال پیدا کر دی جائے کہ انسان تمام چیزوں کو اللہ تعالی کی طرف راجع کر سکے۔

سُورَةُ النَّاسِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ سِتُّ آيَاتٍ

سورۂ ناس مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿١﴾ مَلِكِ

تو کہہ میں پناہ میں آیا لوگوں کے رب کی لوگوں کے بادشاہ

النَّاسِ ﴿٢﴾ إِلٰهِ النَّاسِ ﴿٣﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ

کی لوگوں کے معبود کی بدی سے اس کی جو بہکاتا ہے

الْخَنَّاسِ ﴿٤﴾ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ

اور چھپ جاتا ہے وہ جو خیال ڈالتا ہے لوگوں کے دل

النَّاسِ ﴿٥﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿٦﴾

میں جنوں میں اور آدمیوں میں

سورۃ الناس مکیہ او مدنیہ

* سورت قل اعوذ برب الفلق میں تمام مخلوقات کو مرکز یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ربط دے دیا اور اب یہ مطلب ہے کہ تمام انسانیت کو اس مرکز یعنی اللہ تعالیٰ سے ربط دے دیا جائے۔ یہ ہے فلسفے کا مطلب کہ آخر میں انسانیت کو اس مرکز سے ربط دے دیا جائے تو فلسفہ مکمل ہو گیا یعنی ایک مرکز ثابت کر کے (قل ہو اللہ) پہلے بڑے نظام کو اس سے ربط دیا جائے اور آخر میں انسانیت کو بھی اس سے ربط دے دیا جائے۔

* آیت ۱ تا ۳ قل اعوذ برب الناس. ملک الناس. اله الناس اللہ تعالیٰ کے تین نام بتلائے گئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسانیت کا ربط واضح ہو جاتا ہے۔ (۱) قل اعوذ برب الناس لوگوں کے پالنے والے کی پناہ میں آتا ہوں۔ وہ انسانیت کا رب ہے اور انسانیت کے لیے جس قدر سامان پرورش چاہیے وہ سب کچھ دیتا ہے۔ اس کا نمونہ ماں باپ ہیں کہ انسان ماں باپ کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کی پرورش کرتے ہیں اس سے وہ ایک مفہوم لیتا ہے اور اس مفہوم اور معنے کو تربیت سمجھتا ہے۔ ماں باپ کی جتنی قوت ہے وہ بہت تھوڑی اور محدود ہے اور احاطہ بھی ان کا چھوٹا ہے۔ بچپن میں آدمی اسی تربیت کو اپنے خیال میں بہت کافی سمجھتا ہے۔ مگر جب انسان ذرا بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی اتنی ضرورتیں ہوتی ہیں کہ ماں باپ ان کو پورا نہیں کر سکتے۔ اور اگر پورا کریں تو بھی اس کی عقل اور دماغ اطمینان حاصل نہیں کرتا۔ اور نہ اس کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میرے ماں باپ محنت کر کے کچھ حاصل کرتے ہیں اور میری حالت یہ ہے کہ میں مفت خوروں کی مانند ان کے ساتھ لگا ہوا ہوں۔ اسے اپنے یہ حالت ناگوار گزرتی ہے تو وہ اپنی ذمہ داری پر کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اسے اپنے کام میں ایسی مشکلات درپیش آتی ہیں کہ ان کو اس کے ماں باپ حل نہیں کر سکتے۔ پھر وہ اپنی توجہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منعطف کرتا ہے اور اسی کو پکارتا ہے۔ اس وقت اس کی مشکل حل ہو جاتی ہے اور اس حالت میں وہ اپنے اللہ تعالیٰ کو اپنا

رب (پالنے والا) سمجھتا ہے اور مطمئن ہوجاتا ہے کہ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ جس انسان نے اپنی عقل اور تجربہ سے اللہ تعالی کو اپنا رب مان لیا اس کو ہم ابن اللہ کہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ سنی سنائی باتوں سے اللہ تعالی کو اپنا رب مانتا ہو بلکہ اپنی عقل اور تجربہ سے اپنا رب جانتا ہو۔ مثلاً اس شخص نے اپنے ماں باپ کو دیکھا کہ ان کے کام بھی اللہ تعالی کرتا ہے اور اس کی پرورش بھی وہی کرتا ہے تو اس فہم وفراست کے ساتھ جب وہ اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے تو یہ شخص ولی اللہ ہے۔ آیت ۲ **ملک الناس** اس کے بعد انسان کی دوسرے درجے کی ترقی ہے کہ وہ خاندان سے نکل کر سوسائٹی کا ممبر بن جاتا ہے اور سوسائٹی اپنا نظام قائم کرنے کے لیے اپنا ایک بادشاہ بنالیتی ہے۔ تو اس سے انسان ایک نیا مفہوم لیتا ہے کہ ایک ہے بادشاہ اور دوسری ہے رعیت تو یہ اپنے آپ کو اس سوسائٹی کے سربراہ کی رعیت مانتا ہے۔ ایک حد تک اس کی ضرورتیں اس نظام میں پوری ہوتی رہتی ہیں لیکن اس کا دل ودماغ اتنا قوی ہوجاتا ہے کہ وہ اس موجودہ سوسائٹی پر قانع نہیں رہ سکتا اور وہ اس سے اونچی سوسائٹی پیدا کرنے کی ہمت کرتا ہے اس لیے وہ تمام انسانیت کے بادشاہ یعنی اللہ تعالی سے رجوع ہوتا ہے کیونکہ اس کی طبیعت اسی بارگاہ میں مطمئن ہوسکتی ہے۔

* آیت ۳ **الہ الناس** انسان کی جو مجموعی خواہشیں ہیں ان کی ترقی سوسائٹی اور بادشاہ تک ختم ہوجاتی ہیں اس کے بعد انسان کی ذہنی ترقی باقی رہتی ہے اور وہ ہر اس چیز سے جس میں وہ دلکشی کا سامان پاتا ہے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ دنیا میں بہت سی چیزیں محبوب ہیں اور ان سے انسان ترقی کرتا ہے۔ گویا ایک محبوب کے بعد دوسرے محبوب سے محبت کی اور اسی طرح آگے بڑھتا چلا گیا۔ انسان کو آخر درجہ کی ایسی صورت میں میسر آسکتی ہے کہ ایک اس کا باپ ہے پھر بادشاہ ہے اور پھر جتنی چیزوں کو یہ شخص دوست رکھ سکتا ہے وہ موجود ہیں۔ یعنی اس کا محبوب دوست مل جاتا ہے تو اس پر انسانی طبیعت کافی حد تک اطمینان اور سکون میں رہتی ہے۔ مگر انسانی زندگی محدود ہے۔ اس کو ذہنی بے چینی ہوتی ہے اور تکلیف ہوتی ہے تو اب اگر اس کا اللہ تعالی سے ایسا تعارف ہوجائے جو تمام محبوبوں سے زیادہ محبوب ہے تو اس کی ترقی

اپنے کمال کو پہنچ سکتی ہے اور وہ بے انتہا ترقی کر سکتا ہے اور یہ محبت کا سلسلہ رک نہیں سکتا۔ یہی صفت ہے جسے اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ تمام انسانیت کا محبوب ہے۔ انسان کا ان تین صفتوں میں اللہ تعالی سے تعلق ہو تو اس کی عقل کو پوری غذا مل جائے گی۔ اس محبت کو عام فہم بنانے کے لیے ضرر سے بچنے کا سامان بنادیا گیا ہے کیونکہ انسانی طبیعت ابتدا میں نفع اور نقصان کے سوائے کسی اور چیز کو نہیں سمجھ سکتی۔

آیت ۴ **مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ. الایہ** پروپیگنڈے کی تشریح جس طرح پہلے کی جاچکی ہے (سورۃ الفلق میں) ایسی ہی تشریح یہاں بھی آتی ہے۔ محبت کی وجہ سے انسان کو ملامت کرنا سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ہے۔

ملامت شحنۂ بازار عشق ست

اب اگر انسان کو اس کے محبوب سے ہٹانے والی کوئی جماعت ہو جو چاہے کہ اس کی یہ محبت نہ رہے تو اس جماعت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس انسان پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور اسے اس کے محب سے ہٹانے میں ایک ضغطہ پیدا کرتی ہے۔ اس کو وسوسہ کہا جاتا ہے یعنی اس کے دل میں ایسے خطرات وقتاً فوقتاً پیدا کرتی ہے جس سے وہ محبت میں پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس واسطے ہم اس عقیدے سے ہٹانے والی جماعت کے شر سے اور اس تعلق کو کمزور کرنے والی جماعت کے شر سے (جو وسوسہ ڈال کر اور طبع میں جس وسوسہ سے خطرات پیدا ہوں ان کو قلب میں ڈال کر پھر الگ ہو جاتی ہے) اپنے رب بادشاہ اور محبوب کی پناہ میں آتے ہیں۔ چونکہ وہ وسوسہ نہایت ملامت دہ چیز ہے (تکلیف دہ) اس لیے وہ ہمیں ایک ایک نقطہ پر ایذا دے گا لیکن اگر ہم اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہوں گے تو ہمارا اپنے رب سے دائمی تعلق پیدا ہو جائے گا۔ پہلے بتلا دیا گیا ہے کہ جو شخص اپنی عقل اور تجربہ سے اپنے اللہ تعالی کو مانتا ہے اسے ہم اہل اللہ کہتے ہیں اسی طرح جو شخص اللہ تعالی سے دائمی محبت پیدا کر لے اسے ولی اللہ کہیں گے اور انسانیت کی یہ آخری ترقی ہے۔ انہی لوگوں میں سے جو اللہ تعالی کے دوست ہوتے ہیں فرشتے اور مقرب درگاہ الٰہی کے اور سب کچھ ہوتے ہیں۔ یعنی محدثین اور ملہمین اور انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین۔

* وسوسے سے بچنے پر ہم نے بات کو ختم کر دیا تھا اب اس کا ذکر آتا ہے۔ آیت ۴ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ وسوسہ ڈالنے والے شخص یا جماعت کا وسواس یعنی ہمیشہ وسوسہ ڈالنے والی جماعت اور اس کا کام بھی یہی ہے الخناس وہ ہے کہ جب اس پر حملہ کیا جائے تو وہ چھپ جائے یا چھپنے والی طاقت۔ وہ اس طرح پیش آتی ہے کہ انسان اس پر حملہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ بعض وقت اس کو اپنا دوست سمجھتا ہے کہ یہ مجھ کو خیر خواہانہ مشورہ دے رہا ہے۔ وہ کسی وقت ایسی بات بھی کہہ دیتا ہے کہ انسان کی ادھر توجہ نہیں ہوتی اور اس سے درحقیقت محبت الٰہی میں نقصان آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آیت ۵ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ وہ طاقت یا جماعت جو تمام انسانوں کے سینے میں وسوسہ ڈالتی ہے۔ وہ حد سے زیادہ وسوسہ ڈالتی ہے۔ ہمیشہ وہ یہی کام کرتی ہے۔ آیت ۶ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ وہ طاقت جنات اور آدمیوں میں سے ہے۔ جنات کے معنی چھپی ہوئی طاقت۔ چند آدمی جو ظاہری طور پر وسوسہ ڈال رہے ہیں وہ تو آدمیوں میں سے ہیں اور چند ایسی چھپی ہوئی طاقتیں اور جماعتیں ہیں جو خفیہ طور پر وسوسہ ڈالتی ہیں اور یہ دونوں بہت زور شور سے اپنے کام میں مصروف ہیں اور برسات کی طرح خطرات کی بارش کر رہے ہیں ان کے مقابلہ کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔ ہم ان کے وسوسے کے شر سے اللہ تعالیٰ جل شانہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جب ہم نے وسوسہ کی جڑ ہی کاٹ دی تو اس کا خیال بننا، پھر ارادہ بننا، پھر عملی صورت اختیار کرنا، ہم ان تمام درجوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اولاً انسان کے دل میں شبنم کی طرح خطرات آتے ہیں اور عقل اس کی طرف دیکھتی ہے۔ اگر اس کو وہ ناپسند ہوئے تو پھر ان کی طرف دوسری بار توجہ نہیں کرتا۔ اگر عقل کی نظر میں وہ خطرہ اچھا نظر آیا تو پھر اگر ایسا دوسرا خطرہ پیدا ہوگا تو وہ اس کو جگہ دے گا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ عقل کی اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ تو اب اس کو عقیدہ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر عقل نے چاہا کہ اس کو عملی صورت دی جائے تو یہ ارادہ ہوا۔ اس کے بعد جب وہ کام کیا تو اس کے بعد اس کام میں سرور حاصل ہوگا یا ندامت۔ یہ خطرات کا ایک دورہ ہے۔ اب اس نے وہی کام دوسری تیسری بار کیا تو اس کو ملکہ کہا جاتا ہے۔ اور جب اس نے ہمیشہ اس پر مداومت

کی تو اس کو اس کی طبع ثانی یا فطرت ثانی کہا جاتا ہے۔ یہ کمال ہے اسی طرح انسانیت میں ایک طرف تو بصیرت بیدار رہے گی اور اسے علم رہے گا کہ کون سی چیز ضرر دے رہی ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ جل شانہ سے محبت تازہ بہ تازہ بڑھتی جائے گی۔ انسانیت کا اللہ تعالیٰ سے ربط آخری شکل میں بھی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

سورۃ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی، اس کی سات آیتیں اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے ف

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ

سب تعریفیں اللہ ہی کو ہیں ف جو پالنے والا سارے جہان کا ف بےحد مہربان

الرَّحِيْمِ ۝۲ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳ اِيَّاكَ نَعْبُدُ

نہایت رحم والا مالک روز جزا کا ف تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں ف بتلا ہم کو راہ

الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

سیدھی راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا ف

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے ف

سورۃ الفاتحہ مکیہ

* آیت ۱ الحمد للہ رب العالمین تمام جہانوں کا رب اللہ تعالی ہے اور وہی ستائش کے قابل ہے۔ کائنات عالم کو پیدا کرنے والی ایک ایسی ہستی ہے جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ڈور ہے۔ ریت کے ذرات سے لے کر انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے تمام اسی کے تابع ہیں(۱) اس کی صفتیں یہ ہیں۔ آیت ۲ الرحمن الرحیم باپ اپنی اولاد کو کس شفقت اور پیار کی نگاہوں سے دیکھتا ہے تمام عالم میں سب سے زیادہ عزیز اسے اپنی اولاد ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنی اولاد کو بعض اوقات کسی بات پر سرزنش کرتا ہے۔ اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس کی اولاد کی اصلاح ہوجائے۔ اسی طرح اللہ تعالی کی ذات رحمن ہے وہ اپنے بندوں پر شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جب کبھی ان سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو جس طرح باپ یا استاد سرزنش کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالی کی طرف سے کوئی مصیبت آتی ہے۔ اس میں بھی یہی راز مضمر ہے کہ میرے بندے اپنی غلطی کی اصلاح کریں۔ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر عیسائی لوگ خدا کی ذات کو باپ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ماں اپنی اولاد کو جس شفقت کی نگاہ سے دیکھتی ہے وہ وصف رحیم ہے اگر کسی قصور پر استاد سزا بھی دے تو ماں کی مامتا اس سزا کو برداشت نہیں کرسکتی اور جھٹ شکایت کے لیے تیار ہوجاتی ہے۔ اسی جذبے کے تحت ہندو لوگ ماں کو ماتا دیوی کہتے ہیں۔ غرض ان دونوں جذبات کو مدنظر رکھ کر اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالی کی ذات ماں باپ سے بڑھ کر اپنی مخلوقات کو عزیز رکھتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ایک دفعہ ایک غزوہ میں کوئی عورت گرفتار ہوکر آئی۔ اس کا بچہ گم ہوگیا تھا۔ محبت کا یہ جوش تھا کہ کوئی بچہ مل جاتا تو اسے سینے سے لگا لیتی اور اس کو دودھ پلاتی۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو حاضرین سے فرمایا کہ "کیا یہ ہوسکتا ہے کہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے" لوگوں نے عرض کیا ہرگز نہیں۔

---

(۱) اس کی مثال عدالت عالیہ ہے کہ ہر اپیل کا فیصلہ وہاں سے ہوتا ہے۔

فرمایا "تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت ہے جتنی اس کو اپنے بچے سے ہے" ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت ﷺ کے حضور میں ایک پرندہ کو چادر میں مع اس کے بچوں کے لپیٹے ہوئے لائے اور عرض کیا "یارسول اللہ میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا۔ ان کی ماں نے جب یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی۔ میں نے ذرا سا کپڑا کھول دیا تو وہ فوراً اپنے بچوں پر گر پڑی" ارشاد ہوا "کیا اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے" اللہ تعالی اس سے بدرجہا زیادہ رحمت کی نظر سے اپنے بندوں کو دیکھتا ہے۔ اللہ تعالی نے رحمت کے ایک سو حصوں میں سے ایک حصہ دنیا پر نازل کیا ہے۔ جس کا نتیجہ ہے ماں باپ کی اپنی اولاد سے محبت، انسان کی انسان سے محبت، حیوان کی حیوان سے محبت وغیرہ۔ اب اگر کوئی شخص تمام کائنات کی محبت کو ازل سے لے کر ابد تک جمع کرے اور پھر اس مجموعے کو ایک سو سے ضرب دے تو اللہ تعالی کی محبت کا کچھ اندازہ لگا سکتا ہے۔

* آمدم بر سر مطلب۔ جب انسانی سوسائٹی بن چکی تو ضرور ہے کہ اس میں باہمی تعلقات قائم ہوں۔ اس لیے حکم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالی کی ذات رحیم ہے اسی طرح اس کے بندوں کو ایک دوسرے پر رحم کرنا چاہیے۔ ایک کا حق دوسرا غصب نہ کرے۔ اتفاق اور یک جہتی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔ اگر کوئی شخص کسی دوسری پر زیادتی کرے گا تو حکم ہوتا ہے کہ:

* آیت ۳ **مالک یوم الدین** یعنی بندوں کو اس نے پیدا کیا ہے تو ان کا وہ حساب بھی ایک دن لے گا۔ حساب لینے سے یہ مدعا نہیں کہ انسان کو سزا دی جائے بلکہ وہ ذات تو غفور رحیم ہے۔ مدعا یہ ہے کہ انسان کی آلودگی کو دور کرکے اسے دوسری زندگی یعنی جنت میں از سر نو زندگی بخشی جائے۔ آیت ۴ **ایاک نعبد و ایاک نستعین** ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ انسان نے تمام کائنات کو دیکھا اور اس سے اندازہ لگایا کہ اس تمام عالم کے اوپر ایک ذات ہے ہم

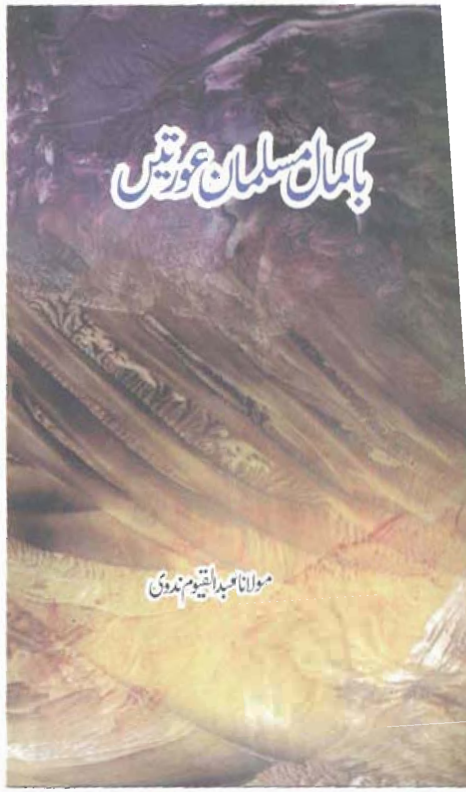
اپنا سر نیاز اسی کے آگے خم کرتے ہیں کیونکہ وہی ہمارا مالک اور کارساز ہے اور اسی سے ہم مدد مانگتے ہیں۔ بڑے بڑے تونددالے جس قدر دنیا میں ہیں انہوں نے انسان پر ظلم و ستم کر کے انسانی حقوق غصب کر لیے اور انسانوں سے اپنی بندگی کرانے لگے۔ اے اللہ! ہم ان سے بیزار ہیں اور اب تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ آیت۵ **اھدنا الصراط المستقیم** اے اللہ! جب تو نے ہمیں بصارت عطا کی تو ہمیں سیدھے راستہ پر چلنے کی ہمت اور توفیق دے۔ آیت۶ **صراط الذین انعمت علیھم** سیدھا راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے نعمتیں نازل کیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں جن پر نعمتیں نازل ہوئیں ان کے چار مراتب ہیں۔ نبی، صدیق، شہداء اور صالحین (سورہ النساء آیت۶۹) مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار ایک ایسی سوسائٹی عطا کر جس کے اراکین ان چاروں مراتب والے ہوں۔

* غرض کہ مراد ہے ان لوگوں کا راستہ جنہوں نے قرآن مجید یعنی فطرت الٰہی کے قانون کی پابندی کی اور پھر دنیا میں کامیاب زندگی بسر کی۔ آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدینؓ جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے فتنے سے پہلے گزر چکے ہیں وہ ہمارے لیے نمونہ ہیں۔ ان کے بعد جو کوئی ان کے نمونہ پر عمل کرے۔ وہ انعمت کا مصداق ہے۔ اس واسطے کہا گیا کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تو نے اپنا انعام نازل کیا ہے۔ آیت۷ **غیر المغضوب علیھم و لاالضالین** نہ ان لوگوں کا جن پر تو نے غضب نازل کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جن پر غضب الٰہی نازل ہوا وہ یہود ہیں۔ اور بھٹکے ہوؤں سے مراد عیسائی ہیں۔ یہود پر غضب اس لیے نازل ہوا کہ انہوں نے توراۃ کی آیات مسخ کر ڈالیں اور ان کے معانی اور مطالب اپنے مطلب پر ڈھال لیے۔ بعینہ اہل اسلام کے چند علماء بھی اسی طرح کر رہے ہیں اور قرآن مجید کے معانی کو اپنے سانچے میں ڈھال رہے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ موجودہ زمانے میں بھٹکے ہوؤں سے مراد آج کل کا نوجوان طبقہ ہے جو گویا سیدھے راستے سے بھٹک گیا ہے۔ مگر سیدھا راستہ پانے کی جستجو کر رہا ہے۔ اس لیے امید ہے کہ وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اور ان لوگوں کا راستہ نہ دکھلائیو جن پر تیرا غضب

نازل ہوا۔ مراد ہے ان لوگوں کا راستہ جنہوں نے قرآن حکیم یعنی فطرت الٰہی کے قانون کی نافرمانی کی۔ اس لیے وہ دنیا میں ناکام رہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے غضب کی نشانی ہے۔ جو لوگ اس نمونے کو سمجھتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (یعنی آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا نمونہ فتنہ تک) مگر اس پر عمل کرنے کی ہمت نہیں رکھتے یا اللہ! ہمیں ان لوگوں کا طریقہ نہیں چاہیے وہ الضالین ہیں۔ اسی طرح جو لوگ اس نمونہ (رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین) کو نہیں سمجھتے ہمیں ان کا بھی طریقہ نہیں چاہیے خواہ وہ کس قدر ہی سمجھدار کیوں نہ ہوں۔

* اس سورۃ کا نام فاتحہ ہے۔ اور ایک حدیث میں اس کا نام صلوۃ بھی آیا ہے۔ اسی حدیث میں ہے کہ جب انسان کہتا ہے کہ الحمد للہ رب العالمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حمدنی عبدی اور بھی اس سورۃ کے بہت نام ہیں۔ مگر اس کی تاریخ نزول یقینی نہیں کہی جاسکتی۔ یہ ایک عقلی بات ہے کہ پہلے سورہ العلق نازل ہوئی اس میں ہے ارئیت الذی ینھی عبدا اذا صلی گویا نماز ابتدائے نبوت سے آنحضرت ﷺ اور ان کے صحابہ پڑھتے تھے۔ تو یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ نماز میں سورۃ الفاتحہ نہ پڑھی جاتی ہو۔ اسی لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ سورۃ الفاتحہ ابتدائے سال نبوت میں نازل ہوئی ہو۔ واللہ اعلم۔ مگر کوئی روایت نہیں ملتی۔ اور حدیث میں آتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے مثل نہ توراۃ میں ہے اور نہ انجیل میں ہے۔ وغیر ذلک تو یقینا سمجھا جاسکتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ بعد اقرء کے نازل ہوئی۔ ابن مسعودؓ نے اپنے قرآن میں سورۃ الفاتحہ اس لیے نہیں لکھی تھی کہ وہ تو نماز کے لیے سکھلائی گئی ہے۔ پس ان تمام باتوں سے یقین ہوتا ہے کہ جب سے نماز فرض ہوئی اسی وقت یہ سورۃ الفاتحہ نازل ہوئی ہے۔





مکی دارالکتب

32- میکلیگن روڈ، چوک اے جی آفس لاہور
Ph: 042-7239138